لکھنؤ

سلام

ہر چند اہل جور نے چاہا یہ بارہا

ہو جائے محو، یادِ شہیدانِ کربلا

باقی رہے نہ نام زمیں پر حسینؑ کا

لیکن کسی کا زور عزیزو نہ چل سکا

عباسؑ نام ورکے لہو سے دُھلا ہوا

اب بھی حسینیت کا علم ہے کھلا ہوا

(جوشؔ ملیح آبادی)

ایڈیٹر: مصطفےٰ احسن رضوی

www.taemeernews.com

آل انڈیا شیعہ کانفرنس کا آرگن

سرفراز لکھنؤ

ہفتہ وار

دبیر نمبر

جلد	لکھنؤ ۱۷ر دسمبر ۱۹۷۶ء مطابق ۲۵ر ذی الحجہ ۱۳۹۶ھ	نمبر ۱

ایڈیٹر
مصطفےٰ حسن رضوی

(دبیر نمبر کے مرتب)
کاظم علی خاں

قیمت محرم نمبر:- پانچ روپیہ | چندہ سالانہ: ۱۶ روپیہ

سید انصار حسین پرنٹر و پبلشر
نے بروئے آل انڈیا شیعہ کانفرنس
سرفراز قومی پریس میں چھپوا کر
دفتر سرفراز ۱۰۱ ان محل روڈ
لکھنؤ سے شائع کیا

www.taemeernews.com

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	مرزا دبیر کا ایک مرثیہ	جناب جعفر علی خاں صاحب اثر مرحوم	۱ تا ۱۷
۲	مرگ دبیر	جناب قاضی عبدالودود صاحب	۱۸ تا ۲۶
۳	ابواب المصائب	جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب فاروقی مرحوم	۲۷ تا ۳۲
۴	خاندانی شاعری اور دبیر و انیس	جناب سبط محمد صاحب نقوی	۳۳ تا ۴۱
۵	دبیریت کیا ہے	جناب ڈاکٹر فضل امام صاحب	۴۲ تا ۵۰
۶	دبیر کی مرثیہ نگاری محرکات و موثرات	جناب کاظم علی خاں صاحب	۵۱ تا ۶۳
۷	مرزا دبیر کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ	جناب ڈاکٹر اکبر حیدری صاحب	۶۴ تا ۷۰
۸	مقیاس الاشعار از مرزا اوج لکھنوی ایک تعارف	جناب سکندر آغا صاحب	۷۱ تا ۷۵
۹	مرزا دبیر کے بعض نادر قلمی آثار	جناب کاظم علی خاں صاحب	۷۶ تا ۸۲
۱۰	مرزا دبیر کے مرثیے پر میر ضمیر کی اصلاحیں	جناب ڈاکٹر سید نیر مسعود	۸۳ تا ۸۷
۱۱	کچھ دبیر کے تعلق سے	جناب کمال احمد صدیقی	۸۸ تا ۹۰
۱۲	ادارۂ یادگار دبیر	جناب مرزا رضا حسین صاحب	۹۱ تا ۹۳
۱۳	الوداع	جناب ڈاکٹر کمال الدین حسین ہمدانی	۹۴ تا ۹۵
۱۴	مرزا سلامت علی دبیر ایک تحقیقی اضافہ	جناب ڈاکٹر حیدری صاحب	۹۶ تا ۱۱۴
۱۵	دبیر کا شاعرانہ منصب	جناب پروفیسر ظاہر حسین صاحب	۱۱۵ تا ۱۱۸
۱۶	مرزا دبیر	جناب میر احمد علی صاحب ادیب	۱۱۹ تا ۱۲۰
۱۷	مرزا دبیر مرحوم کا ایک نایاب مرثیہ	جناب سید حسن صاحب زیدی	۱۲۱ تا ۱۲۷
۱۸	مرزا دبیر کمالات فن کے آئینے میں	جناب مولانا سید محمد جابر باقری صاحب	۱۲۸ تا ۱۳۲
۱۹	مرزا دبیر مغفور کے مطبوعہ سلام	جناب دلشاد حسین صاحب	۱۳۳ تا ۱۴۰
۲۰	مرزا دبیر کا منفرد ادراک	جناب ڈاکٹر محمد احسن فاروقی	۱۴۱ تا ۱۴۵
۲۱	نوادر مرزا دبیر	جناب مرتضیٰ حسین صاحب فاضل لکھنوی	۱۴۶ تا ۱۵۶

www.taemeernews.com

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۲۲	دبیر اور شبلی	جناب ڈاکٹر گیان چند جین	۱۵۷ تا ۱۵۸
۲۳	خصوصیات و ادلیات مرزا دبیر	جناب ضیاء الحسن صاحب موسوی	۱۵۹ تا ۱۷۲
۲۴	مرزا دبیر اور ان کے استاد میر ضمیر سے ملاقاتیں	جناب نجات حسین صاحب	۱۷۳ و ۱۷۴
۲۵	مرثیہ	جناب مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہ عطا کردہ دلشاد صاحب	۱۷۵ تا ۱۸۵
۲۶	سلام	جناب مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہ	۱۸۶
۲۷	نوحہ جات	" " "	۱۸۷ تا ۱۸۹
۲۸	سلام	جناب اوج اعلی اللہ مقامہ	۱۹۰
۲۹	سلام	جناب رفیع اعلی اللہ مقامہ	۱۹۱
۳۰	جناب دبیر اعلی اللہ مقامہ	جناب ڈاکٹر رفیق حسین صاحب رفیق	۱۹۲ تا ۱۹۳
۳۱	شہنشاہ اقلیم بلاغت مرزا دبیر مرحوم	جناب باقر رضوی صاحب امانت خانی	۱۹۴
۳۲	موازنہ انیس و مرزا دبیر	جناب عمر انصاری	۱۹۵ و ۱۹۶
۳۳	تاجدار سخن جناب دبیر مرحوم	جناب ضیاء رضوی	۱۹۷
۳۴	پیغام	جناب ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی	۱۹۸
۳۵	ایڈیٹوریل	ادارہ	۱۹۹ تا ۲۰۳
۳۶	اشتہارات	مختلف	۲۰۴ تا ۲۰۸

www.taemeernews.com

جعفر علی خاں اثر لکھنوی مرحوم

مرزا دبیر کا ایک مرثیہ

زیرِ نظر مرثیہ میں کل اٹھاون بند ہیں۔ کربلا کے مسافروں کا لٹا ہوا قافلہ شہادتِ امام حسینؑ کے بعد فوجِ یزید کی نگرانی میں اسیر و پابجولاں شام کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ راہ میں قلعۂ شیریں پڑتا ہے۔ فوج کی آمد آمد کی خبر پھیلتی ہے اسی کے ساتھ فرزندِ رسولؐ کا نام بھی آتا ہے۔ شیریں کو یقین ہوتا ہے کہ میرے آقا حسبِ وعدہ مجھے سرفراز کرنے اور مہمانی کا شرف بخشنے تشریف لاتے ہیں۔

(۱)

جب حرم قلعۂ شیریں کے برابر آئے
غل ہوا کعبے سے مولیٰ مع لشکر آئے
کہا شیریں نے کہ ارمانِ دلی بر آئے
میرے مولا مرے سلطاں مرے سرور آئے
شانِ حق، نورِ خدا، قدرتِ باری دیکھو
جاؤ لوگو مرے آقا کی سواری دیکھو

چوتھے مصرع میں ایک ہی مفہوم کے الفاظ کی تکرار نے شیریں کے شوق و انبساط کی تصویر کھینچ دی۔ ہر لفظ سے ادب اور ادب کے ساتھ محبت ٹپکتی ہے۔ سیرت کی عالی ظرفی کا تقاضا ہے کہ اور لوگ بھی اس خوشی میں شریک ہوں اور شرف و سعادت حاصل کریں۔ بیت تیسرا بھی خیالِ نظم ہے آخری مصرع کا طرز ایسا ہے کہ گویا امام کی سواری شیریں کی آنکھوں کے سامنے ہے اور کمال تزک و احتشام و وقار سے اُن کے گھر کی طرف آ رہی ہے۔ آرٹ کے لحاظ سے یہ اسلوب نہایت ضروری تھا کیونکہ بعد کی مایوسی کے اثرات کو اس نے دس گنا شدت کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔

(۲)

جن سے روشن ہے مدینہ وہ قمر آتے ہیں
جن کا معدن ہے نجف میں وہ گہر آتے ہیں
جن کا گھر عرش پہ ہے وہ مرے گھر آتے ہیں
(یہ خبر اُس کو نہ تھی نیزوں پہ سر آتے ہیں)
کہہ رہی تھی کہ چراغِ حرمیں آتا ہے
اے مسافو مبارک ہو حسینؑ آتا ہے

پہلے تین مصرعوں میں انتہائے حیرت و شادمانی کا اظہار ہوتا ہے۔ شیریں اپنی قسمت پر غبطہ کر رہی ہے۔ سامعین کا ذہن چوتھے مصرع میں کسی قسم کے جذبہ کا متوقع ہوتا ہے مگر شاعر ایسی بات کہہ دیتا ہے جس کا گمان نہ تھا۔ تیزی اور متضاد جذبات کے ناگہانی تصادم سے خوشی سے دھڑکتے ہوئے دل کو ایسا دھچکا لگتا ہے کہ خیال کی رَو بدل جاتی ہے نشاط کے بدلے شدید جذبۂ حزن و یاس طاری ہوتا ہے کلیجہ منہ کو آنا چاہتا ہے۔ آنسو آنکھوں کا راستہ ڈھونڈتے ہیں مگر دونوں گھٹ گھٹ کے رہ جاتے ہیں۔ اُبھرنے

www.taemeernews.com

کی ایک آخری سعی کر کے دل ڈوبنے لگتا ہے اور اشک مچل مچل کے سسکیاں بھر بھر کے سو جاتے ہیں۔ ارمان ایڑیاں رگڑ رگڑ کے مر جاتے ہیں کیونکہ غم کی ٹھٹھر سے دل برف کا ٹکڑا بن گیا اور اشکوں سے روانی کی طاقت سلب ہو گئی۔

ڈرامیٹک آرٹ (فنِ تمثیل نگاری) کے نقطۂ نظر سے دیکھئے تو پُرکار شاعر سامعین کے ذہن کو آمادہ اور جذبۂ ہمدردی کو انگیختہ کرنے کی غرض سے ابتدا ہی میں اس دردناک حالت کا دھندلا سا خاکہ کھینچ دیتا ہے جو حقیقت سے مطلع ہونے پر شیریں کے دل کو ہوئی ہوگی تاکہ اختتام تک پہنچتے پہنچتے جذبات کا سیلاب اپنے ساتھ بہالے جائے اور ایسا معلوم ہو کہ واقعہ الفاظ میں بیان نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ پیش نظر ہے۔ کانوں سے سُن نہیں رہے ہیں بلکہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اسٹیج کی مدد سے بھی ایسی کیفیات طاری کر دینا کمالِ فن سمجھا جاتا ہے محض الفاظ سے تکمیل تو سحر بلکہ اعجاز ہے۔

(۳)

حیدری صف میں حسینی علم آتے ہوں گے
ہاشمی دبدبہ ہاشم کا دکھاتے ہوں گے
زینبی داغ کا طبل بجاتے ہوں گے
خضر اس قافلہ کو پانی پلاتے ہوں گے
دل کو نورِ رخِ موسےٰ سے تسلی ہوگی
کوہ پر طور کی مانند تجلی ہوگی

(۴)

میری بی بی کی امیرانہ سواری ہوگی
ناقۂ پر عرش کی مانند عماری ہوگی
مسندِ نور پہ کسریٰ کی وہ پیاری ہوگی
گہنا سب تحفہ تو پوشاک بھی بھاری ہوگی
[illegible]
[illegible]

(۵)

بی بی گودی میں سکینہؑ کو بٹھائے ہوں گی
کاندھے سے اصغرِ ناداں کو لگائے ہوں گی
چادر سے ٹکڑوں کو دامن میں چھپائے ہوں گی
دونوں پر گوشۂ دامن کو اڑھائے ہوں گی
یہ نہ معلوم تھا اصغرؑ نہیں اکبرؑ بھی نہیں
تاجِ دمسنؑ تو کہاں مقنعِ دیبا بھی نہیں

میرا ذوقِ جہاں مجروح ہوگا ضرور اعلان کروں گا۔ میرا ایمان ہوں کہ مرزا دبیر ہوں۔ تیسرے اور چوتھے مصرعوں میں نہ صرف لفظ دامن کی تکرار ناگوار ہے بلکہ دونوں میں ایک ہی مضمون کی تکرار بھی ہے۔ علاوہ بریں چوتھے مصرعے میں لفظ پر کے ساتھ اڑھانا خلافِ زبان و روزمرہ ہے۔ دونوں کو گوشۂ دامن اڑھائے ہوں گی یا دونوں پر گوشۂ دامن ڈالے ہوں گی۔ کہنا چاہیے تھا یہ بھی ممکن ہے کہ چوتھے مصرعہ میں دامن کی جگہ چادر کہا ہو۔ کاتب نے کچھ کا کچھ لکھ دیا ہمیں دبیر کی منقصت منظور نہیں اور ایسی چھوٹی چھوٹی فروگزاشتوں سے اُن کے کمال پر حرف نہیں آتا۔ تاہم ناقد کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ خوبیوں کے ساتھ خامیاں بھی جن کی تعداد قلیل ہے دکھاتے جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہمیں سے لغزش ہو جائے۔ متنبہ ہونے پر انشاء اللہ بطیبِ خاطر اعتراف کر لیں گے۔

(۶)

تھا خیال اُس کو کہ چوگرد فریادرس ہوں گے
بیچ میں لشکرِ اسلام کے سردر ہوں گے
گھوڑے پر ناقۂ زینبؑ کے برابر ہوں گے
بندۂ محمل کا اُٹھائے علی اکبرؑ ہوں گے
واں نہ محمل تھا نہ حشمت تھی نہ زیبائی تھی
سر شبیرؑ کے ہمراہ بہن آئی تھی

چوتھے مصرع سے حضرت زینبؑ کے احترام کے علاوہ

www.taemeernews.com

یہ پہلا بند نکلتا ہے کہ حضرت علی اکبرؑ محمل کا پردہ اٹھائے ہوئے ہیں کہ ہوا آتی رہے اور محمل میں پھوپھی کا دم نہ گھٹے۔

(۷)

کہتی تھی قاسم دلگیر کی ہوئی ہے شادی
دولہا آقا کا بھتیجا، دلہن آقازادی
دوں گی اس بیاہ کی میں نذر مسار کبادی
یہ نہ تھا علم کہ شادی میں ہوئی بربادی
گھونگھٹ اُلٹا جو دلھن نے یہ تماشا دیکھا
بیاہ کے تخت پہ نوشاہ کا لاشا دیکھا

بیت میں غضب کی مرثیت ہے لیکن ہم پھر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ لفظ "تماشا" کھٹکتا ہے۔ ایسے قیامت کے منظر کو تماشا کہنا بے محل اور خلاف ادب ہے۔ "نقشا" کہیں بہتر تھا۔

گھونگھٹ اُلٹا جو دلھن نے تو یہ نقشا دیکھا

(۸)

شرکت آبدسادات کا سن سن کے بیاں
مرد و عورت ہوئے قریہ سے زیارت کو رواں
اور مہارات کا شیریں نے کیا یاں سامان
فرش آنکھوں کا کیا جھاڑ کے پلکوں سے مکان
ظرف دھو دھو کے رکھے آب و غذا کی خاطر
کھانے طیار کئے آل عبا کی خاطر

(۹)

مسند آراستہ کی سبط پیمبر کے لئے
کشتیاں رکھے رکھیں عترت حیدر کے لئے
جھولا دالان میں ڈالا علی اصغرؑ کے لئے
رکھے گلدستے برابر رکھے اکبرؑ کے لئے
جام شربت کے بھرے ابن حسنؑ کی خاطر
گہنا پھولوں کا منگا رکھا دلھن کی خاطر

آٹھویں بند کے آخری تین مصرعوں اور پورے نویں بند میں بظاہر صرف مہمانداری کے ساز و سامان کی تفصیل ہے مگر اس کی تہہ میں جذبات کی ایک دنیا ہے۔ آنکھیں بچھانا محاورہ ہے یعنی انتہائے خلوص و تواضع سے پیش آنا۔ مکان کو پلکوں سے جھاڑنا کے مکرر نے مبالغہ میں اور اضافہ کر دیا اور اسی کے بقدر اظہار خلوص میں ترقی ہوئی۔ جاروب سے پلکوں کی مشابہت ظاہر ہے۔ نیز یہ خوبی پیدا ہوئی کہ مکان پہلے جھاڑا جاتا ہے پھر فرش بچھایا جاتا ہے۔ آنکھوں کے فرش کے لئے مژگاں کی ہی جاروب موزوں ہے۔ ظرف دھو دھو کے رکھنے سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ صاف ستھرے نہ تھے بلکہ یہ بھی مہمانداری کی چونچلے جو گھر کے کونے کونے کا جائزہ لیتی اور محو ہوم کرتی ہے کہ جاروب مژگاں سے جھاڑ کر آنکھیں بچھاتی ہے۔ ظرف دھونا بھی خیالی گرد سے پاک کرنا ہے۔ کھانا صیغہ جمع میں ہے۔ یعنی انواع و اقسام کے کھانے طیار کئے۔ نویں بند میں یہ دکھایا ہے کہ شیریں اپنے معزز مہمانوں کی کیسی مزاج داں اور مرتبہ شناس تھی۔ سب سے زیادہ احترام امام حسینؑ کا ہے اُن کے واسطے مسند بچھائی۔ عترت رسول کے لئے کشتیاں سجیں۔ شیر خوار علی اصغرؑ کے لئے جھولا ڈالا۔ علی اکبرؑ نوجوان ہیں۔ اُن کے لئے پھولوں کے گلدستے چنے۔ جوانی اور پھولوں دونوں کی دنیا دنیائے رنگ و بو ہے۔ دونوں میں ربط ہے۔ دبیر کی لطافت احساس اور حریف انتخاب تعریف سے مستغنی ہے۔ ذوق کو رہبر بنائیے اور مزے لیجئے۔ اسی طرح قاسمؑ کے لئے شربت کے جام اور ان کی دلہن کے لئے پھولوں کے زیور کی تخصیص میں نفسیات کے عجیب عجیب نازک اور پراسرار مسائل کی طرف اشارہ ہے۔ تفصیل میں دبیر کے تیار کردہ آبگینوں کو ٹھیس لگنے کا ڈر ہے۔

اب کیا اہتمام رہ گیا!

(۱۰)

رونک دی سامنے دروازے کے پردے کی قنات
اور چلائی ہمسایوں کو وہ خوش اوقات

www.taemeernews.com

صاحبو جوڑ کے ہاتھوں کو میں کہتی ہوں یہ بات
جب اُترنے لگیں سادات رفیع الدرجات

باندھنا مردوں کا تو زردانے سے بڑھ دینا
اپنے لڑکوں کو بھی کوٹھوں پہ نہ چڑھنے دینا

"رفیع الدرجات" شبیر کی زبان سے اچھا معلوم نہیں ہوتا خصوصاً تیسرے مصرعے کے بعد میں جس میں بے حد نرمی اور نرمی ہے۔

(۱۱)

دفن زہرا کی تو تم نے بھی سنی ہوگی خبر
لڑکیاں رات کو نکلی تھیں جنازہ لے کر
رن کو آبادت کے مردوں میں فقط تھے حیدرؑ
یا حسینؑ اور حسنؑ پیٹتے تھے سینہ و سر
رو رہی صبح کو پیادہ جو سر زینبؑ سے
شمس طالع نہ ہوا اوپر نے یہ حکم رب سے

اس اہتمام کے بعد جو بے حد انتظار و اشتیاق کا ترجمان ہے یہ خبر سن کر شبیر کے دل پر کیا گزری ہوگی؟

(۱۲)

ناگہاں راہ میں برپا ہوا شور و فغاں
سن کے گھبرا گئی ہر اول شق ہو تا قدم
دیکھنے کو جو گئے تھے حشم شاہ امم
نہ تو زن نہ مرد پھرے خاک اڑاتے باہم
سخت بے چین ہوئی طالب آرام حسینؑ
دل پہ انگشت شہادت سے لکھا نام حسینؑ

دوسرے مصرعے کی محاورات قابل دید ہے۔ بیت میں ایک خاص رسم کو موقع کے لحاظ سے بڑا فنی تصرف کر دیا کہ جان اللہ خطرہ زہرا کے وقت دل پر انگشت شہادت سے نام علیؑ لکھتے ہیں۔ گھوڑے کی سواری کو "جنازہ مردان" کہتے ہیں۔ گھوڑے پر سوار ہونے سے پہلے اس کی گردن پر انگلی سے یا علیؑ لکھتے ہیں (یا لکھتے تھے)

خواب پریشاں سے حفاظت کے لئے سوتے وقت سینہ پر یا علیؑ لکھتے ہیں۔ یہ سب لکھنا انگشت شہادت کی جنبش سے ہوتا ہے۔ شبیر انگشت سے "یا حسینؑ" لکھ کر اپنے خوف زدہ دل کو تسکین دیتی ہے۔ دبیر کی یہ نزاکت تخیل یہ تصرف داد سے بے نیاز ہے۔

(۱۳)

بولی شوہر سے خبر لا کہ یہ غل ہے کیسا
کس پہ آفت پڑی گھر کس کا لٹا کون مرا
رونے والوں کو مری سمت سے جا کر سمجھا
بدشگونی نہ کرو آتا ہے ابن زہراؑ
یہ محل شکر کا ہے وقت مناجات کا ہے
داخلہ آج بر آرندۂ حاجات کا ہے

ساتھ ہی یہ خیال ہوتا ہے کہ جن پر وقت پڑا ہے میری بدشگونی ماننے سے رونا پیٹنا کیوں بند کرنے لگے لہٰذا شوہر سے کہتی ہے کہ ان کو یقین دلاؤ۔

(۱۴)

عقدے کھل جائیں گے جب ہونٹ ہلا دیں گے حسینؑ
گر کسی پیارے سے بچھڑے ہوں ملا دیں گے حسینؑ
مر گیا ہوگا جو کوئی تو جلا دیں گے حسینؑ
جام صحت کا مریضوں کو پلا دیں گے حسینؑ
ایک شبیر کو اللہ نے کیا کیا بخشا
رخ یوسفؑ، کف موسیٰؑ، دم عیسیٰؑ بخشا

چھٹے مصرعے سے فارسی کا یہ مطلع بے اختیار یاد آجاتا ہے ؎

حسن یوسفؑ، دم عیسیٰؑ، ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

حسن یوسفؑ کے بدلے رخ یوسفؑ، ید بیضا کی جگہ کف موسیٰؑ کہنے سے مصرع الگ نہیں ہو جاتا ایسے موقع پر انھیں الفاظ کو دہرا دینا تصرف کرنے سے بہتر ہے تاکہ

www.taemeernews.com

[illegible] صرف اتنا کہہ کر آگے بڑھیں کہ ترجمہ ہے۔

(۱۵)

ایک عورت نے یہ باہر سے پکارا ناگاہ
ارے شیریں ترے ارمان لٹے خاک میں آہ
گھر کا گھر ہو گیا خاتون قیامت کا تباہ
وارثِ آلِ عبا مر گیا انا للہ
ہم زیارت کو گئے تھے سو یہ محشر دیکھا
لٹے تری حضرت زینبؑ کو کھلے سر دیکھا

"لٹے" کا حرف خاص ہے اور اس دو حرفی لفظ میں وسیع معنی پنہاں ہیں گویا وہ عورت شیریں سے کہتی ہے کہ تم نے تو کہا تھا کہ مولیٰ کی سواری بڑی شان و شوکت سے آ رہی ہے اور وہاں صورت حال اور ہی کچھ ہے۔ اس لفظ سے شیریں کے قول کی تردید کے ساتھ حیرت اور بیزاری کا بھی اظہار ہے۔ جس سے تردید کا پہلو نرم ہو گیا اور ہمدردی شامل ہو گئی۔

"ایک عورت نے یہ باہر سے پکارا ناگاہ"

کوتاہ نظر اعتراض کر دیں گے کہ جب آواز دینے والا نامحرم مرد نہ تھا بلکہ عورت تھی تو باہر سے پکارنا کیا معنی؟ لیکن اس طرح نہ صرف واقعہ کی اہمیت بلکہ ذرا مشکل اثر کم ہو جاتا۔ عورت اس قدر بے تاب اور گھبرائی ہوئی تھی کہ دروازے کے باہر ہی چلانے لگی اور شیریں یہ خبر بد سن کے ایسی بدحواس ہوئی کہ دیوانہ وار گھر سے نکل پڑی۔

(۱۶)

بے تحاشا وہ یہ کہتی ہوئی دوڑی باہر
خاک منھ میں ترے کس منھ سے یہ دیتی ہے خبر
کون زینبؑ جسے دیکھ آئی ہے تو ننگے سر
وہ پکاری کہ حسینؑ ابنِ علیؑ کی خواہر
اک فقط میں ہی نہیں دیکھ کے سب آئے ہیں
ولیسان یا نہ کے گردن میں حمائل ہیں

(۱۷)

جس کا بابا ہے علیؑ شیرِ خدا وہ زینبؑ
جس کا جد فخرِ رسولانِ بلا وہ زینبؑ
جس کا اک بھائی ہے شاہِ شہدا وہ زینبؑ
جس پہ تھے شبر و شبیر فدا وہ زینبؑ
وہ زینبؑ نہیں حاشا یہ نبی زادی ہے
بھائی مارا گیا اللہ سے فریادی ہے

"اللہ سے فریادی ہے" اس ٹکڑے نے حضرت زینبؑ کے کیرکٹر کو کس شان سے نمایاں کیا اور کوئی عورت ہوتی تو اپنے بھائی کے قاتلوں کو بددعا دیتی یا ہر کس و ناکس سے امداد کی طالب ہوتی مگر یہ زینبؑ فقط اپنے اللہ سے فریادی ہے۔ وہ بھی ان ظالموں پر نہیں جو خود اس پر گر رہے بلکہ بھائی کے بے گناہ قتل پر

(۱۸)

بخدا حضرت زینبؑ تو انھیں کہتے ہیں ہم
فوج میں اور ہی القاب ہیں زہراؑ کی قسم
کوئی "بھائی موئی" کہتا ہے کوئی کشتۂ غم
کوئی کہتا ہے عزادارِ شہنشاہِ اُمم
فوج جو چاہتی ہے بغض سے کہہ جاتی ہے
دیکھ کر اک سرِ پُرخوں کو وہ رہ جاتی ہے

آخری مصرع کی شرح کو ایک دفتر درکار ہے۔ پھر بھی اس خوبی سے مطلب ادا نہ ہوگا جو ان لفظوں میں محفوظ ہے۔ ع

"دیکھ کر اک سرِ پُرخوں کو وہ رہ جاتی ہے"

علیؑ کی بیٹی جس کے سر سے چادر سرک جائے تو شرم سے آفتاب نہ نکلے سر برہنہ کس بے حرمتی سے شہر بہ شہر پھرائی جاتی ہے۔ مقدور بے قرار ہے، روحانیت قائم ہے۔ پھر بھی سب کچھ سنتی ہے، برداشت کرتی ہے اور اُف نہیں کرتی اس

www.taemeernews.com

لئے کہ بھائی نے جس عظیم کام کا بیڑا اٹھایا تھا (کہ حق باطل کے سامنے نہ جھکے) بنا بنایا بگڑ نہ جائے۔ حسینؑ نے محض انسانی طاقتوں سے حق کی حمایت میں باطل کا مقابلہ کیا۔ اعجاز امامت کو دخل نہیں دیا تاکہ اسلام نہ صرف وسیلۂ نجات اخروی بلکہ بہترین اخلاق، بہترین تہذیب، بہترین نظام عمل ثابت ہو۔ انسان پر ایک وقت میں جتنی مصیبتیں پڑ سکتی تھیں جمع ہو گئی تھیں مگر اس خدیۂ حق کے پائے ثبات میں کوئی لغزش نہیں ہوئی۔ تنہا حسینؑ سے یہ کارنمایاں سرزد ہوتا وہ تنہا آزمائش میں پامردی و پاشبانی دکھاتے تو ان کی مثال ہمت افزا ہونے کے عوض ہمت شکن ثابت ہوتی اپنے سر دیا نہ جاتے جن کی تقلید ناممکن ہے (بدقسمتی سے اس ذہنیت کے لوگ پھر بھی پیدا ہو گئے) مگر اس مختصر جماعت میں جس نے روز عاشورا ہمت و استقلال کا ایسا شاندار مظاہرہ کیا کہ ہر طبقے اور ہر حیثیت اور عمر کے لوگ شامل تھے۔ اور ہر پایہ کے شخص کے لئے درخشاں مثال موجود ہے یہ دعوت عمل مردوں تک محدود نہیں بلکہ عورتوں کے لئے بھی ہے ادھر مردوں میں حسینؑ اور ان کے عزیز و انصار ہیں جن میں حُر کا غلام بھی ہے تو ادھر عورتوں میں زینبؑ سی بی بی اور فضہ سی کنیز ہے اور جو ہے وہ حق پرستی و وفا شعاری کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے بساط بھر قربانیاں کیں اور صرف اسلام کے احیا اور بقا کی خاطر جو ہے راستی اور حق پرستی کا علمبردار ہے۔

(۱۹)

پیٹ کر منھ کہا شیریں نے جس جس جو نہ تھا
سب پتے ٹھیک تو دیتی ہے نہیں فرق ذرا
پھر حکم ہو تو ہی مشک میرا ہے بجا کر بجا
کوئی لوٹے گا پیمبر کی نواسی کو بھلا
کوئی دیتے تھے علیؑ صاحب تقصیر کے ہاتھ
باندھ سکتا ہے کوئی خواہر شبیرؑ کے ہاتھ

شیریں اس عورت کو طیش میں کہہ چکی تھی: "خاک منھ میں ترے"۔ اب اس کی معذرت کرتی ہے۔ پھر اپنے اشتباہ کی وجہ بیان کرتی ہے کہ حضرت زینبؑ پیمبرؐ کی نواسی ہیں اور علیؑ ایسے جواد تھے کہ صاحب تقصیر کے بندھے ہاتھ کھول دیتے تھے۔ اس عقدہ کشائی سے اپنے قاتل کو بھی محروم نہ رکھا۔ پھر شبیرؑ سا جاں نثار بھائی امام عصر موجود ہے کیں مسلمان کو ایسی گستاخی کی جرأت ہوئی ہوگی یا غیرت گوارا کرے گی کہ زینبؑ کے ہاتھ باندھے۔ یہ عورت حضرت زینبؑ کے ایک بھائی کو شاہ شہدا کہہ چکی ہے۔ (بند نمبر ۱۷۔ مصرع نمبر ۳) ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ شیریں اسی لفظ کو پکڑ لیتی ہے۔

(۲۰)

کون بھائی مری بی بی کا ہے شاہ شہدا
ہے لقب شبرؑ و شبیرؑ کا سید میں فدا
مرتضےٰ کہتے تھے عباسؑ کو شمشیر خدا
اور جو زینبؑ کے ہیں بھائی لقب ان کے ہیں جدا
نہ یقین ہونے کا باعث بڑا ہے یہ بھینا
کہنے اور سننے میں کچھ فرق پڑا ہے بھینا

اور بمعنی دوسرے (دیگر، روزن فاع) غور ہونا چاہیئے مرزا دبیر نے فع یا در نظم کیا ہے جس سے فصحا احتراز کرتے ہیں بند میں (مصرع نمبر ۴) تو داؤ کا اخفا خاص طور پر محل نظر ہے کیونکہ معنی میں بھی اہمال پیدا کرتا ہے۔

(۲۱)

یاد ہے جب کہ تھی شاہ عجم کی سرکار
لوٹنے والے مسلمان، عجم تھے کفار
پر ردا دختر کسریٰ کی نہ چھینی زنہار
اب یہ اندھیر زمانے میں پڑا کیا اک بار
بنت زہراؑ کی نہ کی رتبہ شناسی ہے ہے
ننگے سر احمد مرسل کی نواسی ہے ہے

[illegible] ہوا ہے نہ کہ اندھیر پڑا۔

بات سے بات نکال کر سلسلہ قائم رکھنا مرثیہ نگاری میں کمال جنگی کا ثبوت ہے۔ حضرت شہربانو (دختر کسریٰ) کا ذکر آگیا۔ شیریں کو خیال ہوا لاؤ پوچھوں وہ بھی اس قافلے میں ہیں۔ اگر نہیں ہیں تو اس قافلے کا حسینی قافلہ ہونا مشتبہ ہے۔

(۲۲)

شہربانو بھی بھلا واں تجھے آئی تھی نظر
بولی وہ جھوٹ میں کاہے کو کہوں اے مضطر
حالِ زینبؑ سے میں بیحال ہوئی رو رو کر
نہ خبر اتنی رہی پوچھوں جو بانو کی خبر
رہ گیا ہوگا پر زہ جو وطن میں ہوں گی
اور جو یاں ہیں تو گرفتار رسن میں ہوں گی

(۲۳)

کہا شیریں نے کہ بس بس ہوا دل کو آرام
دائماً پہلوئے زینبؑ میں ہے بانو کا مقام
ہر یہ بی بی ہے کوئی بنت علیؑ کی ہمنام
اس کی مشکل کو بھی آسان کرے ربِ انام
جان کی خیر ہو بچھڑا ہوا بھائی مل جائے
نام زینبؑ کے تصدق میں رہائی مل جائے

مگر دل کو تسکین نہیں ہوتی اور تصدیق کرنے خود روانہ ہوتی ہے۔

(۲۴)

کوئی عرصہ روانہ ہوئی پھر وہ چار
ہر قدم کہتی تھی یا رب یہ غلط ہوں اخبار
پر تہہ قلعہ جو آئی تو یہ دیکھا اک بار
تیغیں کھینچے ہوئے پھرتے ہیں طلایہ کے سوار
نوبتیں بجتی ہیں ہر سمت خوشی ہوتی ہے
ایک بندی ہے نہ سر کھولے ہوئے روتی ہے

(۲۵)

ایک لشکر ہے کئی کوس کے گرد ہے میں پڑا
اک طرف لوٹ کے اسباب پہ پہرا ہے کڑا
روک ٹوک آمد و شد میں ہے تشدد ہے بڑا
دل اسی حال سے ہے لشکرِ جنگی کا اڑا
کفر و بدعت ہے شریعت نہیں اسلام نہیں
سب تجمل ہے پہ رونق کا کہیں نام نہیں

آخری تین مصرعوں میں اس وقت کے عام مسلمانوں کا پورا نقشہ ہے۔ مال دنیا کی حرص۔ کفر و بدعت ظاہری طمطراق مگر نورِ ایمان کی جھلک نام کو نہیں۔

(۲۶)

نقرئی اور طلائی ہیں علم و نقشوں
اور پھریروں پہ رقم نام یزید ملعوں
بوق و نقارہ و قرنا و دہل حد سے فزوں
نیزہ و گرز میں آلودہ ہے مقتولوں کا خوں
اک علم پنجے میں مشکیزہ بندھا خاک پہ ہے
کہکشاں نور سے اس کے تہِ افلاک پہ ہے

چوتھے مصرع میں ان لوگوں کے کیرکٹر کا لب لباب ہے سپاہی اپنے اسلحہ صاف و براق رکھتا ہے۔ مگر ان کمینوں نے اپنے آلات حرب کو خون آلودہ چھوڑ دیا ہے تاکہ ڈینگ ہانکنے اور فخر کرنے کا موقع ملے کہ ہم نے حسینؑ اور انصارِ حسینؑ کا خون بہایا۔ ان کے دل میں چور ہے کہ ان کی بات کا یقین نہ آئے گا لہٰذا ثبوت میں پیش کرنے کو یہ اسلحہ خون آلود رہنے دیتے ہیں۔

ف ایک قلمی مرثیے میں یہ مصرع اس طرح رقم ہے ؎
بال کھولے ہوئے اک بی بی کھڑی روتی ہے
(اثر)

(۲۷)

جشن ہے، رقص ہے، اور انجمن آرائی ہے
نور ساغر کا تجھے گنبدِ مینائی ہے
کہیں صرافہ و بزازہ کی زیبائی ہے
گرم بازار ہے ہر ذلت و رسوائی ہے
اہلِ لشکر طرب و عیش کا دم بھرتے ہیں
سر کٹے نیزوں پہ تسبیحِ خدا کرتے ہیں

آخری مصرع ایسے عیش کو ابدالآباد تک ذلیل و مردود اور ان خونخوار انسانوں کو درندوں سے بدتر ثابت کرنے کو کافی ہے۔

(۲۸)

دست تھامے ہوئے ہاتھوں میں کئی سو کفار
گرد ہیں قیدیوں کے ظلم و ستم پہ طیار
دم بدم ہے یہی قدغن کہ اسیرو ہشیار
غل نہ کرنا ابھی سوتے ہیں ہمارے سردار
خاک جو بالوں پہ ڈالو گے تو تم جانو گے
منھ سے آواز نکالو گے تو تم جانو گے

بیت میں اہلِ لشکر کے جبر و تشدد اور اسیروں کی مظلومی و بے کسی کی دل ہلا دینے والی تصویر ہے۔ اندازِ اشعار اسیروں کو سر پر خاک ڈالنا منع ہے۔ مبادا اڑتی ہوئی خاک کے سرداروں کے دماغ تک پہنچ جائے۔ رونا کیسا آواز نکالنا گناہ ہے کہ ان کے عیش و آرام میں خلل نہ پڑے۔ یہ لوگ نماز گزار بھی نہیں کیونکہ دن چڑھ گیا مگر سو رہے ہیں۔ راتوں کو شغلِ شراب و کباب رہتا ہے اور دن چڑھے تک سو کر خمار اتارا جاتا ہے۔

(۲۹)

کوئی کہتا ہے بڑے شیر کو مارا میں نے
نہ کیا قتل سے سقے کے کنارا میں نے
ایک کہتا ہے کہ بدعت کی گوارا میں نے
سر بمشکل نبی تن سے اتارا میں نے
کوئی کہتا ہے عجم اور عرب کو مارا
اس نبی زادے کو کیا ماں کو سب کو مارا

(۳۰)

یہ سخن قہر کا شیریں نے سنا واں جس دم
سر سے ہوش اڑ گئے رکھنے لگا سینے پہ دم
بے حواسی سے کیا قصد سوئے اہلِ حرم
چلی آہستہ بچاتی ہوئی آوازِ قدم
بیبیاں آہِ شیریں سے خجل ہونے لگیں
بال بکھرا دیئے رخساروں پہ اور رونے لگیں

"سر سے ہوش اڑنا" میں نہیں سمجھا۔ "ہوش اڑ گئے" کافی تھا یا محاورے کی حدوں میں "پیترے ہوش ہوئے" کہہ سکتے تھے۔ آخری مصرع غیرت حیا، بیکسی اور مجبوری کی ایسی تصویر ہے جس کا جواب مشکل سے ملے گا۔

(۳۱)

یک بیک کانپ کے بانوئے عجم چلائی
کہو لوگو میں کہاں جاؤں وہ شیریں آئی
بولی خوش ہو کے سکینہ مری قسمت لائی
اب یہ جانو کہ شہِ شاہ کی ہے پائی
اس کی خدمت کے سدا ذکر رہا کرتے تھے
بابا گھر جانے کو شیریں کے کہا کرتے تھے

(۳۲)

کو یقین ہے کہ شہ دیں نے اسے شاد کیا
کربلا چھوڑ کے شیریں کا گھر آباد کیا
اس کے آنے نے مجھے فکر سے آزاد کیا
بعد مدت مرے بابا نے مجھے یاد کیا
تحفہ و ہدیہ مرے واسطے لائی ہے یہ
قبلہ و کعبہ کی بھیجی ہوئی آئی ہے یہ

ایک کمسن بچی کے خیالات کی کیسی سچی ترجمانی ہے

(۳۳)

ہاں بکھرا کے خیموں میں تم کو چھپاؤ اماں
کہیں پھر جائے نہ یہ اس کو بلاؤ اماں
جلد شبیر کو صدا اپنی سناؤ اماں
بھیا اکبر کی خبر لے چلے جاؤ اماں
پیچھے پیچھے تو یہاں بندی تمھاری آئی
آگے آگے مرے بابا کی سواری آئی

"تمھاری بندی" روزمرہ ہے۔ یہاں اس نے حضرت سکینہ کا باپ سے رُوٹھنے کا مفہوم بھی اضافہ کیا کہ حسینؑ کی لاڈلی سکینہؑ کو یقین ہو گیا ہے کہ بابا کو میری محبت نہیں رہی۔ علی اصغرؑ کو پانی پلانے لے کر چلے گئے اور مجھے شمر کے طمانچے کھانے کو تنہا چھوڑ گئے۔ آیندہ بند میں اس کی وضاحت ہے۔

(۳۴)

کربلا میں مرے بابا نے نہ پایا پانی
لا کے شبیر نے گھر اصغر کو پلایا پانی
ایک ہم ہیں کہ کہیں ہاتھ نہ آیا پانی
وائے تقدیر کہ سقا بھی نہ لایا پانی
کھائے مہمانی کے اس تشنہ دہن نے کھائے
ہاں طمانچے علی اصغرؑ کی بہن نے کھائے

بیت میں بے پناہ مرثیت ہے۔ علی اصغرؑ کی طرح یہ بھی بھوکی پیاسی تھیں۔ وہ سیر ہوئے مگر ان کی بہن کی قسمت میں آب و غذا کے بدلے شمر کے طمانچے تھے۔ "علی اصغرؑ کی بہن" اس ٹکڑے میں جو طنز و تشنیع ہے اس کا کیا ٹھکانا ہے

(۳۵)

جا کے تسلیم شہ دیں کو کروں گی جس دم
نیل رخساروں کے دکھلاؤں گی کانوں کا ورم
شمر بے رحم کو بلواؤں گی واں میں پُر غم
چچا سے یہ کہوں گی تمھیں حضرت کی قسم
دیدیا شمر ستمگر کو خدا را اُتار
اس نے بیٹی کے طمانچے کا اتارا عمر

ماں بیٹی کا مکالمہ یقیناً شاعر کے تخیل کی پیداوار ہے تاہم یہی نہیں کہ حضرت سکینہؑ کے کردار کی صحیح ترجمانی ہے بلکہ وجدان کی رہبری نے اس کردار کو مقتضائے بات کے موافق بھی ثابت کر دیا ہے۔ حضرت سکینہؑ کمسن ہیں اور بچوں کی طرح رشک کا مادہ ان میں بھی ہے۔ خصوصاً جہاں ماں باپ کی محبت کا سوال آجائے۔ رقیہؑ تو تھی ہی بابا سے ہم سے زیادہ علی اصغرؑ کا خیال کیا۔ مگر اس رشک میں تلخی نام کو نہیں۔ باپ کی محبت بدستور قائم ہے تاہم دل دکھا ہے شکوہ ضروری ہے۔ مگر الفاظ میں نہیں۔ رخساروں کے نیل اور کانوں کا ورم دکھایا جائے گا۔ یہ نشان زبان حال سے فریاد کریں گے کہ بابا تم جس چھیتی بیٹی کو پھولتی پھلتی سلاتے تھے اُسے بے رحموں کے پنجہ میں چھوڑ کر چلے گئے۔ علی اصغرؑ کو سلا لیا تو انھیں کیا خبر کہ علی اصغرؑ کا گلا ناحق حرملہ کے تیر کا نشانہ ہو گیا۔ میں نے کیا تقاضہ کیا تھا کہ میرا دھیان نہ رکھا۔ بابا تم نے بچپن کے بڑے بڑے صدمے اُٹھائے۔ اس قسم کا طرز عمل دوسرے شریف خاندان کی لڑکیوں کا بھی ہو سکتا ہے جن کی عمر چھ سات برس کی ہو مگر یہ شرف خاندان رسالت کے ہی نونہالوں کا ہے کہ اپنے آزار پہنچانے والوں کو سزا دلوانے کے موقع پر درگزر کرتے ہیں مگر سکینہؑ کو جو اپنی ماں سے محبت ہے وہ اس کی روادار نہیں کہ اُن کی اہانت ہو اور یہ خاموش رہیں لہٰذا شمر کو اپنے نازبردار چچا عباس سے سزا دلوانا چاہتی ہیں وہ بھی اس وجہ سے نہیں کہ وہ اس بے دردی سے چھینے کہ کان لہولہان ہو گئے۔ یا اس بے رحمی سے طمانچے مارے کہ رخساروں پر اب تک نیل پڑے ہیں بلکہ اس پاداش میں کہ ماں کے سر سے ردا اُتار لی۔

دل بول اُٹھتا ہے کہ ایسے خانوادہ کی لڑکی کا ایسا ہی
شعار ہونا چاہیئے۔ کردار نگاری کے ایسے شاندار نمونے جہاں تک
پڑوں کا تعلق ہے شاید ہی کسی ملک یا زبان کی شاعری نے
پیش کئے ہوں :۔

(۳۶)

کہا بانو نے بیٹی ذرا ہی نہ یہ کہہ چلا کر
شہر بی بی کو نہ مارے کہیں پھر جھنجھلا کر
اپنے بچھڑے نہیں حضرت بولیں گے آکر
ننھا بھائی تو موا تیر گلے پر کھا کر
ابھی کیا جانیے کس کس سے خجل ہونا ہے
ننگے سر دیکھے گی شیریں مجھے یہ رونا ہے

(۳۷)

یہ بیان تھا کہ گزرا سامنے شیریں کا ہوا
بولی سادات کی بو آتی ہے یاں صلِ علیٰ
قیدیو! نام و نسب مجھ کو بتا دو اپنا
علوی ہو کہ بنی فاطمہ و آلِ طٰہٰ
پر میں حیران ہوں بلوہ کہاں سادات کہاں
آلِ یٰسین کہاں لشکرِ بدذات کہاں

(۳۸)

ہے کچھ میری سمجھ میں نہیں آتا یہ حال
کل سے افواہ تھی یاں آتا ہے زہرا کا لال
مری ہمسائیاں آئی تھیں پئے استقبال
دیکھ کر تم کو پھریں یاں سے وہ کھولے ہوئے بال
صاف سادات کی ہے شانِ غریبی تم میں
کوئی زینب کی بھی ہمنام ہے بی بی تم میں

(۳۹)

بانو ننگے میں نکل آئی، ہوں مشتاقِ امام
ٹھنڈا ہوتا ہے وہاں گھر میں ضیافت کا طعام
بولیں بانو کوئی زینب کا نہیں یاں ہمنام
سبھی قیدی، سبھی مظلوم، سبھی ہیں ناکام
تیرا مہمان ہے صادق ترے گھر آئے گا
ذبح کر ڈالے گا گر کوئی تو سر آئے گا

چوتھے مصرع کی اندوہی خستگی۔ ٹوٹے دل کی فریاد ہے۔

(۴۰)

جانِ شیریں میں نہ باقی رہی سن کر یہ بیاں
سب کو جھک جھک کے لگی دیکھنے ہو کر حیراں
اور پکاری کہ اس آواز کے شیریں قرباں
صدقے میں! بول رہی ہو مری شہزادی کہاں
سخنِ بانوئے شبیر کا انداز ہے یہ
مادرِ سیدِ سجاد کی آواز ہے یہ

(۴۱)

پاؤں پر گر کے کہا سر تو اُٹھاؤ بی بی
ہائے کیا ہو گیا یہ جلد سناؤ بی بی
میرے آقا تو سلامت ہیں بتاؤ بی بی
علی اکبرؑ کی ہوں مشتاق دکھاؤ بی بی
لو گنہگار نہ فرماؤ میں قربان گئی
علی اکبرؑ کی تمھیں ماں ہوں میں پہچان گئی

(۴۲)

کہا بانو نے کہ کیوں کر تجھے آیا باور
ہے غضب بلوے میں ناموسِ امامِ اطہر
لٹ گئے آلِ نبیؐ کیا جو پھری وہ زرزور
مر گیا کیا علی اکبرؑ جو ہوئی ننگے سر
کیا نہ لائی تھی وہ ایمان کہ پھر قید ہوئی
کیا ہوئی تھی نہ مسلمان کہ پھر قید ہوئی

استناد بالکنایہ نے استفہامیہ اندازِ بیان سے مل کر اس
بند کو تاثیر کا طلسم بنا دیا ہے :۔

(۴۳)

خواب میں فاطمہؑ نے اُس کو مسلمان کیا

پھر خدا شاہ نجف نے اسے ایمان کیا
یاد زینب کے قریں بیٹھ کے قرآن کیا
کس نے لوٹا اسے کس نے اُسے ویران کیا

طوق و زنجیر گنہگار کو پہناتے ہیں
یا عزا شہ ابرار کو پہناتے ہیں

آج کل یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ ہر مسلمان صاحب ایمان بھی ہے کاش جس فرق کی طرف مرزا دبیر نے اشارہ کیا ہے، ہمارے پیش نظر رہے تاکہ نیکوکاری، اور اخلاق و حسن سلوک کو بھی اہمیت دیں جس کے وہ مستحق ہیں اور نفس کے بندے ہو کر نام کے اسلام یا زبانی ولائے اہلبیتؑ اطہار کو اپنی بدکاری اور معصیت کوشی کا پردہ پوش نہ بنائیں۔

(۴۴)

سر اکبرؑ کے پھر اُٹھ اُٹھ کے کئے نظارے
اور چلائی کہ اے چشم نبیؐ کے تارے
حکم کیا ہے مجھے بابو اعلیٰ اکبرؑ پیارے
کھو دیئے آپ نے مر کر مرے رتبے سارے

ننگے سر بلوے میں پہنے ہوئے زنجیر ہوں میں
داری شیریں سے کہوں زوجۂ شبیرؑ ہوں میں

(۴۵)

دردِ دل اُس سے کچھ اظہار کروں یا نہ کروں
تیری ماں ہونے کا اقرار کروں یا نہ کروں
یہ ردا دے تو میں انکار کروں یا نہ کروں
کچھ سوال اُس سے میں نادار کروں یا نہ کروں

مر گئے سبطِ نبی اب مجھے کیا ہے درکار
رانڈ بیٹی کے لئے ایک ردا ہے درکار

کس قدر دلخراش بند ہے۔ کیا بامذاق طریقہ اس امر کے اظہار کا نکالا ہے کہ ہاں اِن شیریں میں تیری شہزادی بانو ہی ہوں جسے اسلام کے نام لیوا غداروں نے اس حال کو پہنچا دیا۔

(۴۶)

سر ہم شکل نبیؐ خم ہوا شرمانے لگا
اس طرح تڑپا کہ جو نیزہ بھی تھرانے لگا
دیکھ کر بانوئے شبیرؑ کو غش آنے لگا
سر پُر نور فصاحت سے یہ فرمانے لگا

شرف عزت ذاتی کہیں کم ہوتا ہے
اماں چلا کے نہ رو مجھے غم ہوتا ہے

جسد سے علیحدہ سر تڑپ نہیں سکتا۔ دبیرؔ کی صناعت نے اس مشکل پر بھی عبور حاصل کیا اور ناممکن کو اس طرح ممکن بنا کر دکھا دیا کہ نیزہ تھرانے لگا لہٰذا یقین ہوا کہ سر جو نیزے پر تھا تڑپنے لگا۔ ہر چند سر کو تڑپتے نہیں دیکھا۔

(۴۷)

مُنھ پہ پلا لیا شیریں نے یہ کہنے لگی زین
بائے خاتون قیامت کے پسر ہائے حسین
دے کے پُرسا کہا بانو سے یہ باسیدون نشین
مجھ کو دکھلا دو سر سبط رسول الثقلین

ساتھ سر فوج حسینی کے تمام آئے ہیں
دیکھوں کس طرح مرے گھر میں امام آئے ہیں

(۴۸)

ہاتھ شیریں کا پکڑ کر اُٹھی بانوئے حزیں
گئی روتی ہوئی سرہائے شہیداں کے قریں
اٹھ اٹھا کر کہا لے دیکھ لے تو اے شیریں
جس کی زلفیں ہیں بندھی نیزے سے اور شق ہے جبیں

تیرا مطلوب ہے اللہ کا یہ طالب ہے
یہ حسین ابن علیؑ ابن ابی طالب ہے

آہ زلفیں رہنمائے شقاوت نیزے سے نہیں باندھی گئی تھیں بلکہ یہ سر اطہر اتنا پارہ پارہ تھا کہ زلفوں کو باندھے بغیر نیزے پر نہیں ٹھہر سکتا تھا۔

... ...

(۴۹)

غور سے اس نے نظر کی جو سر شہ کی طرف
دیکھا سر پیٹتے ہیں سر کے قریں شاہ نجف
فاطمہ کہتی ہیں ہے ہے مرے مظلوم خلف
گرد نیزے کے ملائک بھی ہیں باندھے ہوئے صف
انبیاء جتنے ہیں سر کھولے ہوئے روتے ہیں
اوصیاء سب سر پُر خوں پہ فدا ہوتے ہیں

(۵۰)

اس نے انگشت شہادت سے اشارہ یہ کیا
السلام اے شہ مظلوم غریب الغربا
السلام اے پسر فاطمہ و شیر خدا
السلام اے وطن آوارہ و شاہ شہدا
تیرے لشکر تیرے دربار کے صدقے شبیر
تیری زوجہ تیری سرکار کے صدقے شبیر

شاعر کے صحیح احساس کا اندازہ اور قدر کیجئے کہ زینب شبیر جو بلند آواز سے بین کر رہی تھی جب سر حسین کے گرد انبیاء و اوصیاء و ملائک کا مجمع دیکھتی ہے تو اس کی رقت سلب ہو جاتی ہے اور داڑھیں مار مار کر رونے کی بجائے صرف انگشت شہادت سے اشاروں میں کہتی ہے کہ السلام اے

عقیدے سے ہٹ کر بھی دیکھئے تو شاعر کے کمال میں فرق نہیں آتا جب اس نے ایک ماحول پیدا کر لیا تو شاعرانہ صداقت اور بلاغت یہی ہے کہ اسی کے مطابق تخیلات کا رُخ پھیر دے۔ ملٹن یا ڈانٹے یا دوسرے شاعر جنھوں نے مافوق الفطرت امور کی مصوری کی ہے اسی سے مشہور ہیں کہ جس دنیا کے خلاف ہوتے اسے دنیا ہی مخلوق سے آباد کیا جو اس کے لئے موزوں تھی۔

غیر مذہب کا شخص نہ مانے گا کہ سر حسینؑ کے گرد ایسا مجمع تھا مگر قربانی کی عظمت، روح کی جسم پر، حق کی باطل پر فتح کا منکر نہیں تو ضرور تسلیم کرے گا کہ یہ شمع حریم لم یزل اسی قابل ہے کہ روحانیوں میں بھی جو اولوالعزم ہیں اس کے پروانے بنیں۔

(۵۱)

میں ترے آنے کے قربان ابا عبداللہ
واہ کیا جاہ ہے کیا شان ابا عبداللہ
خوب میرے ہوئے مہمان ابا عبداللہ
بال زینبؑ کے پریشان ابا عبداللہ
مع لشکر مع ناموس پیمبر آئے
عین وعدے پہ حضور آئے پہ مر کر آئے

اس بند کے گھٹے ہوئے مگر متنوع جذبات کی کون تعریف کر سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہر لفظ کی قیمت ایک پارۂ دل سے ادا کی جا رہی ہے اور آخری مصرع تو خون تمنا میں ڈوبا ہوا ہے۔ منظر کی دل روشنگی اور جراحت ریزی اور بڑھ جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ عظیم روحوں کی موجودگی میں جذبات غم دائم کا اظہار صرف ڈبڈبائی حسرت بھری آنکھوں تھراتے ہوئے ہونٹوں یا نہ دبنے والی اور بند بند ہلا دینے والی سسکیوں کے ذریعہ سے ہو رہا ہے۔

(۵۲)

تم تو جنت کو سدھارے میں بلاؤں کس کو
مر گئے فاقے سے تم کھانا کھلاؤں کس کو
آپ پیاسے موئے شربت میں پلاؤں کس کو
آپ نیزے پہ ہیں مسند پہ بٹھاؤں کس کو
دست دیا چومنے کا طور بھی یہاں نہیں
اے مہمان ترے پاؤں نہیں ہاتھ نہیں

خدا کی پناہ کیسے خونی جذبات کا تلاطم ہے۔

یہ فغاں سنتے ہی کانپا سر سلطان امم
اور شبیر کی طرف نیزۂ پُر خوں بہ اخم
بیڑیاں تھام کے اُٹھے پئے تعظیم حرم

کیا سر نے کہا کیا دیکھتی ہے اے پُرغم
راکب دوشِ رسولِ الثقلین آتا ہے
ہاتھ پھیلا، سرِ پُرخونِ حسینؑ آتا ہے

آپ شاید کہیں کہ لفظ فغاں سے میرے اس دعوے کی تردید ہوتی ہے کہ شیریں نے سرِ اطہر کو اشاروں میں مخاطب کیا کیونکہ فغاں کے معنی چیخنے چلانے اور فریاد کرنے کے ہیں میں عرض کروں گا کہ بند نمبر ۵۰ میں صاف طور پر لفظ اشارہ درج ہے "اشارہ کیا" کی شرح تمام عبارت مابعد ہے جب اشاروں میں اظہارِ مدعا ہو سکتا ہے اور ضرور ہو سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اگر اُس کی نوعیت فریاد کی ہو تو ایسے اشاروں کو فریاد و فغاں سے کیوں نہ تعبیر کیا جائے دل بھی فغاں کرتا ہے خواہ فغاں الفاظ یا صورت میں منتقل نہ ہو اور سُننے والا سُن بھی لیتا ہے۔ یہ درست ہے تو سرِ حسینؑ اپنی کنیز کی خاموش فغاں کیوں نہیں سُن سکتا۔

علاوہ بریں آپ ہی کوئی صورت نکالئے کہ اگر پہلا قضیہ نادرست ہے یعنی شیریں نے جو کچھ کہا اشاروں میں کہا تو اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے کہ اس درد بھرے مجموعۂ خیالات کو جو اشاروں یا زیرِ لب ادا ہو فغاں نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے اگر اشاروں کی زبان ہو سکتی ہے تو فغاں بے استمداد صدا بھی ہو سکتی ہے۔ اگر اشاروں کی زبان سمجھی جا سکتی ہے تو ایسی فغاں بھی سُنی جا سکتی ہے (میں نے اعجازِ امامت کو توجیہہ سے عمداً علیحدہ کر دیا)۔

(۵۴)

دزدی پھیلائے ہوئے دستِ تمنا شیریں
آ گئی نیزے سے تڑپ کر سرِ پاک شہِ دیں
بیٹھی آغوش میں سر کے وہ بالائے زمیں
سے کے عارض کی بلائیں کہا سمجھی میں حزیں
میرے گھر میں جو قدم رنجہ نہ سرور نے کیا
گود میں آ کے سرِ اقدس مجھے سر نے کہا

صلح احباب سے خوش ہے دلِ محزوں اپنا

وہ فغاں یا بین جس میں صوت و الفاظ کو دخل ہے اب آئی ہے کیونکہ منظر و ماحول سب بدل گیا اور اب مرکزِ خیال و نظر یہ سرِ پُرنور اور صرف یہ سرِ پُرنور ہے۔

(۵۵)

پھر کئے بین کہ ہے ہے مرے آقا ہے ہے
مر گئے شیرِ خدا احمدِ زہرا ہے ہے
زیبِ ایماں رہی نے رونقِ دنیا ہے ہے
ہائے ویراں ہوئے یثرب و بطحا ہے ہے
آلِ حیدرؑ کے لئے پانی نہیں، قوت نہیں
شہداء کے لئے مرقد نہیں، تابوت نہیں

(۵۶)

گر زمیں آئے ہو تو منھ سے بھی بو آتی
پانی لاؤں رخِ پُرنور کو دھویا نہ آتا
شیرِ زہراؑ کی قسم ہونٹوں کو کھولو آقا
ہم سخن خادمۂ خاص سے ہو لو آقا
ہائے تم ذبح ہوئے فوج بھی مقتول ہوئی
ہائے آقا نہ ضیافت مری مقبول ہوئی

(۵۷)

معجزے سے ہوا گویا یہ سرِ سبطِ رسولؐ
میں نے اور میرے خدا نے تری دعوت کی قبول
بارک اللہ نبیؐ کہتے ہیں احسنت بتولؑ
اب ضیافت ہے ہماری یہی اے زارِ علیل
فاتحہ پیاسوں کا شربت پہ دلانا شیریں
پانی تھوڑا سا سکینہؑ کو پلانا شیریں

(۵۸)

بس دبیر اب نہ بیاں کر تو بیانِ شیریں
زندگی تلخ ہے سُن سُن کے فغانِ شیریں
کھو گئی شیریں نے غمِ شاہ میں جانِ شیریں
شکر کر حق نے تجھے بخشی زبانِ شیریں
اُن کے مضمون سے لڑتا نہیں مضمون اپنا

قاضی عبدالودود

مرگِ دبیر

"مرگِ دبیر" کے عنوان سے عہدِ اول کے محقق قاضی عبدالودود صاحب کا ایک مغیر مضمون معاصر پٹنہ عہدِ اول میں برسوں قبل شایع ہوا تھا۔ قاضی صاحب سے سرفراز کے دبیر نمبر کے لئے مضمون کی استدعا کی گئی تھی لیکن موصوف کی علالت کے پیشِ نظر نیا مضمون ممکن نہ تھا۔ اب معاصر پٹنہ کی فائل سے یہ مضمون قارئین سرفراز کے لئے پیش کیا جا رہا ہے۔ معاصر کی فائل کے لئے میں ذاتی طور پر ڈاکٹر نورالحسن صاحب ہاشمی کا ممنون ہوں۔ موصوف نے سرفراز کے دبیر نمبر کے لئے ایک پیغام بھی ارسال فرمایا ہے جو شایع کیا جا رہا ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب کے مضمون میں حواشی کے تحت معاصر پٹنہ میں بعض اندراجات غالباً سہوِ کتابت کے باعث حذف ہو گئے ہیں۔ میں مجبوراً مضمون کو من و عن نقل کر کے پیش کر رہا ہوں۔ اگرچہ مضمون کے آخر میں بعض حواشی غائب ہیں۔ قاضی عبدالودود صاحب کا یہ مضمون دبیر پر کام کرنے والے محققین و ناقدین کے لئے اپنے دامن میں افادیت کے بہت سے گوشے رکھتا ہے۔

—— کاظم علی خاں
ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

۱۰ مارچ ۱۸۷۵ء سے ۳۰ جون ۱۸۷۵ء کے اودھ اخبار میں مرزا دبیر کی وفات یا اُن کے اخلاق کے متعلق جو نظم و نثر چھپی تھی، وہ بعض چیزوں کو چھوڑ کر درج ذیل کی جاتی ہے۔

"جناب مرزا دبیر صاحب کی وفات۔ بیہات۔ بیہات بیہات بیہات" "صد ہزار حیف کہ اقلیمِ سخن لٹ گئی، آفتاب کمال غروب ہو گیا، مرثیہ گوئی کا خاتمہ بالخیر (کذا) ہوا، یعنی افصح الفصحیٰ ابلغ البلغا، سحبانِ زماں، طوطیِ ہندوستاں، شاعرِ بے نظیر جناب مرزا دبیر بے وقتِ اندوہِ انیس ہو کر شمعِ ساں اپنے جسمِ ناتواں کو گھلا دیا اور آخر کار چند روز بے آب و دانہ رہ کر امراض دردِ گردہ وغیرہ میں اس عندلیبِ معانی نے گلزارِ قدس کا راستہ لیا انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اس واقعۂ حسرت ناک سے تمام لکھنؤ میں کہرام مچا ہے، ہر کہہ و مہ کی جان پر وہ سخت صدمہ ہے کہ جس کا بیان قلم اندوہ رقم سے نہیں ہو سکتا۔ واضح ہو کہ منگل کی اخیر شب کو یعنی ۲۹ محرم کو یہ حادثہ واقع ہوا۔ تمام علما و امرا اور ہزارہا اشخاص لکھنؤ کے اس خبرِ وحشت اثر کو سن کر جوق جوق جناب مغفور کے مکان پر چلے آتے ہیں، روتے ہیں، پیٹتے ہیں، چلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ غریقِ رحمت کرے۔ بجہ

کی بخشش آئندہ رقم ہوگی۔ ایسے شہنشاہ سخنوری کے اٹھ جانے سے کہ (کذا) ہم اس وقت تاب تحریر اور طاقت تقریر نہیں ہے۔ ہائے ہائے کیسا شخص مر گیا۔"

"مختصر سوانح عمری حضرت دبیر مغفور: ....

میرزا سلامت علی .... دبیر کہن مرثیہ گوئی میں .... لاجواب تھے، تمام ہندوستان میں آفتاب تھے۔ سوا اس کے عابد شب زندہ دار تھے اور حاتم روزگار۔ پندرہ سولہ برس کا سن تھا کہ شوق مافوق سلام اور مرثیہ گوئی کا ہوا اور اصلاح .... میاں دلگیر شاعر بے نظیر سے لی، بعد ازاں مرثیہ گوئی وغیرہ میں نام عالی پیدا کیا۔ میاں دلگیر صاحب ایسا شاگرد پاکر خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ سوا ان کے اور کسی کو دل لگا کر نہ بتاتے تھے۔ رفتہ رفتہ ایسا نام پیدا کیا کہ سرکاروں میں پہنچے۔ نواب اصغر علی خاں جنت آشیاں ... والد ... نواب ممتاز الدولہ بہادر کے ملازم ہوئے ..... اور وہی وجہ اور قدامت ہے کہ نواب ممتاز الدولہ بہادر آج تک مانتے اور اپنا ملازم قدیم جانتے تھے، بلکہ .. تعظیم فرماتے تھے اور اپنے برابر بٹھاتے تھے اور بھی سرکاروں میں ان کی عظمت و رفعت ہونے لگی، اور مہاراجا میو رام اور کمبوہ باشان شکوہ (کذا) ان کو ... بہ دل و جان مانتے تھے۔ بادشاہان ... اودھ نے ان کی نہایت قدردانی کی نصیر الدین حیدر ... سے تا ... واجد علی شاہ ... سب نے مہربانی کی، چنانچہ ۱۲۹۱ھ میں مرزا صاحب لکھنؤ تشریف لے گئے، واجد علی شاہ کی خدمت میں عرضی داشت بھیجی اور یہ شعر بادشاہ نے دست خط فرمایا:

"گر بر سر چشم من بیائی ... بر قلب نہم کہ کیمیائی"

جب مرزا صاحب پہنچے جس مکان میں تھے اس کے دوسرے درجے تک ... واجد علی شاہ آئے اور پیشوائی کر کے لے گئے اور اس قدر تعظیم و تکریم فرمائی کہ جیسے کوئی برابر والے کی عزت و توقیر کرتا ہے۔ اپنے مرثیہ ... میں شاہ اودھ نے بہت سے بند ان کی تعریف کے پڑھے، چنانچہ یہ مصرع ارشادات حضرت سے ہے۔

"میں بچپنے سے عاشق نظم دبیر ہوں"

اس وقت مرزا صاحب نے کھڑے ہو کر یہ مصرع پڑھا:

"تعظیم کلام کو دبیر اٹھا ہے" شاہ اودھ نے فرمایا کہ آپ بیٹھ جائیں، اور بعد خاطر داری بے شمار ... پانچ سو روپے بطور دعوت عطا فرمائے، در مثل سال گزشتہ امسال بھی عظیم آباد سے مرزا صاحب نے عرضی بھیجی تھی جس میں چھ پانچ سو روپے ... عطا فرمائے۔

بہتر سال کا سن تھا۔ طاقت جواب دے چکی تھی، امسال عظیم آباد میں تشریف لے گئے اور نوبتیں تاریخ شائقین و سامعین بہت جمع تھے، مرثیہ طولانی بہت زور شور سے پڑھا، اس وقت سے اختلاج قلب شروع ہوا۔ ریل پر اپنے گھر آئے۔ دس دن تک نہایت علیل رہے۔ ۲۵ محرم کو رونق افزائے دار البقا ہوئے۔ گروہ مومنین خواص و عوام جنازے کے ہمراہ تھا، گریہ و بکا سے سب کا حال تباہ تھا۔ نواب ممتاز الدولہ بہادر نے شریک سوم ہو کر عزت افزائی فرمائی۔ مرزا اوج نے قریب دس بارہ رباعیوں کے حسب حال اپنے اور نعت پیمبر و بزرگوار پڑھیں۔ کہرام پڑ گیا عجائب مضامین حالی تھے۔ گویا مرزا دبیر پڑھ رہے تھے۔ تمام شہر کو ان کی مرثیہ گوئی میں جو شہرہ تھا دفع اور رفع ہو گیا۔ ہر صغیر و کبیر کی زبان پر تھا کہ اولاد سرلا بیٹھ نواب ممتاز الدولہ بہادر نے مرزا اوج کو گلے لگایا اور کل طلب فرمایا ہے۔ یقین صادق ہے کہ خلعت عطا فرمائیں گے مرزا دبیر کچھ فقط لکھنؤ میں نامور نہ تھے۔ حیدرآباد، عظیم آباد، سندھ بلکہ تمامی ہندوستان میں حتیٰ کہ کربلا معلیٰ تک میں مشہور تھے۔ اب یہی دعا ہے کہ خدا مرزا اوج کو سلامت رکھے۔"

"نوٹ: لکھنؤ میں ایک نامی گرامی شاعر مسمی

منور علی شعلہ داں تشریف لائے ہوئے ہیں۔ ذوق کے شاگرد رشید اور متوطن گنگوہ کے ہیں، آپ ہی کی وجہ سے ایک صحبت خاص مشاعرے کی جناب منشی مظفر علی خان بہادر* کے مکان پر دونوں کے اہتمام سے دریں ولا منعقد ہوئی تھی۔ ایک مدت سے آپ کا مطبع اودھ اخبار میں چھپا ہے اور دیوان عن قریب چھپے گا، چونکہ اسی عرصے میں مرزا دبیر نے انتقال فرمایا ہیں حضرت شعلہ داں نے ایک نہایت عمدہ قطعۂ تاریخ کہہ کر بھیجا جس کو ہم درج اخبار کرتے ہیں وھو ھذا

دبیر مغفور چو رفت از جہان
سخن شد بہ پوش ماتم تمام
مراثیہ خود فرا خلقند
فصاحت، بلاغت، طلاقت کلام
مختصر تاریخ عمری مرزا دبیر کی لکھی گئی تھی، اس میں ایک غلطی ہو گئی کہ بجائے ضمیر کے شاگرد دل گیر** کا لکھا ہے اور کچھ حال اور بھی باقی رہ گیا تھا، وہ یہ ہے کہ مرزا صاحب کو ایک بڑا توسل سرکار ملکۂ زمانیہ اور نواب سلطان عالیہ دختر نواب ملکۂ زمانیہ سے بھی تھا۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں روپے کا مالک انھوں نے دوسرکاروں نے دیا تھا، اور آج تک منتظم الدولہ بہادر مشکوک فرماتے ہیں۔ جب مرزا صاحب کے انتقال کا وقت آیا، پانچ بجے صبح کو نماز پڑھی اور حال ابتر ہونے لگا، اس وقت میاں اوج نے پوچھا کہ مجھ کو کس کے سپرد کیا، فرمایا تمھیں خدا کے سپرد اور انتقال کیا۔ ازبس کہ بہ روز سوم حال طبیعت راوی میاں اوج صاحب کا بہ خوبی دریافت

ہو گیا کہ اکثر رباعیات تصنیف فرما کر پڑھیں اب وہ رباعیاں بھی درج اخبار کرتے ہیں۔

ناکام کو کامیاب کر دیتا ہے
وہ غیب سے فتح یاب کر دیتا ہے
کافی ہے اُسی کی مہربانی اے اوج
جو ذرّے کو آفتاب کر دیتا ہے

کیوں خواب میں زندگی بسر کرتا ہے
کس فکر میں شام کو سحر کرتا ہے
طالع ہوئی صبح بج گیا طبل رحیل
بیدار ہو کارواں سفر کرتا ہے

بے زحمت و بے گزند تجھ کو دیکھوں
فردوس میں سربلند تجھ کو دیکھوں
اے دوست یہ آرزو فقط باقی ہے
آنکھیں ہو جائیں بند تجھ کو دیکھوں

رو رو کے بجا ہے دیں اگر دم اپنا
تھا سلخ کو عزۂ محرم اپنا
ان کا ماتم تو کیا کریں گے اے اوج
ہاں آج سے ہم کریں گے غم اپنا

شادی کو ملال سے بدل کر اٹھنا
اسپند کی شکل غم سے جل کر اٹھنا
عبرت کی جگہ ہے رحلت اہل کمال
منصف ہے تو دونوں ہاتھ مل کر اٹھنا

---

* مراد از اسیر اسیر کے بیٹے حکیم اور افضل شاعر تھے۔
** مگر قطعۂ لطافت میں شاگرد دلگیر، ضمیر، لطافت کے والد امانت دلگیر کے شاگرد تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ دبیر کی شاگردی دلگیر کی کیا حقیقت ہے۔ (قاضی عبدالودود)

[illegible] نہ رہا
[illegible] قدر شناس اہلِ جوہر نہ رہا
روشن ہے کلام کی بقا سے اے اوج
آئینہ رہا مگر سکندر نہ رہا

دل کو دنیا سے ہیں اٹھانے والے
اس شمع کو مرگ ہیں بجھانے والے
ہم بھی آتے ہیں روک مرکب اپنا
اے غمکدۂ جہاں سے جانے والے

ہر نقطہ بہ شکلِ غم ہوتا ہے
ہر دائرہ بن کے چشمِ نم روتا ہے
سطریں کاغذ کی صف پہ ہیں سوگ نشیں
ماتم میں دبیر کے قلم روتا ہے

شب کو صحبت سے بے ملال اٹھے ہیں
کاندھوں پہ سحر کو خستہ حال اٹھے ہیں
آ ہیں کہتی ہیں بزم میں ہو کے بلند
کیا کیا دنیا سے باکمال اٹھے ہیں

شعلہ سینے سے ہر زماں اٹھتا ہے
نالۂ خوں بار خوں فشاں اٹھتا ہے
اے آتشِ غم بس اب کلیجے کو نہ پھونک
مجلس بے چین ہے دھواں اٹھتا ہے

ایک قطعۂ تاریخ مرزا تقی مرحوم کے ایک عزیز نے نہایت عمدہ تحریر فرمایا ہے جس کی تمام شہر میں تعریف ہے اس کو ہم آئندہ چھاپیں گے۔

۱۹/۳ عبد العلی آسی مدراسی کا قطعہ (آسی نے دبیر کے قطعۂ تاریخ وفات انیس پر جو اعتراضات کئے تھے

آسی کا جواب بھی اس اخبار میں دیا تھا:۔

اے وائے بے نظیر نمانده دبیر نیز
ہم از پئے انیس شده انتقال او
صد حیف و صد دریغ و صد افسوس صد الم
ناخن ز تست بر رگ دلہا ملال او
بے او کمال مرثیہ گو نیست در زوال
بود آبروے نظم ز حسنِ مقال او
گر پیر چرخ چرخ زند صد ہزار سال
دوری نمائم مثال نیارد مثال او
متنِ قضائلش نبود زیر بار شرح
چوں مہر روشنست بعالم کمال او
چوں از غم شہادت سبطین ذوق داشت
ماہ محرم آمده آخر مآل او
پرسیدم از دبیر فلک حال رحلتش
پیوستہ آں بہ رحمت حق گفت سال او

"تاریخ وفات۔ از طبع رسا ز فکر آسمان پیما سید ہدایت اللہ خاں صاحب ... ہذا اللہ منجم یکتا نبیرۂ نواب مخیر الدولہ بہادر سید الممالک سید ماشاء اللہ خاں بہادر اسد جنگ عزیز مرزا صاحب مغفور:۔

داد ریغا از فضائے آسماں درہم شکست
رنگِ بزمِ ماتمِ آلِ پیمبر بے دبیر
حیف آں شیرازہ بندِ مجمعِ احبابِ فن
دفترِ مجموعۂ ماتم شد ابتر بے دبیر
مرگِ خلاقِ مضامین انتقالِ شاعریست
جانِ ہر مضمون تو گردید مضطر بے دبیر
بستہ باب میدۂ فیاضیِ منتی قدر
خاک بر سر می فشاند ہر سخنور بے دبیر
ماہ چوں کافور شد دل سرد از صبحِ وصال
آتشے در سینہ دارد مہرِ انور بے دبیر

چاک جیب صبح شد از پنجۂ خورشید غم
شب سیہ معجز زماتم کرد بر سر بے دبیر

بر فلک کرد بیاں نالاں دمردم بر زمیں
گشت برپا در دو عالم شور محشر بے دبیر

صفحۂ چرخ از سواد ماتمش از بس سیاہ
نقطۂ غم در نظر آید ہر اختر بے دبیر

بس کہ بسم سوگواری عالمی را برگرفت
جامۂ نیلی فلک ہم کرد در بر بے دبیر

صورت بسمل تپاں اہل عزا در ماتم اند
ہر نفس در سینہا ضرب تپش بے دبیر

بس کہ در دل شعلۂ داغ غم او سر کشد
اشک در ہر چشم سوزد مثل اخگر بے دبیر

روز روشن تیرہ شد در دیدۂ اہل نظر
اے کہ شد مکسوف روے مہر انور بے دبیر

تشنۂ مدح شہ کرب و بلا بد تا نفات
می خورد تنہا علی کے آب کوثر بے دبیر

سال تاریخش چو جستم از فلک آمد ندا
سدرہ بے روح القدس بیند منبر بے دبیر

قطعۂ تاریخ ریختہ قلم منشی محمد مرزا جان صاحب محمود:

فلک کے یاد رہیں گے ہمیں یہ جور و ستم
کہ ایک رنج سے ہے رنج دوسرا توام
خوشی کسی کو ہو خاک اس سرائے فانی میں
نہیں ہے دم کا بھروسا یہاں خدا کی قسم
انیس کا مہ ذی قعدہ ہی سے صدمہ تھا
بلا اخیر محرم ذبیح کا ماتم
جو شاعری میں یہ بے مثل لاجواب تھے وہ
اسی سے ہو نہیں سکتا کسی کا وصف رقم
وہ اپنے رنگ میں یکتا، یہ اپنے طرز میں فرد
گھٹا بڑھا نہیں سکتا ہے ذرا بھی قلم
جہان ہو گیا اہل کمال سے خالی
کہ لکھنؤ میں ہوئے ہیں یہ حادثے پیہم
جو نصف نصف لکھیں پڑھ کے مصرع تاریخ
عیاں ہر ایک کو ہو جائیں دونوں سال اہم
عدد حساب میں دونوں سنوں کے پورے ہوں
نہ تعمیہ ہے نہ ہے تخرجا نہ بیش نہ کم
لکھی فلک کی شکایت میں اس طرح تاریخ
غم انیس میں ہے ہے زیادہ دبیر کا غم

یہ غم وہ ہے کہ جس کو غم روتا ہے
مجلس میں امام کا علم روتا ہے
لکھتا ہوں جو سال رحلت اُن کا محمود
محفل میں دبیر کو قلم روتا ہے
۱۲۹۲ھ

قطعۂ تاریخ وفات، از طبع عالی سید حسن صاحب لطافت خلف اکبر، امانت:

صائب وقت انوری عصر سحبان جہاں
وعبل دوران و حسان زماں مرزا دبیر
صاحب عز و شرف، تاج آل مصطفیٰ
تھے فرزند مرتبہ روح القدس کے بمصیر
مرد میدان سخاوت، مرثیہ گوئے حسین
زاہد و عابد، محب خاص شاہ قلعہ گیر
سمت ملک جاودان اس دار فانی سے گئے
داغ بر دل خاک بر سر غم سے ہیں بر نادپیر
روز سہ شنبہ تھا اور صبح، محرم وقت صبح
ماتم شبیہ ہوئے یہ ماہ غم کے ساتھ اخیر
کربلا کا ذکر تھا، رونے رلانے سے غرض
خاک پاک کا لبدا اشک عزا سے تھی خمیر

وہ جو دبیر تھا جب تھا وجد اور جوش و خروش
تھے جام اس دور میں مست سے جم غفلت
مجلسیں سنسان ہیں ویران ہیں ماتم سرا
ہائے وہ گریہ نہ وہ شہری نہ وہ جم غفیر
ہر طرح اللہ نے اُن کو کیا تھا اہل دل
تھے رجوع قلب سے شاگرد و دلگیر و ضمیر
صبح دم جنت میں پہنچی روح مانند نسیم
قصر گلزار جنان میں ہو گئے زیب سریر
واقعہ یہ سن کے فکر سال جب مجھ کو ہوئی
آئی ہاتف کی صدا یہ مادہ ہے بے نظیر
ہاں الم سے سر اُٹھا تاریخ لکھ ہے تحریر
باغ بے بلبل ہے ہندوستان لطافت بے دبیر

۱۲۹۲ھ

قطعہ از منشی سید باقر علی اصغری، حیرت صاحب دیوان :-

در بزم لب لعل چو بگشود دبیر
جز مدحت شہ زباں نہ فرمود دبیر
حقا خضر سخنوری بود بدہر
میدان وسیع مدح پیمود دبیر
روشن کن مجلس عزائے زہرا
در باغ جنان چو رفت زا بود دبیر
این مصرع زباں شمع می خواند بہ بزم
مصباح شبستان علی بود دبیر

دیگر تاریخ از طبع رسا مؤرخ یکتا منشی محمد خدا علی فارغ مرادآبادی

"گئے اس دار الانشا سے دبیر نہ درس ہے ہے"

۱۲۹۲ھ

"مرزا دبیر سحر بیاں مر گئے افسوس"

۱۲۸۱ فصلی بنگلہ

انتیسویں کو ماہ محرم کی چرخ نے
کیا لکھنؤ میں فتنۂ ماتم بپا کیا
یعنی کہ نقش ہستی مرزا دبیر کو
حرف غلط کی طرح سے بالکل مٹا دیا
فارغ نے پوچھا دل سے کہ ہے کوئی اس کا مثل
تو اُس نے یہ جواب اسے برمحل دیا
حق تو یہ ہے کہ آپ ہی اپنا تھا وہ نظیر
ہاں منہ بھی مدعی کا کسی نے نہیں کیا
لیکن ہمارا قول یہی ہے کہ بالیقین
طے ہو گیا دبیر محقق پہ مرثیہ

۱۲۹۲ھ

منظور ہو تو مصرع تاریخ یوں بھی ہے
طے ہو چکا دبیر محقق پہ مرثیہ

۱۲۹۲ھ

مرزا دبیر مر گئے بیہات ناگہاں
دبیر کیا گیا مجلس سے مرثیہ ہی گیا

۱۲۸۲ فصلی

مومنو باعث گریہ نہ رہا اب تم کو
سینہ کوبی کے عوض بس جانکاہی
سال تاریخ سنو فارغ خستہ تن سے
مرثیہ ہی گیا ہم پائے دبیر رازی

۱۲۹۲ھ

"دبیر عطارد منش حیف شد"
"خواند آسماں دبیر سطر اجل"

۱۲۹۲ھ

جستم بہ فن مرثیہ گوئی نہ یافتم
جز ذات از سہیم و عدیل و دگر نظیر
تاریخ و نام نامی اُو نیز گوش کن
افسوس روح زادہ سلامت علی دبیر

شد دبیر پاک ذات از دار الانشائے وفا
سنہ ۱۲۹۲ھ

شد دبیر پاک بیں از دار الانشائے الم
سنہ ۱۲۹۲ فصلی

دبیر فدوی آل عبا سوئے فردوس
گرفتہ فقد زاں شد زاں بے پاریس

چو خواہی مادہ سال مرگ اے فارغ
بگو دبیر عطارد رقم بمرد افسوس
سنہ ۱۲۹۲ھ

لب بکا سے کہیں کس طرح نہ سال وفات
دبیر کیا گیا عالم سے مرثیہ ہی گیا
سنہ ۱۲۹۲ھ

چند تاریخی مادے : "ہے ہے دبیر مرثیہ گو مر گئے سنہ ۱۲۹۲ھ" "پورا کیا دبیر نے وادی مرثیہ سنہ ۱۲۹۲ھ" "جلوۂ مرثیہ تمام ہوا سنہ ۱۲۹۲ھ" "ذاکر سیاروین بودہ دبیر سنہ ۱۲۹۲" "روح ملک مرثیہ بودہ دبیر سنہ ۱۲۹۲ھ" "انجمن افروز مرثیہ گویاں بود سنہ ۱۲۹۲ھ" "بود اے دل دبیر چرخ دبیر سنہ ۱۲۹۲ھ"

"تاریخ ۲۳ صفر کو مرزا دبیر کا چہلم ہوا۔ مجلس میں صدہا رئیس اور شاہزادے اور امیر و امراء جمع تھے۔ مرزا دبیر نے اول رباعیات و تصنیف پڑھیں۔ تمام محفل میں وجد کا عالم تھا۔ بعدہٗ قطعۂ تاریخ وفات پڑھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ بعینہٖ مرزا صاحب پڑھ رہے ہیں اس کے بعد حضرت امام زین العابدین کے دربار میں تشریف لے جانے اور حاکم کے انصاف نہ کرنے کا حال پڑھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ بعینہٖ مرزا صاحب پڑھ رہے ہیں۔ اس وقت گویا قیامت برپا ہو گئی تھی۔ آخر تک مرثیہ نہ پڑھ سکے

خاک بر سر کن عبا در ماتم سلطان نظم
حیف شد برباد انجم بلاغت بے دبیر

نیست آں بسم اللہ دیباچۂ معنی دفتر
ہست اکنوں اثر اجر ملائے طلاقت بے دبیر

بنگر اندر بوستاں بر سرو نخل ماتم است
در چمن نرگس سراپا چشم حیرت بے دبیر

غیر ممکن طالب دیدار را شام بسحر
اندریں فرقت سرا یک لحظہ راحت بے دبیر

نے دل مہجور را آرام بے وصل حبیب
نے مذاق زندگانی را حلاوت بے دبیر

منشی چرخ بریں این مصرع تاریخ خواند
آسماں بے مہر و بیہم فصاحت بے دبیر
سنہ ۱۲۹۲ھ

قطعات تاریخ وفات مرزا دبیر ریختہ قلم افصح الفصحا ابلغ البلغا حضرت مولانا حکیم محمد لطف اللہ :۔

آں میرزا دبیر کہ در نظم مرثیہ
یکتائے عصر بود برنگ دُر صدف

چوں مہر در نشیمن خاور گرفت جا
بر شکل ماہ یافت بہ برج چناں شرف

بہر تاریخ مادہ تاریخ مژدہ دہ
فکرم دوید لطف چو ہر سو بہر طرف

شاہ نجف بگفت بہ طرز نشان دہی
شد جائے گیر دُرِ نجف در نگ نجف
سنہ ۱۲۹۲ھ

اُن کا ایک فارسی قطعہ مادۂ تاریخ : "دُرِ نجف در نجف شد جاگیر" سنہ ۱۲۹۲ھ

تاریخ کے کئی قطعے اور کئی مادہائے تاریخ اس شمارے میں بھی ہیں جن میں سے بعض مادے یہ ہیں :۔

"منبر ہے بے دبیر کے ماتم کا ڈھیر آہ" سنہ ۱۲۹۲ھ
"مرگ دبیر سے ہوئی کہنہ قلم یتیم" ۱۲۸۲ فصلی
"باغ میں بلبل نہیں بستاں میں دبیر" ۱۲۹۲ھ

"نظم ہے بے ربط اور روشن بیانی ہے دبیر"
سنہ ۱۲۹۲ھ

اس شمارے میں سید عابد علی عابد و تعصب بہادر پور متعلق بہاں پور کا ایک قطعۂ تاریخ اور ایک مادۂ تاریخ اور محمد حسین فائز بنارسی کا قطعۂ تاریخ بھی ہے فائز :-

زہد و ورع و اتقا و خلق و فیض و علم و نظم
از غم بے وارثی گشتند مضطر بے دبیر
از فراقش ہست دل صد پارہ ہر تسبیح را
برزمیں سجادہ با افتادہ یکسر بے دبیر
رفت خاقانی ز شرداں انوری از خاوراں
شد بملک شاعری دیوان و دفتر بے دبیر
طوس بے فردوسی و شیراز بے سعدی تباہ
گنجہ ویراں بے نظامی ہند ابتر بے دبیر
مصرع تاریخ رحلت فائز محزوں نوشت
اوج گردوں بے عطارد فوق منبر بے دبیر
سنہ ۱۲۹۲ھ

۲۸/۴ تاریخ ہفدہم ماہ حال مجلس مولود شریف داروغہ میرزا امجد علی صاحب کے یہاں ہوئی اول داروغہ صاحب نے مولود شریف تصنیف کے ۱۲ بند پڑھے مصرعۂ مولود یہ تھا :-

"دنیا میں کس کے نور کا یارب ظہور ہے"

اور بعد اس کے خلف الرشید مرزا دبیر نے کہ ایک مولود بڑی دھوم دھام کا کہا تھا اور جس کا تمام لکھنؤ میں شہرہ تھا، پڑھا، مجلس میں صدہا رئیس اور امیر اور شہزادے جمع تھے۔ بند اول :-

گردش ہے آج ساغر صہبائے نور کی
نہریں چھلک رہی ہیں شراب طہور کی
عنبر فشاں شمیم ہے گیسوئے حور کی

جھونکے نسیم کے ہیں کہ موجیں سرور کی
روشن زمیں ہے نور رسالتمآب سے
ذرے لا رہے ہیں نظر آفتاب سے

جناب میاں عشق صاحب اور جناب مونس بھی تشریف فرما تھے نہایت تعریف فرمائی اور کل امرا، شہزادگان (کذا) اور رئیسوں کی زبان پر کلمۂ تعریف جاری تھا اور اکثر ذی کمال مثل منشی ظہیر الدین[۳۰] کہ فن شاعری میں یکتا ہیں اور خواجہ بادشاہ صاحب پسر خواجہ وزیر حکیم صاحب وغیرہ صاحبزادگان حضرت اسیر و سید حسن صاحب کے فرزند بلاغت و فصاحت کہ یہ سب شاعر بے نظیر ہیں مداح تھے اور فرماتے تھے کہ کیوں نہ ہو کس باپ کا بیٹا ہے۔ عجب طرح کا مولود نہ تھا کہ ایسا مولود نہ ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ صفائی بندش اور مضامین بھی نہایت عمدہ تھے اور ہر شخص کا قول تھا کہ ان کے کلام میں دو رنگ ہیں۔ مرزا دبیر اور میر انشاء اللہ خاں[۳۱] کا۔ خدا نظر بد سے بچائے۔"

۱۶/۴ قطعۂ شیخ فدا حسین فدا خوش نویس مطبع شاگرد پیارے صاحب رشید۔

گئے جہاں سے افسوس کیسے حق آگاہ
ہر ایک شخص کا ہے حال جن کے غم میں تباہ
فدا یہ میں نے سنی منشی فلک کی نا!
غم دبیر سے پیدا ہیں اشک کلک سیاہ

حواشی

[۱] ۱۰ مارچ ۱۸۷۵ء = اصفر ۱۲۹۲ھ روز چہارشنبہ

[۲] یکشنبہ ۷ مارچ کے اودھ اخبار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تاریخ ۲۸ محرم کے مطابق تھی اس لئے مشکل کو تیسویں تھی، انتیسویں نہیں۔

[۳] ناصر لکھتا ہے۔ "امرا میں صاحب اعزاز فریدون جاہ

ممتاز الدولہ مدبر الملک مرزا حسین علی خاں بہادر تہور جنگ تخلص ممتاز خلف الصدق ناصر الدولہ نواب اصغر علی خاں ابن محمد علی شاہ بادشاہ۔ کلام اُن کا بہ واسطہ سحر برق کا منظورِ نظر۔ اگر اصغر علی خاں باپ کی زندگی ہی میں مر گئے ہوتے تو اودھ کے بادشاہ ہوتے اور ان کے بعد ممتاز الدولہ ان کے جانشین۔

۴ سوانحات سلاطین اودھ جلد ۱ صفحہ ۲۶۶ میں ہے کہ افتخار الدولہ میر ارام بہد غازی الدین حیدر میں دیوان رہے تھے۔ یہ مسلمان ہو گئے تھے اور کربلائے معلی میں "بعد مجاورت چند سال" ربیع الاول ۱۲۵۸ھ میں اُن کا انتقال ہوا تھا۔

۵ تاج الدین حسین خاں یا سبحان علی خاں سے مراد

۶ شرح نہج البلاغہ میں دبیر کا ترجمہ ثابت (غالباً مصنف حیات دبیر) سے لکھوایا گیا ہے۔ اس میں پورا شعر یوں ہے:۔

"بچپن سے ان کے دامِ سخن میں اسیر ہوں
میں کمسنی سے عاشقِ نظم و بیسر ہوں"
صفحہ ۱۵۷

۷ ولادت ۱۱ جمادی الاولیٰ ۱۲۱۸ھ خم خانہ

۸ و ۹ و ۱۰ و ۱۱ خنداں، حیرت، عابد، فدا کا ترجمہ ان تذکروں میں نہیں جو اس وقت سامنے ہیں۔

۱۲ منکہ زانیہ زوجہ نصیر الدین حیدر شاہ اودھ سلطانی عالیہ بیگم ان کی بیٹی ممتاز الدولہ کی زوجہ۔

۱۳ تقیس صریحاً غلط، دبیر چاہیئے۔

۱۴ صاحب دیوان انشاء اللہ خاں کے پڑپوتے اور صبح اللہ خاں انشا کے سوتیلے بھائی کے پوتے تھے۔ دبیر کے سسرالی رشتہ دار، ممکن ہے، خود ان سے بھی قرابت ہو

۱۵ مخیر الدولہ ہی سے صحیح معلوم ہوتا ہے، بعض نے مخبر الدولہ سے لکھا ہے، سید الممالک کی کوئی سند نہیں ملی۔ اسد جنگ کلیات انشاء کے ایک نسخہ میں ہے۔

۱۶ مجھے یاد نہیں کہ یہ قطعہ دیوان جلالہ میں ہے یا نہیں۔

۱۷ مرزا جان محمود شاگرد صبا سخن شعرا صفحہ ۱۲۱ محمود کے نکالے ہوئے مادے خم خانہ ۳ میں بھی ہیں۔

۱۸ میں نے یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی کہ مادوں سے سنین مطلوبہ نکلتے ہیں یا نہیں۔

۱۹ فارغ کے لئے آثار الشعراء دیکھئے۔

۲۰ فسوس اور افسوس ایک ہی ہیں۔

۲۱ "پے" یعنی "پہ"۔

۲۲ دواں؟

۲۳ لطف اللہ ایک مشہور عالم تھے، غالباً ذہبی۔

۲۴ عرش کی حیات تسلیم میں محمد حسن صفحہ ۵

۲۵ اودھ اخبار سے معلوم ہوتا ہے کہ تسخیر تخلص تھا۔ غزل میں اسیر اور مرثیے میں دبیر و مشیر کے شاگرد تھے۔ مشیر کی ایک مثنوی میں اُن کا ذکر ہے، اور کلام اودھ اخبار ۱۸۷۵ء میں موجود۔ ان کا شمار عمائد لکھنؤ میں تھا۔

۲۶ ظہیر بلگرامی۔

۲۷ سفیر تخلص

۲۸ سید آغا حسن صحیح نام امانت تخلص

۲۹ دبیر کی شادی انشاء کی نواسی سے ہوئی تھی۔

کچھ کام کی یہ آہ نہیں، واہ نہیں
ارشادِ خدا سے کوئی آگاہ نہیں
کثرت ہو کہ قلت ہو مجالس میں دبیر
ناحق ہے جو قربتاً الی اللہ نہیں

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی ایم۔اے
پی ایچ۔ ڈی

(نگار زبان حیات "شہید اعظم نمبر" ۱۳۹۱ھ سے
نقل کیا گیا)

ابواب المصائب

شمالی ہندوستان میں اُردو نثر کا آغاز فضلی کی وہ مجلس بدا کربلا کتھا سے ہوتا ہے۔ لیکن فضلی کی زبان کو ہم محض تبرکاً ہی اُردو کہہ سکتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ فضلی کی اُردو دراصل وہ فارسی ہے جس میں کہیں کہیں ہندی کا پیوند لگا کر اُردو کا لقب عطا کر دیا گیا ہے۔ زبان کی رنگینی اور بیان کا اغلاق قدم قدم پر یہ اشارہ کرتا ہے کہ وہ مجلس کی زبان دراصل فارسی ہے جسے زبردستی اُردو کا قالب دے دیا گیا ہے۔ ایسی حالت میں چاہیئے نثر اُردو کی تاریخ میں وہ مجلس کو کتنی ہی اہمیت کیوں نہ حاصل ہو لیکن موجودہ حالت اور کیفیت کو پیش نظر رکھنے کے بعد وہ مجلس کا اُردو سے رشتہ قائم کرنا ذرا دشوار معلوم ہوتا ہے۔

وہ مجلس کے بعد جو دوسری تصنیف ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ میر محمد حسین تحسین کی نوطرز مرصع ہے۔ لیکن اس زبان کی رنگینی کے ساتھ ہی فارسی اسلوب نگارش کی اس حد تک پابندی کی گئی ہے کہ اُسے بھی اُردو اور فارسی کی درمیانی کڑی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ نوطرز مرصع کی زبان ایسی ہے کہ میر امن کو اسے باغ و بہار کی شکل میں اُردو کا قالب دینا پڑا۔

مذکورہ بالا دونوں کتابوں کو محض اردو نثر کی تاریخ تکمیل کے لئے یا یہ ثابت کرنے کے لئے کہ دور محمد شاہی میں اردو نثر وجود میں آچکی تھی، یاد کیا جاتا ہے ورنہ نہ تو اُن کی زبان یا انداز بیان وہ ہے جسے موجودہ اُردو سے کوئی مطابقت ہو اور نہ اُن کے نتیجہ میں مستقبل کے لکھنے والوں کو کوئی ایسی رہنمائی نصیب ہوئی جس کے نتیجے میں اُردو میں نثری تصانیف وجود میں آسکیں۔ اردو میں نثر نگاری کا حقیقی آغاز انیسویں صدی کے آغاز سے کلکتے میں ہوا۔ ۱۸۰۱ء میں میر امن نے باغ و بہار لکھی۔ ۱۸۰۲ء میں حیدری نے آرائش محفل لکھی اور فورٹ ولیم کالج میں دس بارہ سال میں کئی کتابیں لکھی گئیں۔ شمالی ہند میں اب بھی فارسی کا اثر تھا کہ ادبی حلقوں نے فورٹ ولیم کالج میں لکھی جانے والی کتابوں کو کوئی اہمیت نہیں دی اور ان کتابوں کے اسلوب نگارش کو اُردو کا ادبی اسلوب تسلیم نہیں کیا گیا۔ شمالی ہند میں اُردو نظم ضرور ترقی کرتی رہی لیکن نثر کو درخور اعتنا نہیں تصور کیا گیا۔ نثر میں کتاب لکھنا اور کتابت خط لکھنا بھی خلاف شان سمجھا جاتا تھا۔ یہ تھے وہ حالات جن میں رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب لکھ کے فارسی کا طلسم توڑا اور یہ ثابت کیا کہ اُردو نثر بھی اُن تمام مرصع کاریوں کی متحمل ہو سکتی ہے جن پر ایرانی نثر نگاروں کو ناز تھا۔ سرور کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے دلوں پر چڑھے ہوئے قفل کھولے، اُردو نثر کی جانب سے جو تعصبات

دماغوں میں مرچہ دبے ہوئے تھے انھیں دور کیا اور اپنے انداز نگارش، حسن بیان اور دلکشی اور تاثیر کے سہارے یہ منوا لیا کہ اردو نثر بھی فارسی نثر کی ہم پلہ بننے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔

سرور کے اس اجتہاد فکر کی ضرور داد دینی پڑتی ہے کہ انھوں نے جس وقت شمالی ہند میں اردو نثر نگاری کی بنیاد ڈالی اس وقت ان کے سامنے کوئی ایسی کتاب نہیں تھی۔ جو ان کے لئے نمونہ کا کام دے سکتی۔ فورٹ ولیم کالج میں لکھی جانے والی کتابیں ضرور ان کے سامنے تھیں لیکن ان میں باغ و بہار کو چھوڑ کے باقی محض ادنیٰ درجہ کی ایسی درسی کتابوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ جو غیر ملکیوں کو عام فہم اور سہل ہندوستانی سکھانے کے لئے لکھی گئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ سرور کے لئے ان سے متاثر ہونے کا کوئی سوال ہی نہ تھا چنانچہ انھوں نے اپنے لئے ایک ایسی طرز اختیار کی جس کے وہ خود ہی موجد تھے اور خود ہی خاتم بھی۔ یہ صحیح ہے کہ بعض حضرات نے اسی انداز نگارش کی نقل کرنے کی کوشش کی ہے لیکن کوئی اس میں کامیاب نہیں ہوا۔ یہ طرز دراصل سرور سے شروع ہو کر انہی پر ختم ہو گئی۔

سرور کی فسانۂ عجائب شمالی ہند میں اردو کی پہلی تصنیف ہے۔ یہ کتاب ۱۲۴۰ھ میں نصیر الدین حیدر فرماں روائے اودھ کے دور حکومت میں لکھی گئی۔ چنانچہ مقدمہ میں شاہ اودھ کی شان میں ایک نظم ہے جس کا مطلع ؎

تا ابد تم رہنے فرماں روائے لکھنؤ
یہ نصیر الدین حیدر بادشاہے لکھنؤ

سرور کی فسانۂ عجائب کے بعد فقیر محمد خاں گویا کی بستان حکمت کو اردو کی دوسری نثری تصنیف قرار دیا جاتا ہے چنانچہ رام بابو سکسینہ اور دوسرے تمام تاریخ نگاروں کی بھی یہی رائے ہے کہ فسانۂ عجائب کے بعد بستان حکمت دوسری تصنیف ہے جو ۱۲۵۱ھ میں تیار ہوئی۔

یہاں ہم ایسی اردو تصنیف کا تعارف کرانا چاہتے ہیں جو بستان حکمت سے چھ سال پہلے ۱۲۴۵ھ میں تیار ہوئی لیکن چھپ جانے کے باوجود ابھی تک ادبی دنیا اس سے ناواقف ہے، اس کتاب کا نام "ابواب المصائب" ہے۔

ابواب المصائب مشہور عالم مرثیہ گو مرزا سلامت علی دبیر کی نثری تصنیف ہے جو ۱۶۸ صفحات پر مشتمل ہے کتاب کے خاتمے پر خود مرزا صاحب کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ موجود ہے جس کے آخری تین شعر ملاحظہ ہوں۔

غور کردم بسال تالیفش۔
کہ از آئین فرقہ شعر است
ناگہاں فوج فوج آمدہ عقل
از چپ و راست دادہ مژدہ راست
گفت با من کہ سال تاریخش
مصحف طاق چشم اہل فراست
۱۲۴۵ھ

ابواب المصائب بھی نصیر الدین حیدر کے دور حکومت میں لکھی گئی ہے چنانچہ دیباچہ میں یہ عبارت موجود ہے:۔

"ارباب عقل کو معلوم ہو کہ طریقہ ارباب تصنیف اور اصحاب تالیف کا یہ ہے کہ جب کوئی کتاب تازہ تصنیف کرتے ہیں تو تعریف بادشاہ عصر کی منجملہ واجبات جانتے ہیں علی الخصوص بادشاہ اس عصر کا کہ جمیع خوبیوں سے آراستہ اور نیکیوں سے پیراستہ ہے ؎

وہ کون شاہ خلائق پناہ ظل اللہ
بنام نائب مہدی دین سلیماں جاہ
سخی و عادل و فیاض و مالک اقلیم
کریم ابن کریم و رحیم ابن رحیم

ہے سو یہ سمجھتا ہے یوں سوال فقیر
کہ بعد ختم نبی یوسف پہ خواب کی تعبیر
عطا کرا یا اجداد اس بادشاہ سلیماں جاہ
دارا دربان سکندر ایوان یوسف عہد
نوشیروان عصر ابوالنصر قطب الدین بادشاہ
غازی نصیر الدین حیدر خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ
کے بانی خیر و حسنات تھے چنانچہ نہر آصفی بنائی
ہوئی جناب نواب آصف الدولہ مرحوم
قریب بخت اشرف کے مثل چشمۂ کوثر جاری
ہے از بس تبلیل ہر ایک کی ذات بابرکات
سے بنیاد فیض یادگار آفاق ہے۔ الحمد للہ
کہ ہمارے بادشاہ عصر خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ
کو جناب احدیت نے فخر سلاطین سلف اور
رشک بادشاہان عصر پیدا کیا ہے کہ ازل
سے آج تک کسی نے بنائے تعزیہ داری
تا اربعین نہ کی تھی الا اس بادشاہ خلائق پناہ
نے یہ رسم حسنات مقرر فرمائی اور اس طرح
سے ہزارہا امور حسنات اور آثار برکات ذات
مجمع حسنات سے بنیاد پذیر ہوئے اور ہوتے
ہیں ؎

حق تعالیٰ اسے رکھے آباد
یہ محمدؐ و آل الامجاد
مہدی دیں ہمیشہ یاور ہیں
حکم ہیں اس کے ہفت کشور ہیں

مقدمہ کی مذکورہ بالا عبارت اس کا ثبوت ہے کہ
ایواب المصائب اسی دور میں لکھی گئی جس دور میں
فسانۂ عجائب تصنیف کی گئی تھی۔ دونوں کتابیں نصیر الدین
حیدر کے عہد میں لکھی گئی ہیں۔ البتہ فسانۂ عجائب کو تقدم
حاصل ہے۔

مرزا دبیر صاحب نے یہ کتاب اُس وقت لکھی تھی جب شاعر
کی حیثیت سے وہ بالکل نو مشق تھے اور محض شاگرد ضمیر
کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے۔ وہ محض چھوٹے چھوٹے
مرثیے کہتے تھے اور میر ضمیر کی پیش خوانی کیا کرتے تھے۔ تعجب
ہے کہ اُس زمانہ میں اُنھیں نثر میں کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔
اسے محض اُن کے اجتہاد فکر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں مزید قابل ذکر بات یہ ہے کہ ایواب المصائب
اُس وقت لکھی گئی جب خود میر ضمیر بھی اتنے بڑے شاعر نہیں
مانے جاتے تھے جتنے بڑے بعد میں ثابت ہوئے۔ میر ضمیر کو
بالاتفاق جدید مرثیے کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ مرثیہ میں تمہید
رخصت، آمد، سراپا، رجز، رزم، تلوار اور گھوڑے کی
تعریف، شہادت اور بین کی ترتیب میر ضمیر نے قائم کی اور
اس طرح وہ مرثیہ وجود میں لائے جس پر انیس اور دبیر کی
شہرت کا محل کھڑا ہوا اور خود میر ضمیر ایک بلند پایہ شاعر اور
مجدد فن تسلیم کئے گئے۔ یہ نیا مرثیہ ایواب المصائب کی تصنیف
کے بعد ۴۰ سال بعد وجود میں آیا چنانچہ میر ضمیر خود
فرماتے ہیں ؎

جس سال کہے ضعف یہ ہم شکل نبیؐ کے
سن بارہ سو انچاس تھے ہجری نبوی کے
آگے تو یہ انداز سخن تھے نہ کسی کے
اب سب یہ مقلد ہوئے اس طرز نئی کے
دنیا میں کہوں، سو میں کہوں یہ درد ہے میرا
اس طرز میں جو جو کہے شاگرد ہے میرا

گویا وہ مرثیہ جو ضمیر اور انیس اور دبیر کی شہرت کا سبب
بنا ۱۲۴۹ھ میں وجود میں آیا اور ایواب المصائب اس سے
چار سال قبل ۱۲۴۵ھ میں لکھی جا چکی تھی۔ جب اُن کا ایک
بلند پایہ مرثیہ گو تسلیم کیا جاتا تو ذکر خود مرثیہ گوئی کی وہ طرز
بھی وجود میں نہ آئی تھی جو آگے چل کر ان کی شہرت کی
اساس بنی۔

خالص ادبی نقطۂ نظر سے ابواب المصائب کی بڑی اہمیت ہے یہ کتاب اُس وقت لکھی گئی جب شمالی ہند کے مصنفین کے سامنے اُردو نثر کا ایک ہی نمونہ تھا اور وہ تھا فسانۂ عجائب کا اندازِ نگارش، ویسے بھی عربی اور فارسی کی اعلیٰ تعلیم کے نتیجے میں مقفیٰ و مسجع عبارتوں کا چلن عام تھا اس لئے مرزا دبیر بھی اگر مقفیٰ و مسجع عبارتیں لکھتے تو لکھ سکتے تھے۔ بلاشبہہ وہ اُن پر عبور رکھتے تھے لیکن اُنھوں نے سہل اور سادہ زبان میں اپنی تصنیف مکمل کر کے ایک بڑی جدت، تنوع اور اجتہادِ فکر کا مظاہرہ کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ وہ سُرور کی تقلید کے بجائے اپنی راہ خود متعین کرنا جانتے ہیں۔

ابواب المصائب کی زبان نہایت سہل، سادہ اور پُر تاثیر ہے اور خاص طور پر جہاں جہاں مصائب جنابِ سید الشہداؑ بیان کئے گئے ہیں وہاں اُس میں اتنی مرثیت پیدا کر دی گئی ہے کہ پڑھتے پڑھتے آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

ادب کی دنیا میں سہل نگاری اور سادہ نگاری کی ایجاد کا شرف مرزا غالبؔ کو عطا کیا جاتا ہے لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ مرزا غالبؔ نے اُردو نثر میں کوئی کتاب نہیں لکھی ہے۔ اُنھوں نے دوستوں کو خط لکھے تھے اس لئے نہیں لکھے تھے کہ اُنھیں کتابی شکل میں چھپوا کر اُردو نثر نگاری کی ایک راہ معین کرنی مقصود تھی۔ یہ تو محض ایک اتفاق کی بات ہے کہ اُن کے خطوط جمع کر کے کتابی شکل میں چھاپ دیئے گئے اور دنیا اُن کے حُسنِ نگارش، طرزِ ادا اور لطفِ بیان سے اتنی متاثر بلکہ مسحور ہو گئی کہ غالبؔ کو ایک شاعر کے ساتھ ہی ایک صاحبِ طرز نثر نگار بھی تسلیم کر لیا گیا اور لوگ یہ کہنے لگے کہ اُردو میں سلیس، شستہ، رواں اور سہل نثر کے آغاز کا سہرا غالبؔ کے سر ہے۔ ابواب المصائب کو سامنے رکھنے کے بعد میرے لئے اس دعویٰ کو تسلیم کرنا بہت مشکل ہے۔ بلاشبہہ غالبؔ کے خطوط سہل نگاری و سادہ نگاری کا ایک نادر نمونہ ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ غالبؔ نے ۱۸۵۰ء سے اُردو میں مراسلت شروع کی اور ابواب المصائب اس سے ۲۵ سال پہلے منصۂ شہود پر آ چکی تھی اور اس میں مرزا دبیرؔ نے وہی سہل اور شگفتہ زبان استعمال کی ہے جسے آج قبولِ عام کی سند حاصل ہے۔

بلا خوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے . . . . کہ اگر فسانۂ عجائب رنگین اسلوب نگارش اور مقفیٰ و مسجع عبارت کا اوّلین نمونہ ہے تو مرزا دبیر کی ابواب المصائب شمالی ہندوستان کی نثری تصانیف میں سہل اور سادہ طرزِ نگارش کا نقشِ اوّلیں ہے۔

ابواب المصائب کو دلچسپ اور پُر تاثیر بنانے کے لئے جگہ جگہ اشعار کا سہارا لیا گیا ہے اور اشعار ایسے موزوں ہیں کہ اصل عبارت کا جزو معلوم ہوتے ہیں۔ اشعار زیادہ تر مثنوی کے طرز میں ہیں لیکن کہیں کہیں قطعات و رباعیات سے کام لیا گیا ہے۔ جہاں اشعار میں زورِ بیان کی خاص طور پر نمود ہے بقیہ اشعار عام طور پر سادے اور بیانیہ ہیں۔

ابواب المصائب کئی حیثیتوں سے ایک اہم تصنیف ہے جس وقت ابواب المصائب لکھی گئی اُس وقت تک کوئی شیعہ عالم اُردو میں کتاب نہیں لکھتا تھا۔ جناب غفراں مآب مولانا دلدار علی صاحب نے "عماد الاسلام" اور "شہاب ثاقب" ضرور لکھی تھی جو مذہبِ شیعہ کی اہم تصانیف شمار کی جاتی ہیں لیکن یہ کتابیں اُردو میں نہیں تھیں جس وقت ابواب المصائب لکھی گئی اُس وقت سُلطان العلماء اور اُن کے برادرانِ محترم شیعوں کی مذہبی قیادت کر رہے تھے۔ ان حضرات کی بھی ساری تصانیف عربی و فارسی میں ہیں۔ دراصل شیعہ اربابِ علم اُردو میں کتاب لکھنا کسرِ شان تصوّر کرتے تھے۔ ایسی حالت میں مرزا دبیر صاحب نے اُردو میں ایک مذہبی تصنیف پیش کر کے واقعی بڑی علمی جرأت کا مظاہرہ کیا ہے اور ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ شمالی ہند میں ابواب المصائب

[illegible] کی کتاب ہے جو اُردو میں لکھی گئی۔

ابواب المصائب ایک طرح سے ذاکری کی کتاب ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعات بیان کئے گئے ہیں اور ان میں جگہ جگہ ربط دے کر حضرت سید الشہداء کے مصائب درج کئے گئے ہیں۔ اس طرح سے اسے مجالس میں خوانندگی کے قابل بنا دیا گیا ہے۔ آج ذاکری کی کتابیں عام طور پر ملتی ہیں اور مختلف ذاکرین کے مسودے چھپتے رہتے ہیں۔ ابواب المصائب کو ان سب کتابوں کا پیشرو کہا جا سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ فضلی کی وہ مجلس بھی ذاکری یا روضہ خوانی کی کتاب ہے لیکن وہ دراصل روضۃ الہند کا ترجمہ ہے۔ ابواب المصائب اس کے برعکس ایک باقاعدہ تصنیف ہے جو ذاکری کے قواعد پر مرتب کی گئی ہے اور اس اعتبار سے اُردو میں فنِ ذاکری کی پہلی کتاب کہی جا سکتی ہے۔

ابواب المصائب کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عہدِ نصیر الدین حیدر میں ذاکری کی طرز کیا تھی؟ نواب آصف الدولہ کے عہد سے جناب غفران مآب کی مساعی کے نتیجے میں لکھنؤ عزاداری کا مرکز بن چکا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس زمانے میں مجالس میں عام طور پر مرثیہ خوانی ہوتی تھی اور نثر میں خوانندگی کا رواج بہت کم تھا۔ جناب غفران مآب نے اپنے امام باڑے میں ذاکری کا سلسلہ شروع کیا تھا اور خود عاشور کے روز اپنے امام باڑے میں سہ پہر کو مجلس پڑھا کرتے تھے۔ اس رسم کو اُن کے صاحبزادگان نے بھی جاری رکھا تھا۔ مرزا دبیر صاحب غفران مآب کے جانشین جناب سلطان العلماء کے ہمعصر تھے اس لئے وہ ضرور جناب سلطان العلماء کی تقریریں سنتے ہوں گے اور اُن سے متاثر بھی ہوئے ہوں گے۔ اس لئے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ابواب المصائب میں ذاکری کی جو طرز ملتی ہے وہ وہی ہوگی جو اس دور میں رائج ہوگی۔ اگر یہ قیاس درست ہے تو ابواب المصائب کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے کہ ہمیں اس کتاب کی مدد سے فنِ ذاکری کے ابتدائی دور کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

ابواب المصائب میں جو انداز ذاکری ہمارے سامنے آتا ہے وہ "حدیث خوانی" اور "نثر خوانی" کا مرکب کہا جا سکتا ہے۔ ذاکری کے یہ دونوں فن اب ختم ہو چکے ہیں۔ ابواب المصائب اس حد تک "حدیث خوانی" کی کتاب کہی جا سکتی ہے کہ اس میں حضرت یوسف کا قصہ چلتا رہتا ہے اور جگہ جگہ ربط دے کر مصائب سید الشہداء بیان ہوتے جاتے ہیں۔ یہ بالکل "حدیث خوانی" والی قدیمی ذاکری ہے۔ لیکن اُسے اس اعتبار سے مکمل حدیث خوانی بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں جگہ جگہ اشعار چسپاں ہیں۔ اور نثر کا تکملہ نظم سے کیا جاتا ہے جو "نثر خوانی" کا دستور ہے۔ "نثر خوانی" اس طرزِ ذاکری کو کہتے ہیں جس میں نثری تقریر میں جا بجا نظم کا پیوند لگا ہوتا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کے زمانے میں "حدیث خوانی" اور "نثر خوانی" کی جداگانہ اصناف ایجاد نہیں ہوئی تھیں۔ ورنہ ابواب المصائب میں یہ دونوں طرز یک جا جمع نہ ہوتے۔ بعد میں یہ دونوں الگ الگ اصناف اُبھرے چنانچہ مرزا صاحب نے شاگرد اور اپنے دور کے ہندوستان کے سب سے بڑے ذاکر مولوی میر سید علی صاحب مرحوم کی مجالس علویہ میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خالص حدیث خوانی ہے۔ نثر خوانی مطلق نہیں ہے۔ لکھنؤ میں حدیث خوانی اور نثر خوانی کے فنون نے جو ترقی کی ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ لیکن جس وقت ابواب المصائب لکھی گئی ہے اُس وقت یہ دونوں فن ایک دوسرے سے ملے ہوتے تھے اور ہونا بھی چاہیئے تھا۔ اس لئے کہ یہ عزاداری اور ذاکری کا بالکل ابتدائی دور تھا۔ بعد میں عزاداری میں ترقی ہوئی تو ذاکری کی بھی نئی نئی طرزیں ایجاد ہوئیں اور انھیں میں

حدیث خوانی اور نثر خوانی بھی شامل ہیں۔

ابواب المصائب اس اعتبار سے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ یہ اُردو کے تفسیری ادب کے سلسلے میں شیعوں کی پہلی کاوش ہے۔ اس وقت تک کسی شیعہ عالم نے اُردو میں نہ قرآن پاک کا ترجمہ کیا تھا اور نہ تفسیر لکھی تھی۔ مرزا صاحب نے ابواب المصائب میں سورۂ یوسف کی تفسیر لکھی ہے اور اس اعتبار سے ابواب المصائب جہاں ذاکری کی کتاب ہے، وہیں تفسیر کی کتاب بھی کہی جا سکتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اُسے مکمل تفسیر تو نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن بہر حال تفسیر و ترجمۂ کلام پاک کے سلسلے میں اسے شیعوں کی پہلی کاوش ضرور کہا جا سکتا ہے۔ ابواب المصائب کی اشاعت کے بعد ہی شیعہ علماء اس جانب متوجہ ہوئے۔ چنانچہ پہلے تو امجد علی شاہ کے عہد حکومت میں مولانا سید علی صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہ نے ۱۲۶۳ھ میں قرآن پاک کا وہ نادر ترجمہ کیا جو اپنی مثال آپ کہا جا سکتا ہے۔ یہ ترجمہ ۲۰×۲۶ سائز کے ۹۶۰ صفحات پر شایع ہو چکا ہے اور اتنی سہل اُردو میں ہے جسے 'ہندوستانی' کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ تاج العلماء نے اپنے اُستاد مرزا دبیر کے تتبع میں سورۂ یوسف کی تفسیر بھی لکھی ہے جس میں قدیمت کی اصلی عبرانی عبارتوں سے بڑا فائدہ اُٹھایا ہے۔ غرض ابواب المصائب کئی حیثیتوں سے ایک تاریخی تصنیف ہے۔

احسان ناشناسی ہوگی اگر اس موقع پر یہ نہ عرض کر دوں کہ مجھے ابواب المصائب کا یہ نسخہ سالک مسلک اوج و دبیر حضرت استاذی سید سرفراز حسین خبیر اعلیٰ اللہ مقامہ نے عطا فرمایا تھا۔ نسخہ مطبوعہ ہے اور اسے میں نے مہاراشٹر کالج بمبئی کی لائبریری میں محفوظ کرا دیا ہے جہاں ذوق تحقیق رکھنے والے حضرات اس کا مطالعہ فرما سکتے ہیں۔

سلام

(جناب مرزا گوہر آغا گوہر لکھنوی نبیرۂ مرزا دبیر)

زہرا علیؑ نہ رحب و عنتر سے پوچھئے
گر پوچھنا ہے یہ در خیبر سے پوچھئے

کس طرح سوئے چین سے حیدر سے پوچھئے
یہ شام ہجر فرش پیمبر سے پوچھئے

یہ عمر کیا بتائے گا خندق کی جنگ میں
غربت امین دین کے ہاں پر سے پوچھئے

عرش علا پہ بھائی کو دیکھا کہاں کہاں
معراج میں نگاہ پیمبر سے پوچھئے

قوت کو حرملہ کی بتائے گی خود کماں
نازک کا توڑ گردن اصغر سے پوچھئے

دی اپنی جان کس طرح عین شباب میں
نیزے کا گھاؤ دیدہ سر نور سے پوچھئے

کیونکر کوئی بتائے بہتر کی جنگ کو
یہ معرکہ یزید کے لشکر سے پوچھئے

پائی رہائی ناز سے الفت میں شاہ کی
کس طرح چمکا حر کے مقدر سے پوچھئے

جو گر گیا تھا ماتم سر زینب میں آنکھ سے
قیمت کو اُس کی حشر میں گوہر سے پوچھئے

سبط محمد نقوی

خاندانی شاعری اور دبیر و انیس

وریب کہ مرزا دبیر مبرور ایک خانوادۂ شاعری کے مورث بھی ہوئے اور ایک دبستانِ شاعری کے بانی بھی۔ خود اُن کی چوتھی پشت میں آج تک شاعری اور مدح گستری کا سلسلہ باقی ہے اور اُن کا دبستاں آج مدحِ اہلبیتؑ میں جو خدمات انجام دے رہا ہے وہ کسی دوسرے دبستاں سے کم نہیں اس لئے اگر "خاندانی شاعر" کا مطلب یہ ہے کہ شاعر کے اخلاف میں بالفصل یا بلافصل کئی پشتوں تک شعر گوئی کا سلسلہ رہے تو بلاشک مرزا سلامت علی دبیر مرحوم کو خاندانی شاعر تسلیم کیا جانا چاہیئے۔

لیکن اگر "خاندانی شاعر" سے مراد یہ ہو کہ اسے اپنے اسلاف کی چند پیڑھیوں سے شعر گوئی کی روایت ملے یعنی "خاندانی شاعر" کا مطلب "پشتینی شاعر" سے ہو تو مرزا صاحب مبرور کے لئے یہ وصف ثابت کرنے میں اُن حضرات کو تحقیقی جد و جہد کرنی چاہیئے جو اُن کے خاندانی شاعر ہونے کے مدعی ہیں۔ کیونکہ اسلاف دبیر کی نسبت یہ حضرات ابھی تک کوئی ایسا انکشاف نہیں کر سکے ہیں جو چھوٹی ہوئی کڑیوں کو جوڑتا ہو اور اس دائرہ میں اُن بزرگوں کو شامل کرتا ہو جنھیں "حیاتِ دبیر" کے عقیدت مند مصنف میر افضل حسین ثابت لکھنوی مرحوم نے شامل نہیں سمجھا۔ خلاصہ گزارش یہ ہے کہ مدعی اپنے اسلاف کے کارناموں کی مسلسل روایت کی بنا پر صفت کا حامل ہو جسے یہ کہہ سکے "سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہگری" یا "بندہ مورونی مولا ہوں میں" یعنی "زور" میں "پدر ہو بیٹوں پوتوں پدر نہیں"۔ دوسری بات یہ کہ جو شخص "نیا نظریہ" پیش کرے اُس نظریے کے مستند کو ظاہر کرے کیونکہ "دعوائے بے دلیل قبول حرف نہیں"

اگر مطالعہ مطلق ہو تو کسی کو کچھ بھی سمجھا یا کہا جا سکتا ہے لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اُردو شاعری میں دو مقابل یا حریف شعراء کا جو سلسلہ گزرا ہے جیسے میر و سودا، ناسخ و آتش اُسی میں انیس و دبیر بھی ہیں جو ایک دوسرے کے حریف یا مقابل شاعر ہوئے ہیں اور ان کا مطالعہ ایک دوسرے کے تقابل میں ہوتا ہے اور اُن کی کسی مشترک صفت کا مطالعہ اُن کے مقابل کی اُسی صفت سے کر کے فضیلت معین کی جاتی ہے۔ یہ معروضہ ایسا نہیں ہے جو محتاجِ استدلال ہو پھر بھی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:۔

میر انیس مرحوم کی پہلی سوانح عمری حیاتِ انیس مولوی امجد علی اشہری مرحوم نے مولانا شبلی مرحوم کی فرمائش پر لکھی[1]

---

[1] حیاتِ انیس صفحہ ۲

لیکن شبلی نے خود جس موضوع کا انتخاب کیا وہ موازنۂ انیس و دبیر تھا لیکن میں شاید ماضی بعید کے دھندلکوں میں پہنچ گیا ہوں۔ کچھ قریب آنا چاہیئے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب میر انیس مرحوم کے مرثیوں کی ایک منتخب جلد شائع فرمانا چاہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا نام "سبعہ معلقہ" رکھنا چاہتے تھے۔ اس ارادے کا تذکرہ دبستان دبیر کے جوہر قابل میر سرفراز حسین خبیر سے آگیا اور ثانی الذکر نے "سبع مثانی" مرزا صاحب کے منتخب مراثی کی جلد پہلے ہی شائع کر دی اور میر صاحب کی جلد پروفیسر صاحب نے پھر روح انیس کے نام سے شائع کی۔ لیکن یہ بھی نسبتہً پرانی بات ہے۔ انھیں مرحوم مسعود صاحب نے کلام انیس کی ایک خاص ترتیب سے رزم نامۂ انیس مرتب کیا۔ خبیر صاحب مرحوم نے بھی تتبع کیا اور وہ کمال نیک نفسی اس کا اعتراف فرمایا اور اسی جذبۂ تقابل نے رزم نامۂ دبیر ایسا رزمیہ اردو ادب کو مہیا کیا۔ اردو اکادمی اتر پردیش نے میر انیس مرحوم پر ایک مذاکرہ سیمینار کا اہتمام کیا تو ان سطروں کے راقم نے اپنے ایک دانشور دوست کے مشورے سے مرزا صاحب مرحوم کے لئے بھی ایسی ہی تقریب کا مطالبہ کیا۔ میں نے یہ صیغۂ متکلم گفتگو مناسب سمجھ کر دی ہے۔ جانتا ہوں کہ یہ معیوب ہے لیکن آپ یاد فرمائیں کہ یہ صورت حال کا جبر ہے جسے برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ ظاہر صرف یہ کرنا ہے کہ ایک کرمفرما نے مجھ سے مرزا دبیر مرحوم پر مضمون کی فرمائش کی۔ میں نے کلام دبیر کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا ہے اس لئے اُن پر لکھنا یوں بھی دشوار تھا جس قدر عجلت مطلوب تھی اُس کے پیش نظر تو مشکل اور بڑھ گئی تھی آخر میں یہی جذبۂ تقابل کام آیا۔ پروفیسر مسعود حسن صاحب مرحوم نے "میر انیس کے دو استاد" کے عنوان سے ایک مضمون تحریر فرمایا تھا جو "نذر عابد" میں شامل ہے۔ اس مضمون کی ایک کاپی پرنٹ راہ ہمت افزائی مجھے بھی مرحمت فرمائی تھی۔ چنانچہ پروفیسر صاحب مرحوم کی تقلید و تتبع کے اظہار کے ساتھ "مرزا دبیر کے دو استاد" کے عنوان سے میں نے اپنے پریشان خیالات اور ناقص معلومات قلم بند کئے اور ایک باکمال مذاق اہلبیت اور اُن کے عالم اساتذہ کی یاد تازہ کرنے کا ثواب اور ایک مکرم دوست کی تعمیل فرمائش کا انبساط حاصل کیا اور ساتھ ہی ساتھ ایک نامور دانشور کے چراغ سے چراغ جلانے کا شرف بھی۔ بقول یہ سب ایک طرح سے جگ بیتی ہے۔ سرفراز کی آپ بیتی یہ ہے کہ اُس نے ۱۹۷۲ء (۱۳۹۲ھ) میں اپنا "محرم نمبر" "انیس نمبر" کی شکل میں پیش کیا اور اُسی حوالے سے یہ "دبیر نمبر" قارئین گرامی کے پیش نظر ہے۔

اس کج بیانی سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس طرح کا تقابلی موازنہ راقم آثم کی رائے میں نامناسب ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ صورت حال کے منطقی مطالبے کی تعمیل و تکمیل کے لئے ضروری ہے۔ خدا کرے اسی طرح چراغ سے چراغ جلتے رہیں۔

آیئے! اب ان دو باکمال حریفوں کی خاندانی شاعری کا مطالعہ خود اُن کے کلام میں کریں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم یہ یاد کر لیں کہ پختہ یا ادھیڑ عمر میں میر انیس مرحوم جب لکھنؤ پہنچے تو مرثیہ خوانی کے منبر پر مرزا دبیر مرحوم کا قبضہ تھا۔ میاں فصیح مرحوم زبان میں لکنت کی وجہ سے مرثیہ خوانی کرتے ہی نہیں تھے۔ میاں دلگیر مرحوم اگرچہ حیات تھے لیکن اُن کا کیا ذکر ہے۔ مرزا صاحب کی طباعانہ جدتوں نے خود اپنے اُستاد میر ضمیر مرحوم کو فرسودہ کر دیا تھا۔ تعلقات کی بدمزگی نے مقابلے کی کشاکش پیدا کر دی تھی۔ ظاہر ہے کہ تازہ دم زور آور شاگرد نے رموز الخطاط قوی کے ضعیف استاد کو اس میدان میں پسپا کر دیا تھا اور منبر کو اپنی جاگیر کمال بنا لیا تھا۔ صاحب واقعات انیس میر صاحب مرحوم سے روایت کرتے ہیں کہ:۔

"میر انیس مرحوم خود فرماتے تھے کہ جب
ہم نے لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنا شروع کیا تو

[illegible] صاحب اس فن کے لکھنؤ میں
تاج دار تھے۔ لیکن میر ملاری صاحب جو
پارس رہتے تھے اور دوسرے مرزا سلامی
دبیر مرحوم تھے

یہ روایت معلوم نہیں احسن صاحب تک کس وسیلے سے وارد ہوئی۔ راقم کے لئے تو قابلِ قبول نہیں۔ میر ضمیر مرحوم کا بازار کتنا ہی سرد ہو گیا ہو۔ لیکن وہ میدان سے ہٹ گئے ہوں یہ ممکن نہیں۔ اسی کے ساتھ یہ ملاری صاحب کتنے ہی مقبول فاکر رہے ہوں نامی و گرامی ہونے کے اعتبار سے اُن کا نام مرزا صاحب مرحوم کے نام کے ساتھ میر انیس مرحوم لیں یہ بھی محال ہی ہے۔ صورتِ حال یہ تھی کہ سربرآوردگی کے اعتبار سے مرزا صاحب مرحوم سب سے اول تھے کہ میر انیس مرحوم نے لکھنؤ میں قدم رکھا۔

اُس وقت لکھنؤ میں قوت کے دو ہی سرچشمے تھے ایک دولت سرائے شاہی، دوسرے آستانۂ غفراں مآب رحمۃ اللہ اگرچہ ریزیڈنسی اُن سے زیادہ مؤثر تھی مگر طاقت کی اس گنگا جمنا کے نیچے سرسوتی کی حیثیت رکھتی تھی کیونکہ مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے ان معرکوں سے اُس کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس لئے اس سطح سے غائب تھی۔ ان دونوں طاقتوں کی حمایت بھی مرزا صاحب مرحوم کو حاصل تھی۔ اُن کی رسائی عہدِ غازی الدین حیدر شاہ مرحوم میں دربار میں ہو چکی تھی۔ خود فرماتے ہیں ؎

واجب ہے حمد و شکر جنابِ الٰہ میں
فضلِ خدا سے آیا ہوں کس باغ و باغ میں
مجھ سا گدا اور انجمنِ بادشاہ میں
چرچا یہ لوگ کرتے ہیں اس وقت راہ میں
ذرے پہ چشمِ مہر ہے مہرِ منیر کو
حضرت نے آج یاد کیا ہے دبیر کو

نصیر الدین حیدر شاہ کے عہد میں تو وہ ملکہ زمانیہ مرحومہ کے باقاعدہ متوسلین میں شامل ہو گئے۔ مثنوی ممتاز نامہ جو اسی توسل کی یادگار ہے، کی تمہید میں فرماتے ہیں:۔

بفرمودۂ ہیثمِ نامدار — کہ جس سے زمین و فلک کا وقار
دیا اُس نے حکمِ اطاعت شیم — کہ معراج کا حال تو کر رقم
بجا لایا فی الفور ارشادِ خاص — اطاعت ہے سب ذکروں کا خواص

میر انیس کی لکھنؤ میں مستقل قیام کے لئے آمد کے وقت امجد علی شاہ زیب اورنگِ سلطنت تھے۔ اُن کی مذہب پسندی اور دینداری مذہبی حلقوں میں بہت ممدوح تھی مرزا صاحب مرحوم سے بطورِ خاص مدح سرائی کی۔ مرزا صاحب مرحوم نے مجموعۂ مراثی دفتر ماتم جلد اول میں پہلا مرثیہ:۔ "طغرا نویس کن فیکون ذوالجلال ہے" اس میں بادشاہ اور جناب سلطان العلماء و سید العلماء کا ذکرِ خیر ہے۔ اس مرثیہ کی شانِ نزول مولانا آغا مہدی صاحب قبلہ یہ بتاتے ہیں:۔

"ولیہ غفراں مآب علیہ الرحمہ میں ہمیشہ شہر کے مشہور ذاکرین پڑھا کرتے تھے لیکن تاریخ سے ثابت ہے کہ ایک بار اُس مجلس میں مرثیہ خوانی بھی ہوئی۔ چنانچہ علامہ کنتوری مولانا سید غلام حسین صاحب مرحوم و مغفور اپنے ایک مقالے میں اس کا اظہار فرماتے ہیں۔ ایک مرتبہ جناب غفراں مآب کے ولیمہ کی مجلس میں مرزا دبیر مرحوم نے اپنے پڑھنے کی درخواست کی۔ بڑی دشواری سے اجازت ملی۔ ایک مرثیہ مثل خطبہ کہہ کے لائے اور پڑھا اور تمام عمر فخر کرتے رہے کہ میں نے اپنا کلام

علماء اعلام کے سامنے پڑھا۔ الوارث
صدا ۱۳ بابۃ ربیع الاول و ربیع الآخر ۱۳۰۴ھ[1]
اس معاملے کو دنیا طلبی کی راہ سے نہیں دیکھنا چاہیے
خود فرماتے ہیں ؎
واقف ہے کبریا کہ دروغ و ریا نہیں
مقصد کوئی رضائے خدا کے سوا نہیں

یہی صورت حال تھی جس کی شہادت سلطان عالم واجد علی شاہ مرحوم کی بیت ہے ؎
بچپن سے اُن کے دامِ سخن میں اسیر ہوں
میں کم سنی سے عاشقِ نظم و دبیر ہوں

خاندانِ اجتہاد سے یہ رشتۂ ارادت نیا نہ تھا جب مرزا صاحب کے پدر نامدار مرزا غلام حسین صاحب مرحوم نے اپنا رشتۂ مناکحت لکھنؤ میں چاہا تو حسب نسب کی پوچھ گچھ ہوئی۔ اُنھوں نے ایک محضر استشہاد مرتب کر کے عمائد و علماء سے اپنی حسبی و نسبی حیثیت کی شہادت چاہی۔ اس محضر پر حضرت شاہ عالم بادشاہ غازی اور دوسرے امراء و عمائد کے دستخط کے ساتھ جناب غفران مآب کے دستخط بھی حاصل کئے۔ اس واقعے کے بعد یہ سمجھ لینا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے کہ جب مرزا سلامت علی کو لے کر اُن کے والد لکھنؤ تشریف لائے ہوں گے تو غفران مآب کی ڈیوڑھی پر سب سے پہلے گئے ہوں گے۔

اس کے علاوہ مولانا مرزا کاظم علی صاحب طاب ثراہ جناب غفران مآب کے اقارب و اقرب تلامذہ میں تھے، اُن سے مرزا دبیر مرحوم کے والد کی دیرینہ وابستگی معلوم ہوتی ہے۔ ابھی جس محضر شہادت کا ذکر ہوا اُس پر غفران مآب نے مولانا کاظم علی صاحب کے ہی اعتمادِ خصوصی کی بنا پر دستخط فرمایا تھا۔

---

[1] ماہنامہ واعظ لکھنؤ بابتہ فروری ۱۹۵۵ء ص ۱۷

ان سب پر مستزاد مرزا صاحب مرحوم کی مزاج کی موزونیت اور مذاقِ شاعری کی نکات پسندی بھی علماء اعلام کے حلقوں میں مرحوم کی پسندیدگی کا باعث تھی۔ جناب سلطان العلماء کے فرزند ارجمند تاج العلماء مولانا سید علی محمد صاحب نے اسی لئے مرزا صاحب سے تلمذ اختیار کیا۔ مرزا صاحب مرحوم کو بھی اس خانوادے سے بہت لگاؤ تھا برابر اُس کی خوشنودی کے جویا رہتے تھے۔ ۱۲۷۳ھ میں جب جناب سید العلماء کا سانحۂ رحلت پیش آیا۔ مرزا صاحب کے دو تلامذہ نے جناب مرحوم کا مرثیہ کہا۔ ایک حکیم سید محمد علی خاں قدیر دوسرے شیخ گوہر علی مشیر۔ مشیر کے لئے تو ثابت مرحوم کا کہنا ہے کہ یہ مرثیہ مشیر مرحوم نے جناب مرزا صاحب رحمۃ اللہ کے اشارے پر نظم کیا تھا۔ افسوس کہ ابھی تک میری رسائی ایک بیت تک ہوئی وہی نذرِ ناظرین ہے۔ جہاں بھائی کے سوگ میں سلطان العلماء کے حزن و الم کا ہے ؎
آنسو بھرے تھے غیرتِ الیاس کے لئے[2]
شبیر یوں ہی روئے تھے عباس کے لئے

قدیر مرحوم کا ایک بند ملاحظہ فرمائیے۔ اس میں بھی سلطان العلماء کے درد و غم کا تذکرہ ہے ؎
لی ہوگی اس جناب نے جس دم عدم کی راہ
کیا حال ہوگا آہ بڑے بھائی کا تباہ
رو کر یہ کہتا ہوگا وہ اے عرشِ بارگاہ
کیوں بھائی سید العلماء، خالقِ الٰہ
اُلفت تمہیں ہماری نہ آئی چلے گئے
پیری میں ہم کو چھوڑ کے بھائی چلے گئے

ممکن ہے کہ مرزا صاحب مرحوم سے متعلق مولانا آغا مہدی

---

[2] حیاتِ دبیر (۱) ص ۲۸
[3] تاریخ سلطان العلماء مصنفہ مولانا آغا مہدی ص ۹۲

صاحب قبلہ کے رشحات قلم کے ساتھ یہ مرثیہ بھی راولپنڈی (پاکستان) سے جلد شائع ہو۔ اس کے بعد دبیر و تلامذۂ دبیر کے خاندان اجتہاد کے ساتھ روابط کا صحیح ادراک ہو سکے گا۔

اس صورت حال کی شہادت ہے کہ مرزا صاحب کی مرجعیت کے لئے دربار شاہی اور خاندان اجتہاد جو شخصیتیں بنے ہوئے تھے۔ ان حالات میں کسی نووارد مرثیہ گو کو ابتدا سخت آمد و سنگ آمد کی جس صعوبت کا سامنا ہو سکتا ہے اُس کا سمجھنا زیادہ مشکل نہیں ہے اور پھر نووارد بھی کیسا بقول پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم :-

"اس نووارد کا کلام کون سنتا اُس کے کلام کا رنگ بھی دبیر سے بالکل مختلف تھا۔ جو لوگ خیال بندی، جدت طرازی اور صنعت گری کے عادی ہو چکے تھے وہ انیس کے کلام کی سلاست متانت اور واقعیت کی طرف جلد ملتفت نہ ہو سکے۔ ان کے پڑھنے کی مجلسوں میں سامعین کی تعداد بھی بہت کم ہوتی تھی اور اُن میں شوق کی کمی بھی محسوس ہوتی تھی۔ انیس نے اپنے ابتدائی کلام میں جا بجا اس کا ذکر کیا ہے۔ اُن کے کلام سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک جماعت اُن کی مخالفت پر تل گئی تھی۔ اسی زمانے میں انھوں نے ایک مناجات کہی تھی جس کے چند مصرعے یہ ہیں :-

اک طرف میں ہوں زمانہ اک طرف
جان شیریں سفت ہوتی ہے تلف
دیکھتا ہوں پیش و پس کوئی نہیں
ہیں تہی تنہا ہوں بس کوئی نہیں[1]

عرض یہ نہیں کرتا ہے کہ میر صاحب کی قدر دانی نہیں ہوئی۔ ہوئی اور خوب خوب ہوئی۔ وہ وقت بھی آیا کہ اُن کی لفظیں 'عالم پسند' اور بند 'سلطان پسند' ہونے لگے۔ مگر یہ اُس وقت کا حال ہے جب بہار عمر خزاں رسیدہ ہو گئی۔ فرماتے ہیں ؎

بس اے انیس ضعف سے ارزاں ہے بند بند
عالم میں یادگار رہیں گے یہ چند بند
نکلے قلم سے صنعت میں کیا کیا بلند بند
عالم پسند لفظ ہیں سلطان پسند بند

یہ فصل اور یہ بزم عزا یاد گا ہے
پیری کے ولولے ہیں خزاں کی بہار ہے

لیکن شروع شروع میں ارباب زمانہ کی سرد مہری نے جو سوزش پیدا کر دی تھی جس کے دفعیہ کے لئے مناجات نظم کی تھی وہ سوزش قلب مرثیوں میں کچھ زیادہ نمایاں ہے۔ آپ ذیل کے بند ملاحظہ فرمائیں۔ ان سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ سامعین کا ایک طبقہ میر صاحب کی مجلسوں میں ایسا بھی ہوتا تھا جو داد دینے سے گریز کرتا تھا ؎

نیک و بد عالم میں شامل نہیں کرتے
عارف کبھی اتنا بھی تجاہل نہیں کرتے
عارف کے لئے رُخ طرف گل نہیں کرتے
تعریف خوش الحانی بلبل نہیں کرتے
خاموش ہیں گو شیشۂ دل چور ہوئے ہیں
اشکوں کے ٹپک پڑنے سے مجبور ہوئے ہیں

الماس سے بہتر یہ سمجھتے ہیں خذف کو
دُر کو تو گھٹاتے ہیں بڑھاتے ہیں دف کو
اندھیر ہے یہ چاند بناتے ہیں کلف کو
کھو دیتے ہیں شیشے کے لئے دُر نجف کو
ضایع ہیں دُر و لعل بدخشاں سخن کے
مٹی میں ملاتے ہیں جواہر کو سخن کے

ناقدری عالم کی شکایت نہیں مولا

---

[1] سرفراز انیس نمبر ۱۳۷۲ھ ص ۳۲۵

کچھ دفتر باطل کی حقیقت نہیں مولا
باہم گل و بلبل میں محبت نہیں مولا
میں کیا ہوں کسی روح کو راحت نہیں مولا
عالم ہے مکدر کوئی دل صاف نہیں ہے
اس عہد میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے

اسی کیفیت کو مرزا صاحب بھی نظم فرماتے ہیں ؎

آؤ مرے پلے پہ اب اے گل کے مددگار
بے قدر ہے سنجیدگی، گوہر شہوار
جیسا کہ ترازو کا ہنر قحط میں بے کار
نے جنس عدالت، نہ خریدار، نہ بازار
انصاف کہاں سے ہو کہ دل صاف نہیں ہے
دل صاف کہاں سے ہو کہ انصاف نہیں ہے

اس کیفیت کی تعلی کے پردے میں بھی کافی تمرد ہوتی ہے۔ میر صاحب انھیں "دل کے پھپھولوں کی دوا" کہتے ہیں۔ دو بند میر صاحب کے ملاحظہ فرمائیے ؎

لا یعلم و لا علم کی کیا سحر بیانی
حضرت پہ ہویدا ہے مری ہیچمدانی
نہ ذہن میں جودت نہ طبیعت میں روانی
گویا ہوں نقط ہے یہ تری فیض رسانی
میں کیا ہوں فرشتوں کی طلاقت ہے تو کیا ہے
نہ خاص یہ بندے ہیں کہ مداح خدا ہے
تھا جوش کچھ ایسا ہی کہ دعوی کیا میں نے
خود سر بہ گریباں ہوں کہ یہ کیا کیا میں نے
اک قطرۂ ناچیز کو دریا کیا میں نے
تقصیر بخل کیجئے، بے جا کیا میں نے
ہاں سچ ہے کہ اتنی بھی تعلی نہ روا تھی
مولا یہ کلیجے کے پھپھولوں کی دوا تھی

اس "ہیچمدانی" کے جواب میں مرزا صاحب کی "ہمہ دانی" کا اظہار مگر "چرب زبانی" سے انکار ملاحظہ فرمائیے ؎

مضمون نئے کرتا ہوں ایجاد ہمیشہ
کہتا ہے سخن حضرت استاد ہمیشہ
کہنے میں ہے تائید خداداد ہمیشہ
بھولے سے بتا دوں تو رہے یاد ہمیشہ
بے لطف خدا یہ ہمہ دانی نہیں آتی
پر شمع صفت چرب زبانی نہیں آتی

میں بلبل خوش لہجہ، بستان سخن ہوں
میں معرکہ میں رستم دستان سخن ہوں
میں وارث اورنگ سلیمان سخن ہوں
ایمان سخن، دین سخن، جان سخن ہوں
عاجز ہوں کہ بندہ ہوں پر اعجاز بیاں ہوں
سرتا بہ قدم ہیچ ہوں لیکن ہمہ داں ہوں

میر انیس کی یہ رباعی اسی "شمع صفت چرب زبانی" کی حسن تعلیل معلوم ہوتی ہے ؎

زیبا ہے وقار بادشاہی کے لئے
جرأت واجب ہے کج کلاہی کے لئے
لازم ہے کہ ہو اہل سخن تیز زباں
تلوار ضرور ہے سپاہی کے لئے

سلف کے باکمال مداحان اہلبیت کو دونوں باکمال یاد کرتے ہیں مگر اپنا اپنا انداز ہے۔ میر صاحب فرماتے ہیں ؎

میں کیا ہوں مری طبع ہے کیا اے شہ شاہاں
حسان و فرزدق ہیں یہاں عاجز و حیراں
شرمندہ زمانے سے گئے دعبل و سحبان
قاصر ہیں سخن فہم و سخن سنج و سخن داں
کیا مدح کف خاک سے ہو نور خدا کی
لکنت یہیں کرتی ہیں زبانیں فصحا کی

مرزا صاحب فرماتے ہیں ؎

سعدی و طغرائی و بستانِ سخن ہے
ثابت ہے کہ حسانؓ خداوندِ سخن ہے
آئندہ جسے کہہ سرِ دستانِ سخن ہے
کہنے ہی کو ہے یہی میدانِ سخن ہے

کس طرح کی روانی ہے اس انداز کے آگے
جادو کہیں چل سکتا ہے اعجاز کے آگے

ایک جگہ مرزا صاحب نے اپنے کو محتشم و مقبل کی خاکِ قدم کہا بھی تو بیت میں کسر نکال لی ؎

میں کون ہوں صاحب علمِ کلک جہاں گیر
نوبت زنِ نہ بامِ عروجِ فلکِ پیر
تاجِ سرِ الفاظ و سخن و معنی و تقریر
خاکِ قدمِ محتشم و مقبلِ شبیر

منکر نہ کرے ہاں تو شکایت بھی نہیں ہے
انصاف تو کہتا ہے خداوند یونہی ہے

یہاں جوشِ تعلی میں اپنے کو انصاف کے منھ سے خداوند کہلوا لیا اگرچہ انسان کو خداوند کہے جانے کے سخت مخالف ہیں ؎

اک روز خدا کو منھ دکھانا ہے دبیر
بندے کو میں کس منھ سے خداوند کہوں۔

جب لکھنؤ پر میر صاحب کی اعجاز بیانی کا جادو چل ہی گیا اور ساری فضیلتیں ڈھا کے وہ تختِ کمال پر جلوہ افگن ہو ہی گئے تو پھر تعلی نے خطاب کی صورت اختیار کر لی اور ایک دوسرے پر فیض اندوزی اور مضامین کے سرقے کا الزام لگانے لگے۔ مرزا صاحب نے کہا:۔

شیرانِ مضامیں کو کہاں بند کروں
گرجیں گے ڈکاریں گے جہاں بند کروں
خلاقِ مضامیں تو کبھی بیں لیکن
کھل جائے حقیقت جو زباں بند کروں

میر صاحب نے کہا ؎

گل ہائے مضامیں کو کہاں بند کروں
خوشبو نہیں چھپنے کی جہاں بند کروں
میں باعثِ نغمہ سنجیٔ بلبل ہوں
کھولے ہے کبھی منھ جو زباں بند کروں

میر انیس نے ایک سلام میں کہا:۔

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

مرزا ادیب مرحوم نے کہا ؎

ہزار خوشے ہیں مضموں کے ایک دانے میں
غنی کیا مرے خرمن نے خوشہ چینوں کو

میر مونس مرحوم نے بھی اس زمین میں کوشش کی۔ اب جواب میں میاں شیر اپنی چرب زبانی کے ساتھ آئے۔ فرماتے ہیں ؎

جلی کٹی مرے استاد سے کرے جو کوئی
تو چھونک دوں میں خرمن میں خوشہ چینوں کو

اس طرح کے خیالی مضامین اور فکر کی بلند پروازی میں مرزا صاحب نے برابر کی چوٹیں کی ہیں۔ ثابت مرحوم کا فرمانا بجا ہے کہ مولانا شبلی نعمانی کی یہ رائے غلط ہے کہ "مرزا صاحب برابر کا جواب نہیں دیتے"۔ لیکن جہاں حقائق کی بحث ہو وہاں مرزا صاحب کے ایسا مقدس مداح مخبر صادق کیا کرے۔ اب وہ مقامات دیکھئے جہاں میر انیس اپنے "مجد موروثی" پر مباہات کرتے ہیں۔ مشہور مرثیہ ہے:

"خاک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری"

جو اپنے فرزند میر عسکری جلیس کے لئے کہا تھا اس میں کہتے ہیں ؎

خاک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری
ناطقے بند ہیں سن سن کے بلاغت میری
رنگ اڑتے ہیں وہ رنگیں ہے عبارت میری
شور جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت میری

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیرؑ کی مداحی میں

اس ثنا خواں کے بزرگوں میں ہیں کیا کیا مداح
جدِ اعلیٰ سے نہ ہوگا کوئی اعلیٰ مداح
باپ مداح کا مداح ہے، دادا مداح
علم ذی قدر ثنا خوانوں میں یکتا مداح
جو عنایاتِ الٰہی سے ہوا نیک ہوا
نام بڑھتا گیا جب ایک کے بعد ایک ہوا

خلق میں مثلِ خلیق اور تھا خوش گو کوئی کب
تا رہے دھوئے زباں کو خرد نسیم سے جب
بلبلِ گلشنِ زہراؑ و علیؑ، عاشقِ رب
متبع مرثیہ گوئی میں ہوئے جس کے سب
ہو اگر طبع کی جدت تو نہ موزونی ہے
اس احاطے سے جو باہر ہے وہ بیرونی ہے

کیوں نہ ہو بندۂ موزونیٔ مولا ہوں میں
ملزمِ رحمتِ معبود کا شیدا ہوں میں
جس میں لاکھوں دُرِ و مرجاں ہیں وہ دریا ہوں میں
مدح خوانِ لبِ حضرتِ زہراؑ ہوں میں
نہ صفت جوہر کا کروں یا صفتِ ذات کروں
اپنے رتبے پہ نہ ٹھیروں آپ مباہات کروں

ایک بیت یہ بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

جدِ و آبا کے سوا غیر کی تقلید نہ ہو
لفظ مغلق نہ ہو، گنجلک نہ ہو، تعقید نہ ہو

اگر جناب مرزا صاحب کا سرمایۂ سخن ان مضامین سے خالی ہے تو وہ نہ اُن کا عجز ہے نہ انکسار بلکہ بات یہ ہے کہ وہ ایک غیور اور کریم النفس انسان کی طرح حقیقتِ حال پسند تھے اور جوڑ توڑ یا جرب زبانی کے بل پر اپنی دستارِ افتخار میں مانگے تانگے یا چھین جھپٹ کے طرّے نہیں سجانا چاہتے تھے اور یہی سیرت اُن کے ذی شعور مقلدوں کی رہی ہے۔ جناب خیبر مرحوم اپنے دبستان کی مراعات کے ساتھ صورتِ حال کی عکاسی کرتے ہیں:۔

"میر انیس کی شاعری اگرچہ مرزا دبیر کی شاعری کے بعد شروع ہوئی پھر بھی وہ ایسے کہنہ مشق، صاحبِ کمال، ذی استعداد عالم جید کے مدِ مقابل ٹھہرائے گئے اور اپنا کمال منوا کے رہے۔ اسی طرح مرزا دبیر اگرچہ خاندانی شاعر نہ تھے، ان کے بعض بزرگ شاعر ہوئے بھی تو فارسی کے اور میر انیس اگرچہ خاندانی شاعر تھے۔ باپ، بھائی سب صاحبِ کمال تھے، اُنھوں نے اسی ماحول میں پرورش پائی، جہاں یہی چرچے رہتے تھے مگر مرزا دبیر نے اُن کے مقابل میں اپنا سکۂ کمال جاری رکھا اور یہ ثابت کر دیا کہ کمال کے واسطے صرف خاندانی ہونا کافی نہیں۔" [۱]

اب جو کر مرزا خیبر مرحوم کے اس استدلال کو قطع کرنا چاہیں تو انھیں اس کے لئے ایسے ساز و سامان کے ساتھ آنا چاہیئے جو قابلِ قبول ٹھہرے اور اسی کے ساتھ مرزا صاحب مرحوم کے جدِ اعلیٰ مرزا غلام حسین کی شاعری کا ثبوت مہیا کرنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ثابت کی جانا چاہیئے کہ ملا اہلی شیرازی یا ملا رفیع تک شاعری اُن کے ورثہ بطور میراث پہنچی جیسے میر حسن مدعی ہیں کہ "ایں سلسلہ

---

[۱] رزم نامۂ دبیر ص
[۲] اسلاف میر انیس ص ۱۷۷

خاندانی سلسلہ شاعری اجداد لیست نہ امروزی:۔
اگرچہ اس کے بعد بھی یہ سوال اپنی جگہ پر رہے گا کہ
مرزا صاحب کو اپنے جدِ آبا کے سرمایۂ شاعری سے کوئی
نفع پہنچا اور وہ غیر کی تقلید اور بیرونی خرمن سے خوشہ چینی
پر کیوں مجبور رہے۔
اور جب تک ان سوالات کا حل قابلِ قبول طریقے سے
نہیں نکل آتا ہے اس وقت تک یہ حقیقت ناقابلِ تردید
رہے گی:۔

"کوئی اکتسابی فن بھی کسی خاندان میں
کئی پشتوں تک نہیں چلتا ہے۔ یہ شرف اسی
خاندان شاعری یعنی میر انیس کے خاندان
کے لئے مخصوص ہے کہ شاعری کا زجدانی فن
آٹھ پشتوں تک چلتا رہا۔" [1]

مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہ

الوداع!

لو یارو الوداع دمِ شورِ دشین ہے ، اب تم سے سال بھر کو وداعِ حسین ہے
روئے پچاس روز مگر جی نہیں بھرا " " " " " "
اک شب کی شب یہ تعزیہ ہے اور مرثیہ " " " " " "
ماتم بھی آخری ہے یہ مجلس بھی آخری " " " " " "
کس کو خبر ہے چہلم آئندہ ہو نصیب " " " " " "
اچھی طرح وداع کرو میہمان کو " " " " " "
کل چاند فاطمہؑ کا زمیں میں چھپے گا ہائے " " " " " "
کل تم کہاں یہ بزم کہاں اور ہم کہاں " " " " " "

---

[1] اسلاف میر انیس ص ۱۷۶

ڈاکٹر فضل امام
اُستاد شعبۂ اُردو۔ راجستھان یونیورسٹی۔ جے پور

دبیریت کیا ہے؟

عام طور سے ناقدین اُردو ادب دبیر کو ثقالت پسند، طوالت عزیز اور غیر ثقہ روایات کا نظم کرنے والا مرثیہ گو کہتے ہیں۔ دبیر کے کلام پر اس انداز کی تنقید اس بات کا واضح ثبوت فراہم کرتی ہے کہ ہمارے ناقدین ادب سہل انگاری میں یقین رکھنے کے عادی رہے ہیں۔ چند مفروضہ امتیازات کے چوکھٹوں میں انیس و دبیر کے شاعرانہ اکتسابات کا احاطہ کرنے والے غالباً اُردو شعر و ادب کو انتہائی محدود اور مسدود متصور کرتے ہیں۔ حالانکہ ادب کا غائر مطالعہ عرق ریزی اور دیدہ ریزی کے ساتھ ساتھ دلسوزی کا بھی مطالبہ کرتا ہے۔ دبیر ایسا ہی ایک شاعر تھا جو بدنصیبی سے مرثیہ گو بھی تھا۔ فی الحال مجھے یہاں مرثیہ گوئی کی نہ تو تاریخ بیان کرنی ہے اور نہ صنف سخن کے لحاظ سے اُس کے دائرۂ کار کا تعین کرنا ہے۔ بحث صرف اس قدر ہے کہ وہ کیا چیز ہے جسے اودھ کے مشہور و معروف محاورے میں "دبیریت" کہا جاتا رہا ہے۔

مختصر طور پر یہیں یہ بات بھی عرض کرنی ضروری ہے کہ ہمیں سب سے پہلے مرثیہ کے موضوعات، محرکات، اسباب و علل، علت و معلول پر گہرائی سے غور و فکر کرنا ہوگا۔ اس کے بعد ہی اس صنف سخن کے ذیر اثر مرثیہ نگاروں پر نتیجہ خیز بحث ہو سکتی ہے۔ تعجب تو اس پر ہے کہ ہم لوگ پہلے نظریہ قائم کرنے کے عادی ہوتے ہیں اور نظر بعد میں پیدا کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے نظریات تارِ عنکبوت سے زیادہ پائیدار نہیں ہوتے ہیں۔ دبیر کے متعلق بھی اسی انداز کے نظریات روا رکھے گئے ہیں لیکن دبیر کا تجزیاتی مطالعہ ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ درحقیقت "دبیریت" فکر و فن کے اُس تدبر کا نام ہے جو ذہن انسانی کے سوتوں کو آب زلال میسر کرتا ہے۔ وجدان و آگہی فن کی اس قسمت کا نام دبیریت ہے۔ جہاں ہمارے تفکر و تفلسف کی امکانی سرحدوں کو چیلنج کیا جاتا ہے۔ "دبیریت" نام ہے تجزیہ فن کی اس رفعت کا جہاں فنی بصیرتوں اور جدید وسعتوں کا سنگم نظر آتا ہے۔ "دبیریت" نام ہے اُس دقت نظر کا جو فن کی تقدیر بھی ہے اور تجزیہ بھی۔ دبیریت نام ہے فن کی اُس وادیٔ پُرخار کا جہاں خس خانۂ مژہ سے نگاہوں کو باہر نکال کر کڑی دھوپ کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ "دبیریت" نام ہے شدت جذبات، نزاکت احساس، دقت نظر اور دقیقہ سنجی کے اُس دبیز پردے کا جسے علم و فن کی بصیرتوں کا رازدار ہی اپنے ہاتھوں سے ہٹا سکتا ہے۔ اب یہاں اس اجمال کی تفصیل کا ایک مختصر لیکن مقصدی جائزہ درپیش ہے۔

تنقید دبیر کے سلسلے میں دبیر کی زبان اور انداز بیان کو مشکل اور عوام کے بجائے خواص اور خواص میں بھی ایک

دوسرے کے رونے رلانے کے لئے بتایا گیا ہے تنقید دبیر کا نتیجہ دلچسپ بھی ہے اور کافی حد تک مضحکہ خیز بھی۔ دلچسپ اس لئے کہ زبان اور انداز بیان کی مشکل پسندی کے باعث دبیر کا کلام عوام سے علاحدہ ہو کر صرف ایک مخصوص طبقے کے رونے رلانے کا سبب بن گیا ہے؟ یا رونے رلانے کے سبب سے صرف ایک مخصوص طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ اگر زبان اور انداز بیان کی مشکل پسندی سبب علاحدگی ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ خود اقبال اور حضرت میر انیس کا بھی بعض کلام ایسا ہی ہے۔ خاص طور سے "بال جبریل"، "ضرب کلیم" اور "ارمغان حجاز" کا اقبال عام فہم نہیں ہے بلکہ بہت مشکل پسند ہے اور آج تو غالب، اقبال، انیس اور دبیر کے کلام کا صحیح طور پر ادا کرنا ہی ایک امتحان ہے۔ سودا اور ذوق کے قصائد بھی اسی ذیل میں آجاتے ہیں تو کیا ان سب شعراء کی کاوشیں علاحدگی اور کسی خاص طبقہ کا مطالبہ کرتی ہیں اور اگر سبب گریہ و بکا ہی عوام سے علاحدہ کرتا ہے تو اس نقطۂ نظر سے صرف دبیر ہی نہیں انیس بھی اور صرف انیس ہی نہیں بلکہ مرثیہ صنف سخن کی حیثیت سے یہی مطالبہ کرتا ہے چاہے وہ لغوی معنوں سے مختلف ہو کر اصطلاحی معنوں میں کچھ بھی استعمال ہونے لگے یا وصفی معنوں میں کچھ بھی مروج ہو جائے لیکن جب لفظ "مرثیہ" کو ہم صنف سخن کے اعتبار سے مطالعہ کرتے ہیں تو جنوبی ہند سے شمالی ہند اور پھر اودھ میں مختلف مدارج اور منازل میں نظر آتا ہے۔ پھر بھی بہ اعتبار صنف سخن، شخصی مرثیوں میں بھی مرکزی نقطۂ نظر رونا رلانا ہی رہتا ہے اور بات ہے کہ صفات ذات کا تذکرہ اس انداز سے کیا جاتا ہے کہ آنکھوں سے بے ساختہ آنسو اور دل سے ضرور کہ نکل جائے گی اس لئے یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مرثیہ ایک نظری اور عین نظری صنف سخن ہے۔

انیس و دبیر ایک ہی عہد کے شاعر ہیں بس فرق اتنا ہے کہ ایک کی پیدائش دہلی میں ہوئی اور دوسرے کی فیض آباد میں ایک کی شاعری کی ابتدا لکھنؤ میں ہوئی اور دوسرے کی فیض آباد میں اور ایک وقت ایسا آیا جب دونوں لکھنؤ میں چمکنے لگے پھر بھی انیس و دبیر کا موازنہ جس نقطۂ نظر سے کیا جاتا رہا ہے وہ قطعی گمراہ کن ہے۔ شبلی ہمارے ان ناقدین میں ہیں جو تاویلات اور تعلیلات میں اپنا نظیر نہیں رکھتے ہیں۔ انیس و دبیر کے موازنہ میں بھی شبلی نے اپنی نظری بت پرستی سے کام لیا ہے۔ گو کہ انیس و دبیر کا موازنہ اور روئے مرثیہ نگاری ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ میں شمس العلماء مولوی امداد امام اثر کے مندرجۂ ذیل نقطۂ نظر سے بہت حد تک متفق ہوں کہ انیس رزمیہ شاعر ہیں اور دبیر خالصتاً مرثیہ گو شاعر ہے۔ ملاحظہ ہو:

> "لاریب آپ سلطان الذاکرین تھے مگر مرثیہ نگاری کا بیکا ہے۔ لاریب میر انیس صاحب ایک بڑے رزمی شاعر تھے . . . . . اور رزمی شاعر ہونے کی حیثیت سے ہومر یا اور کسی رزمی شاعر کے ساتھ آپ کا موازنہ نامناسب نہیں سمجھا جا سکتا ہے مگر میر صاحب کا موازنہ میرزا صاحب کے ساتھ جب کہ دونوں شاعری کے جداگانہ پہلوؤں کو برتتے ہیں کوئی معقول شکل نہیں رکھتا ہے۔ رزمی شاعر کا موازنہ رزمی شاعر کے ساتھ اور مذہبی شاعر کا موازنہ مذہبی شاعر کے ساتھ لطف سے خالی نہیں ہو سکتا۔ مگر بے جوڑ موازنہ سے نہ کوئی معقول نتیجہ مرتب ہو سکتا ہے اور نہ اہل مذاق کو ایسے موازنہ سے کوئی حظ کی صورت پیدا ہو سکتی ہے"[1]

---

[1] کاشف الحقائق حصہ دوم المعروف: بہارستان سخن ص ۳۳۵

صاحب کاشف الحقائق کے مندرجۂ بالا بیان کے بعد یہیں یہ امر بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ ابھی تک انیس و دبیر پر کوئی ایسا کارنامہ سامنے نہیں آسکا ہے جسے مستقل تصنیف کا درجہ دیا جاسکے اور جس کی مدد سے اُن کی شخصیت اور فن کو پرکھا جاسکے۔ سوانحی خاکے اور جائزہ اور طور پر مضامین بڑی شد و مد کے ساتھ لکھے گئے ہیں لیکن "انیسیت" اور "دبیریت" کی اصل روح کیا ہے؟ یہ نہ تو حیات انیس میں ہے اور نہ تو حیات دبیر میں نظر آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کتب موضوع اور فن کے پیش نظر نہیں لکھی گئی۔ میں اس کے علاوہ میر انیس کو عقیدت کا خراج ایک مہم کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس میں کبھی کبھار تحقیقی مقالوں کے موضوعات بھی رہے ہیں لیکن یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اس طرح کی کارشوں سے فن کو نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔ رہے دبیر تو یہ یوں ہی نظر انداز کئے گئے ہیں۔ اس سے کوئی بھی انصاف پسند اور تھوڑا بہت پڑھا لکھا بھی انکار نہیں کرسکتا ہے۔ لیکن دبیر کو نظر انداز کرنے سے خود دبیر کا کچھ نہیں بگڑا۔ اس سے تو نظر انداز کرنے والوں کا پست مذاق ظاہر ہوا۔ مجھے تو کلام دبیر کا مطالعہ اس نتیجے پر پہنچا رہا ہے کہ اس کی فکر و فن خود ناقدین ادب کے لئے ممتحن ہے۔ ناظر کاکوروی "مطالعۂ انیس" میں دبیر کے متعلق یوں رقم طراز ہیں:-

"... مرزا دبیر کو شاعری ورثہ میں نہیں ملی تھی، اُن کی مرثیہ گوئی اکتسابی کہی جاسکتی ہے۔ لیکن میں اسے خداداد سمجھتا ہوں۔ شاعر ہونے کے علاوہ علوم متداولہ میں بھی ماہر تھے اور عربی فارسی کے منتہی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام میں عالمانہ رنگ اور رنگا رنگی پایا جاتا ہے۔" [1]

---

[1] مطالعۂ انیس۔ ناظر کاکوروی

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ دبیر خالص مرثیہ گو شاعر ہے اس لئے "دبیریت" کا اصل مفہوم "مرثیت" میں پنہاں ہے اور یہی سبب ہے کہ مرثیہ گویوں کی طویل فہرست میں مرزا دبیر کا نام ہی سرفہرست آتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انیس نے بھی بین لکھے ہیں لیکن انیس کا مرثیہ نگاری کا اصل تصور بینیہ اور حزنیہ نہیں ہے۔ انیس کی مرثیہ نگاری میں رنج و غم کی باتیں صرف اس لئے ہیں کہ مرثیہ اس پہلو سے خالی نہ رہ جائے۔

لفظ بھی چست ہوں مضمون بھی عالی ہو جائے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہو جائے
(انیس)

یعنی انیس کے یہاں "مرثیت" کا تصور برائے بیت ہے جب کہ دبیر مرثیہ کو اصل مفہوم میں پیش کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ سمجھئے کہ "بین" انیس کے یہاں مرثیہ کے اجزائے ترکیبی میں شامل ہے یعنی مرثیہ کا جزو ہے۔ اس کے قطع نظر دبیر کے یہاں بین مرثیہ کے عناصر ترکیبی میں شامل ہے یعنی بین ہی اصل اور عین مرثیہ نگاری ہے۔ اسی لئے بعض اوقات کچھ ایسی روایات بھی دبیر نے نظم کر دی ہیں جن کے متعلق شامل ہے مگر ان روایات کا نظم ہو جانا کچھ ایسا غلط نہیں ہے کیونکہ شاعر مورخ نہیں ہوتا ہے۔ دوسرے روایات چاہے ضعیف ہوں یا قوی، سب کی سب دامن تاریخ میں نظر آتی ہیں۔ پہلے مورخین کا اجماع روایات کی سند کے لئے کوئی معیار مقرر کر دے۔ اس کے بعد اس معیار کی روشنی میں کوئی نتیجہ برآمد کیا جاسکتا ہے۔ یاد رہے کہ حدیث سرور کائنات کے متعلق قطعیت کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ جتنی بھی احادیث حضور سرور کائنات سے منسوب کی جاتی ہیں وہ سب کی سب مستند ہیں۔ اسی لئے احادیث کی صحت کے لئے یہ معیار خود سرور کائنات نے مقرر کر دیا

[illegible] قرآن سے مطابقت نہ رکھتی ہوں اُنھیں ذاتِ
پر پھینک دو۔ بالفرض محال اگر دبیر نے غیر ثقہ روایات
مرثیوں میں نظم کر دی ہیں تو اول اُن کا وجود کتب تاریخ
دیسر میں پایا جاتا ہے اور اگر اجماع مورخین نہیں ہے
یا اُس کی صحت مشکوک ہے تو ان روایات کی روشنی میں
کلام دبیر کو قرآن و حدیث کا درجہ کیوں دیا جائے؟

اصل گفتگو یہ ہے کہ کیا دبیر نے جن جذبات کی
جس انداز میں عکاسی کی ہے وہ انسانی زندگیوں سے دُور
ہیں؟ کیا اُن میں فطری پن نہیں؟ کیا ہم دبیر کی فراوانی
میں عام طور ان کوائف اور اقوال کو ہم اپنے گرد و پیش
نہیں دیکھتے ہیں؟ ظاہر ہے ان سوالات کی تردید ممکن
نہیں ہے، تو پھر اسے تسلیم کرنے میں کیوں تامل ہے
کہ دبیر ان روایات کو نظم کرنے میں انسانی زندگی کے
تصورات سے کنارہ کش نہیں ہوئے ہیں۔ یاد رہے کہ دبیر
نے عرب کے کرداروں کو اپنی نظر سے خود تو دیکھا نہیں
تھا۔ تاریخ کے مطالعہ، روایات کے علم، احادیث کی
معرفت نے ان کرداروں تک دبیر کی رسائی کی تھی۔ دبیر
نے ان کی حرکات و سکنات، طور و طریقہ، صورت و سیرت،
سب سے پہلے اپنے اوپر طاری کی ہوگی پھر اُسے اپنے
محسوسات سے کام لے کر مرثیہ میں پیش کیا ہے۔ واقعۂ کربلا
کے مختلف کرداروں کی شجاعت، سخاوت، صبر و استقلال،
بہادری اور دلیری، حرب و ضرب، بندگی و عبادت، رنج
و غم، مسرت و انبساط وغیرہ مافوق الفطری نہیں بلکہ
عین فطری ہیں۔ یہ تو "دبیریت" ہے جس نے جذبات
و کیفیات انسانی کے تمام تر محسوسات اور ان کی دھڑکنوں
کو اپنے مرثیہ میں محفوظ کر دیا ہے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ
شدت جذبات کو منطق اور ریاضی کے اصولوں سے
نہیں ناپا جا سکتا۔

مورد فی، مکسبی اور مذہبی شاعری کی مروجہ اصطلاحات
بھی بہت کچھ گمراہی کا سبب رہی ہیں۔ میں اس کے
اثرات کا منکر نہیں لیکن یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ
جسے خاندانی طور پر شعر و ادب کا ماحول نہ ہو وہ ہی
بڑا اچھا اور کامیاب شاعر ہوگا۔ یہ بھی کوئی ضروری نہیں
کہ بڑا اور عظیم شاعر وہی ہوگا جس کے باپ دادا بھی
رہے ہوں۔ میرے خیال میں اسے کلیہ تسلیم نہیں کیا
جا سکتا ہے۔ صرف اردو میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے دوسرے
تاریخ کی ورق گردانی کر کے مجھے کوئی بتا دے کہ یہ کلیہ
ہے ـــــ میں سب سے بڑا کمال یہ سمجھتا ہوں کہ شاعر
اپنی شخصیت میں علمیت و ادبیت پیدا کر کے اپنی خاندانی
کی چھاپ لگا دے۔ یہ بھی دبیر کا کمال ہے جس میں اسلاف کی
عظمتوں کا طفیل نہیں۔ اب رہا مسئلہ کسب اور وہبی صلاحیت
کا تو یہ بھی ذہن نشین رہے کہ اگر کچھ چیزیں قدرت نے
ودیعت کر دیں، وہاب نے بخش دیں تو اس میں شخصیت
کے کمال پن کی کیا بات ہے؟ قدرت نے عقل، احساس،
شعور اور بندہ عنایت کر دیا۔ اب جتنی زیادہ قوت کسب
ہوگی اُتنی ہی زیادہ اُس کے علم و فن اور شعر و ادب کو
تقویت حاصل ہوگی۔ شاعری کا تعلق براہ راست شاعر
کے جذبات، احساسات اور فکر و فن سے ہے۔ یہ کوئی
ایسی چیز نہیں ہے جسے الہام کہہ کر کچھ حاصل کرنے کے
ہم لوگ عادی ہو چکے ہیں۔ دبیر مورد فی شاعر نہ سہی،
دبیر وہبی شاعر نہ سہی، لیکن وہ کسبی شاعر تو ہے۔ وہ اپنی
دنیا کا خود معمار ہے ـــــ اس سے تو کوئی انکار نہیں کرتا
ہے ـــــ اور اسی انفرادیت فن کو میں "دبیریت" سمجھتا
ہوں۔

موازنہ انیس و دبیر میں جس نے تجزیہ کیا ہے تیز انداز
اختیار کیا ہے۔ تمہید کی ابتدا کی سطروں میں لکھتے ہیں:

"بدمذاقی کی نوبت یہاں تک پہنچی
کہ وہ انیس اور مرزا دبیر حریف تھا۔"

قرار دیئے گئے اور مدت ہائے دراز کی
غور و فکر، کد و کاوش، بحث و تکرار کے
بعد بھی فیصلہ نہ ہو سکا کہ ترجیح کا مسند نشین
کس کو کیا جائے۔" [1]

اس کے بعد ہی شبلی دوسرے ہیرا گراد کی آخری
سطروں میں لکھتے ہیں:۔

"اس کتاب میں میر انیس کا موازنہ بھی
مرزا دبیر سے کیا گیا ہے اور اس مناسبت
سے اس کا نام موازنہ ہے۔" [2]

شبلی کے متضاد بیانات سے یہ واضح ہو جاتا ہے
کہ وہ خود انیس کو دبیر کا ہم پایہ سمجھتے ہیں۔ یہ اور بات
ہے کہ زبان سے تسلیم کرنے میں تاویل سے کام لیتے ہیں۔
دونوں شخصیتوں کے انداز فکر مختلف ہیں۔ اسی لئے مختلف
طبیعتوں کے افراد اپنے طور پر اظہار پسندیدگی کرتے ہیں۔
اسے بد مذاقی نہیں کہا جا سکتا ہے۔ میں صاحب المیزان
کے مندرجہ ذیل خیال سے اتفاق کرتا ہوں:۔

"یہ دونوں بزرگ اردو شاعری میں
بے مثل و لاجواب تھے اور ایک کو دوسرے
پر ترجیح دینا محض ایک قسم کا تعصب
ہے نہ واقعیت اور حقیقت۔ اس بارے
میں جناب مفتی میر محمد عباس صاحب قبلہ و کعبہ
کا قابل قبول فیصلہ یہ ہے کہ مرزا صاحب کا
کلام رقیق و ملیح اور میر صاحب کا کلام
فصیح و شیریں ہے۔ دونوں کا ذائقہ علیحدہ
علیحدہ ہونے کی وجہ سے ایک کو دوسرے
پر ترجیح نہیں دی جا سکتی کیونکہ بعض
طبیعتیں نمک کو پسند کرتی ہیں اور بعض طبائع
شیرینی پر مائل ہیں۔" [3]

جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کر چکا ہوں کہ مورونی
شاعری یا مورونی فن کہہ کر افضلیت اور فوقیت کا درجہ
نہیں دیا جا سکتا ہے۔ شبلی نے موازنہ کے اوراق میں میر انیس
کے خصوصیات کلام کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے:۔

"میر صاحب نے شاعری میراث میں
پائی تھی، اُن کے مرثیے کے جو خاص جوہر
ہیں وہ میراث ہی کی یادگار ہیں۔" [4]

مندرجہ بالا جملے کا تجزیہ یوں کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) میر صاحب نے شاعری میراث میں پائی تھی۔

(۲) اُن کے مرثیے کے خاص جوہر میراث ہی کی یادگار
ہیں یعنی انیس کا اپنا کوئی خاص جوہر نہیں کیونکہ خاص جوہر
میراث ہی کی یادگار ہیں۔ اس میں "ہی" نے تو عجیب غریب
تدغمن لگا دی ہے۔ اس کے پیش نظر نتیجہ خیز گفتگو کر چکا ہوں۔

... ...

میرا اپنا خیال اور نظریہ ہے کہ مورونی اور ذہنی شاعری
کی اصطلاحات غلط کرنے کے لئے استعمال ہوتی رہتی ہیں
اس لئے ترجیح کا مسئلہ بڑا ہی گھناؤنا ہے۔ یادگار رشید میں
غالب کی رائے جو حالی نے نقل کی ہے اس سے لے کر

---

[1] موازنۂ انیس و دبیر ـــــ شبلی نعمانی مرتبہ رشید حسن خاں ص ۱۱

[2] " " " " " " ص ۱۱

[3] المیزان ـــــ مؤلفہ چودھری سید نظیر الحسن نوق رضوی۔ ص ۱۹۔
مطبوعہ مطبع فیض عام۔ علی گڑھ

[4] آب حیات ـــــ از مولوی شمس العلماء محمد حسین آزاد ص ۵۷

[illegible] منصف مزاج انیس اور دبیر کو برابر
[illegible] ہے ہیں ۔ آزاد کا بیان بہت واضح
ہے جو انھوں نے انیس اور دبیر کے ذیل میں دیا ہے:۔

"... اور منصفی بیچ میں آکر کہتی تھی کہ
دونوں اچھے، دونوں اچھے۔ کبھی کہتے وہ
آفتاب ہیں یہ ماہ۔ کبھی کہتے یہ آفتاب وہ
ماہ" [1]

آزاد کا یہ اندازِ تحریر اس بات کا ثبوت ہے کہ نہ تو اُن میں ایک دوسرے کے مدِ مقابل ہے اور نہ حریف ہے بلکہ دونوں کا اندازِ فن کا نظریہ مختلف ہے اس لئے ترجیح کا مسئلہ حل نہ کرنا اور مسند نشینی کا مرحلہ طے نہ کرنا بدمذاقی نہیں ہے بلکہ کوئی قضیہ ہی نہیں ہے۔ دونوں کا رنگ طرز اور انداز جُدا ہے۔ ہاں مسئلہ ترجیح کا پیدا کر دینا البتہ ثبوت بدمذاقی ہے۔

قریب المعنی بند کو بنیاد بنا کر شبلی نے تحریر کیا ہے:۔

"میر انیس کی شاعری کے متعلق یہ مسئلہ نہایت مہتم بالشان مسئلہ ہے کہ مرزا دبیر کی رقابت اور مقابلے نے اُن کے کلام پر کیا اثر پیدا کیا۔ اگر یہ بیانگ مسلّم کہ دونوں حریفوں میں سے اول کس نے میدانِ شاعری میں قدم رکھا اور خاص خاص مرثیے بلکہ خاص خاص بند جو دونوں کے ہاں قریب المعنی پائے جاتے ہیں اول کس نے کہے؟ تو شاعری کی تاریخ کے بہت سے دقیق نکتے حل ہو جاتے۔ لیکن افسوس ہے کہ باوجود بہت سی جد و جہد کے اس بارے میں مجھ کو کچھ کامیابی نہیں ہوئی۔۔

دونوں حریفوں کے مرثیوں کو دیکھو تو صاف نظر آتا ہے کہ ایک نے دوسرے کے کلام کو سامنے رکھ کر لکھا ہے۔ لیکن زمانے کی تقدیم و تاخیر کے نہ معلوم ہونے سے یہ نہیں یقین ہوتا کہ ایجاد کا فخر کس کو ہے اور کس نے کس سے اڑایا ہے۔ میر انیس جا بجا فخریہ شعروں میں اس بات کا اشارہ کرتے ہیں کہ اُن کے حریف اُن کے کلام سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ [illegible] مرزا دبیر صاحب [illegible] کا جواب نہیں دیتے [illegible] یہ نہیں کہتے کہ میں نہیں، میرا حریف سرقہ کرتا ہے۔۔ [illegible]
جب [illegible] دوسرے کے مقابلے پر [illegible] جس تو خواہ مخواہ [illegible] مرزا [illegible]
ہم چشمی و مسابقت کی کوشش، میر صاحب ہی کی طرف سے ہوتی تھی۔" [2]

مندرجہ بالا نکات کے متعلق میں "صاحب المیزان" سے متفق ہوں کہ مسئلہ حل کرنا جس قدر دشوار ہے اُسی قدر غیر ضروری بھی ہے۔ دونوں صاحبوں کے محاسن کلام سے بحث کرنا اصلی مقصد ہے خواہ کسی نے پہلے شعر کہا ہو [illegible]

---

[1] آبِ حیات از مولوی شمس العلما، محمد حسین آزاد ص ۵۷
[2] موازنۂ انیس و دبیر ـــــ شبلی نعمانی
مرتبہ رشید حسن خاں ص ۳۱ و ۳۲
[3] المیزان ـــــ چودھری سید المحسن فوق ص ۲۳

اس سے بحث کرنا اور اس مسئلہ میں اُلجھنا قطعی غیر ضروری ہے۔ لیکن تقدیم و تاخیر کا مسئلہ اس عہد کی مشہور اور ترجمان تصنیف "فسانۂ عجائب" از رجب علی بیگ سرور سے کسی حد تک ضرور سلجھ جاتا ہے۔ سرور نے ایک مقام پر مرثیہ گو شعراء کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"مرثیہ گو بے نظیر، میاں دلگیر صاف باطن، نیک ضمیر، خلیق، فصیح، مرد مسکین، مکرر بات زمانہ سے بھی افسردہ نہ دیکھا۔ اللہ کے کرم سے ناظم خوب، دبیر مرغوب، سکندر طالع، بصورت گدا، بازِ احسان، اہلِ دول کا نہ اُٹھایا۔ عرصہ قلیل میں مرثیہ سلام کا دیوان کثیر فرمایا۔"[1]

رجب علی بیگ سرور کی مندرجہ بالا عبارت سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ دبیر کا کلیں فن کے ساتھ ساتھ مرثیہ گو شعراء کا بھی ذکر ہے لیکن انیس کا نام نہیں ہے۔ اس سے کسی حد تک ضرور تقدیم و تاخیر کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے یعنی فسانۂ عجائب کی تصنیف کے وقت (دورِ عہد نصیر الدین حیدر) دبیر کا شمار پختہ گو شعراء میں ہونے لگا تھا اور دلگیر کے ساتھ اُن کا ذکر بھی شامل ہے۔ اُس وقت تک انیس کی شاعری ابتدائی دور میں رہی ہوگی جس میں کوئی وزن و وقار نہیں پیدا ہو سکا ہوگا۔ بہر کیف یہ نتیجہ تو آسانی سے برآمد کیا جا سکتا ہے کہ اُس وقت تک انیس نے یا تو مرثیہ گوئی شروع نہیں کی تھی یا اُن کا کلام اس قابل نہیں ہو سکا تھا کہ دبیر کا ملیں فن کے تذکرہ مرثیہ گوئی کے ساتھ شمار کیا جائے۔ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ مرزا دبیر نے پہلے مرثیہ گوئی شروع کی تھی۔ اس اعتبار سے قریب المعنی مرثیوں کا قضیہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں کسی استدلال کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ہے لیکن اس قضیے کے فیصلے کے لئے یاران طریقت نے بڑی اُلٹ پھیر سے کام لیا ہے جن سے ان کی استدلالی کاوشیں مسخرہ پن کی اچھی مثال بن جاتی ہیں۔

استدلال یہ کیا جاتا رہا ہے کہ انیس جا بجا اس بات کا اشارہ کرتے ہیں کہ اُن کے حریف اُن کے مرثیوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ مثلاً:۔

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے گلشن کے خوشہ چینوں کو
—— انیس

یا

شکر خدا کہ سرقہ کی حد سے بعید ہوں
ہر مرثیے میں موجد طرزِ جدید ہوں
—— انیس

یا

ملتی نہیں دزدانِ معانی سے نجات
سچ ہے کہ مگس سے کب فکر بچتی ہے
—— انیس

ایسے یا اسی طرح کے اور دوسرے اشعار کے پیش نظر صاحب موازنہ نے استدلال کیا ہے کہ اس طرح کی چوٹوں کو سن کر مرزا دبیر صاحب برابر کا جواب نہیں دیتے یعنی یہ نہیں کہتے کہ میں نہیں، میرا حریف سرقہ کرتا ہے۔[2]

شبلی نعمانی نے بساطِ قیاس و ظن کی ایسی شاخِ نازک پر بچھائی ہے جس میں کوئی دم نہیں۔ اسی کے ساتھ موازنہ کرنے والے کا ایک طرفہ رُخ بھی سامنے آجاتا ہے۔ جب وہ دبیر کے صرف وہ شعر نقل کرتا ہے اور ایسے شعر جس میں طنطنہ نہیں بلکہ افہام و تفہیم کے پیش نظر اپنا دفاع پیش کرتا ہے لیکن اسی کے ساتھ دبیر نے بھی انیس ہی کی طرح

---

[1] فسانۂ عجائب از رجب علی بیگ سرور مرتبہ ڈاکٹر اظہر علی فرخ ص ۱۱۷

[2] موازنۂ انیس و دبیر —— شبلی نعمانی

[illegible] قدامت رکھتے ہوں گے لیکن
[illegible] اشعار کو دانستہ نظر انداز کیا
ہے۔ اس سے متعلق چند اشعار ملاحظہ ہوں:

رباعی

ہے شست کہ جست پر کلام اپنا ہے
لاریب خطا پوش امام اپنا ہے
جو بند کے بند قطع کر لیتے ہیں
اُن مرثیہ گویوں کو سلام اپنا ہے

دبیر

یا

سرقہ مضموں کا زبوں ہوتا ہے
یعنی علم نظم نگوں ہوتا ہے
پر اُن میں جو مندرج ہے حال شہدا
اس سے مرے مرثیوں کا خوں ہوتا ہے

دبیر

یا

شیران مضامیں کو کہاں بند کروں
گونجیں گے دہاڑیں گے جہاں بند کروں
خلاقی مضموں کا ہے دعویٰ سب کو
کھل جائے حقیقت جو زباں بند کروں

دبیر

یا

جو مصرع موزوں مرا مشہور جہاں ہے
البتہ توارد ہو تو حیرت کا مکاں ہے

دبیر

[illegible] ہے [illegible]
تازہ ہے [illegible] اور تازہ ہے تمہید
[illegible] مضامیں پہ نہ کر منع کی تائید
تو مجتہد نظم ہے فرض اُن پہ ہے تقلید

یہ اور اسی طرح کے بہت سے اشعار کلام دبیر میں ملتے ہیں جن سے یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ مرزا دبیر نے نہ صرف جواب دیئے ہیں بلکہ انیس ہی کی طرح کے انداز بھی اپنائے ہیں۔

... ...

دبیر اور انیس کے متحد المضامین مراثی کے عنوان کے تحت موازنہ نگاروں نے بڑے بڑے پیترے بدلے ہیں لیکن وہ یہ بھول گئے کہ موضوع کا اتحاد ہوتے ہوئے بھی مضامین شعر گوئی مختلف ہو سکتے ہیں۔ چونکہ میں دبیر اور انیس کے موازنہ کا قائل نہیں ہوں اس لئے مضامین کے اتحاد کے تحت بحث کرنا نہیں چاہتا ـــــ پھر بھی یہ کہتا چلوں کہ صنف سخن کے اعتبار سے مرثیہ ایک موضوع ہے تو کیا اس موضوع پر طبع آزمائی کرنے والے سبھی شعراء ایک ہی رجحانات کے حامل ہیں مثال کے طور پر سودا اور میر دونوں نے غزلیں بھی لکھی ہیں تو کیا ان دونوں کی غزل گوئی بہ اعتبار صنف سخن ایک ہی موضوع اور مضامین کی تابع ہے؟ غالب اور ذوق ہم عصر ہیں۔ دونوں نے صنف سخن کے لحاظ سے غزلیں بھی لکھی ہیں تو کیا غالب اور ذوق ایک ہی مضمون کے شاعر ہیں؟ دور نہ جائیے ناسخ اور آتش کو ہی لے لیجئے زبان کی حک و اصلاح، کثرت، ہیئت، تہذیبی، سماجی، معاشرتی، تاریخی اور فکری پس منظر کی روشنی میں ناسخ و آتش کو جدا نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ان دونوں نے غزلیں بھی لکھی ہیں تو کیا ناسخ اور آتش کا موضوع اور مضمون غزل گوئی ایک ہی ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے؟ تو پھر [illegible] کی تلاش اور دفتر کے دفتر [illegible] کرنا کیا فعل عبث نہیں ہے؟

دبیر اور انیس ایک حد تک شعر و انشا کو رکھتے ہیں اور نفس واقعہ کے اعتبار سے دونوں نے حضرت امام حسین علیہ السلام اور اہلبیت اطہار کی مدح و ثنا اور مصائب شدائد

نظم کئے ہیں لیکن نفس واقعہ کا اتحاد، نفس مضمون کے اتحاد کا سبب نہیں بن سکتا۔ ایک ہی واقعہ مضامین کے مختلف موضوعات پیدا کرتا ہے۔ واقعہ کی یکسانیت مضامین کی یکسانیت کا سبب نہیں بن سکتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انیس نے رزمیہ مضمون منتخب کیا اور دبیر نے مرثیت کا۔ رمحل استعمال، اصل روح مرثیہ نگاری کے پیش نظر کر کے صحیح معنوں میں مرثیہ گوئی کی مثال قائم کر دی۔ میرے لئے بڑی آسانی ہو جاتی اگر میں مراثی کا انتخاب بھی چاہ جاتا اور اس طرح سے مضمون طویل بھی ہو جاتا لیکن میں اس انداز مقالہ نگاری سے نفرت انحراف کر رہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اولاً تو میں مراثی کے ناظرے کے حق میں نہیں، دوسرے یہ کہ انیس اور دبیر کے متعدد مضامین اور قریب المعنی مراثی کے پیش نظر کافی تگ و دو کی جا چکی ہے۔ میں ارباب فکر و نظر کو مراثی دبیر کے مطالعہ کی بلا واسطہ دعوت دینا چاہتا ہوں۔

اہل علم بخوبی جانتے ہیں کہ المیہ (Elegy) اور رزمیہ (Epic) دو علاحدہ مضمون ہیں۔ دبیر نے موضوع سخن اور نقل واقعہ کو المیہ قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی "زبان دبیر" میں تحریر کرتے ہیں:

> شعر و ادب کا درک رکھنے والے اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ ٹریجڈی (المیہ) اصناف سخن میں سب سے مشکل صنف ہوتی ہے اور انتہائی ترقی یافتہ زبانوں میں المیہ شاعری بہت کم ملتی ہے۔ مرزا صاحب کا کمال شعری اس سے ظاہر ہے کہ انھوں نے تقریباً ایک ہزار مرثیے یعنی المیہ شہ پارے پیش کئے اور ان کا ہر مرثیہ ایسا ہے کہ سننے والے کو اشک افشانی پر مجبور کر دیتا ہے۔ ان کے کمال فن اور قدرت بیان کا یہ ایک زبردست ثبوت ہے اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انھوں نے محض ایک ہی واقعہ (واقعۂ کربلا) کو بار بار نظم کیا ہے اور ہر مرتبہ ندرت بیان کے سہارے اس میں تاثر پیدا کر دیا ہے تو ہمیں ان کی قوت تخئیل اور قدرت بیان کے سامنے سر خم کر دینا پڑتا ہے۔"[1]

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کے مندرجہ بالا بیان سے میں اس حد تک ضرور متفق ہوں کہ مرزا دبیر المیہ شاعر کا نام ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ کہ "انتہائی ترقی یافتہ زبانوں میں "المیہ" شاعری بہت کم ملتی ہے" سے مجھے اتفاق نہیں۔ زبان و ادب، معاشرہ، تہذیب چاہے جتنی بھی ترقی کر لے "طربیہ" اور "المیہ" سے اپنا منھ موڑ نہیں سکتی۔ انسانی فطرت اور انسانی نفسیات کے تقاضوں کو نہیں بدلا جا سکتا ہے۔ خوشی اور رنج انسانی فطرت کا ہی نتیجہ ہیں۔ جس میں ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ کی کوئی قید نہیں۔ معلوم نہیں ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے کیسے یہ نتیجہ برآمد کر لیا کہ انتہائی ترقی یافتہ زبانوں میں المیہ شاعری بہت کم ملتی ہے۔ جب کہ یہ متفقہ فیصلہ ہے ارسطو نے اپنی تصنیف "بوطیقا" میں بھی تسلیم کیا ہے کہ "المیہ شاعری" اور "رزمیہ شاعری" سے افضل ہے۔ ملاحظہ ہو:

> "ان تمام باتوں میں ٹریجڈی (المیہ) رزمیہ (Epic) شاعری سے افضل ہے اور اگر

---

[1] زبان دبیر۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی ص ۱۵۸، ۱۵۷
اشاعت مئی ۱۹۶۶ء

[illegible] من حیثیت الفن زیادہ ایسی چیز ہے کہ [illegible] . . . تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ٹریجڈی مقابلتاً افضل اور بہتر ہے۔ وہ اپنے مقصد کی بہتر طریقے پر تکمیل کرتی ہے۔" [1]

دبیر میں المیہ پہلوؤں کی مرثیہ نگاری کے فن کی ہر منزل میں نظر آتے ہیں، خواہ وہ میدان کارزار ہو یا ذوالفقار کی برش، چاہے ذوالجناح کی سرعت رفتار ہو یا شجاعت کی رفعتیں، یا صبر و استقلال کی منزل ہو یا سیدانیوں کی اشک فشانی، رخصت ہو یا رزم، مجموعی طور پر دبیر "مرثیت" کو اپنی مرثیہ نگاری کی دسترس سے باہر نہیں جانے دیتے ہیں۔ میرے نقطۂ نظر سے دراصل یہی "دبیریت" ہے جس سے خاک و خون میں تھرے ہوئے مناظر سنگدلوں کو بھی رلا دیتے ہیں۔ میں نے اپنی شاعری کی ابتدائی منزل میں دبیر اور انیس کے مراثی، سلام، اور رباعیاں پڑھی ہیں لیکن جو تاثر دبیر کے مراثی اہل مجلس پر قائم کرتے تھے اور آل مجلس کا سبب بنتے رہے وہ انیس کے نہیں۔ ہاں! زبان کی نظافت، منظر کشی کی بھبھن، رزمیہ عناصر، معرکۂ جنگ و جدل کی شدت مراثی انیس کی روح ہیں لیکن باعتبار موضوع "مرثیہ" کا آل گریہ و بکا ہے اور اس بنیادی خصوصیت کا نمائندہ دبیر ہے۔ دبیر کی مندرجہ ذیل رباعیاں ملاحظہ ہوں ؎

جو نجسِ ماتم میں یہاں روتا ہے
مرقد شہ دیں کے خدا ہوتا ہے
ثابت ہے حدیثوں سے کہ یہ قطرۂ اشک
ہر زخم حسینؑ کی دوا ہوتا ہے

ہر چند ہزار سال آدم روئے
یعقوب بھی فرزند کو پیہم روئے
جس دم کیا حاسبان قدرت نے حساب
سجادؑ کے رونے سے بہت کم روئے

یا

اس بزم کو دعوٰی ہے کہ جنت میں ہوں
آنسو میں رواں کہ بحر رحمت میں ہوں
کہتا ہے یہ دل سے وہ ہم داغ حسینؑ
گنجینۂ مغفرت کی قیمت میں ہوں

مندرجہ بالا رباعیات کی روشنی میں دبیر کی مرثیہ گوئی کا موضوع سخن، اور مضمون نگاری آسانی سے سمجھی اور سمجھائی جا سکتی ہے کیونکہ ان میں دبیر نے خود اپنی مرثیہ نگاری کا آل اور ماحصل پیش کر دیا ہے جس میں "دبیریت" کا منفرد پہلو نمایاں ہو جاتا ہے اور گزشتہ ادوار کے ناقدین کی سہل انگاری بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ بنی بنائی ڈگر کے سالک سہل پسندی کو راہ نما بنا کر ایک ہی بات کو مختلف انداز سے دہراتے رہے ہیں جس سے مسائل سمجھنے کے بجائے الجھتے رہے ہیں یا یوں کہہ دیا جائے کہ غلط روایت کی سند مختلف زمانوں میں جمہوری نظام کے تحت پیش کرتے رہے ہیں جس میں صداقت نام کو نہیں۔ "دبیریت" اور "انیسیت" کی افہام و تفہیم مفسر کے آس پاس سے کم نہیں جس کے لئے ہمارے نام نہاد ناقدین اور محققین تیار نہیں۔

انیس صدی تقریبات کے سلسلے میں بھی کوئی ایسی تصنیف یا تالیف منظر عام پر نہ آ سکی جسے اس صدی کا پیش بہا تحفہ قرار دیا جائے۔ اس طرح دبیر کے متعلق بھی کام کی رفتار سست رہی ہے۔ ایسے کام کی سخت ضرورت ہے جس میں انیس اور دبیر کی شخصیت اور فن کو مسلم الثبوت بنا کر پیش [illegible]

---

[1] بوطیقا۔ ارسطو ص ۱۰۱-۱۰۰ مترجمہ عزیز احمد ۱۹۶۱ء

[illegible] کیا جائے جو روایتی موازنہ اور مناظرہ سے بلند و بالا ہو [illegible] فکر و فن کی تلاش کا کامیاب نمونہ ہو۔

کاظم علی خاں

دبیر کی مرثیہ نگاری

محرکات و مؤثرات

ادب اگر خلا کی پیداوار نہ ہو تو ہر عصری ماحول کا زائیدہ نہ ہو تو ادیب یا شاعر کی شخصیت کا مظہر ہوتا ہے تو مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری بھی ان ہی عناصر کی ترجمان ہے۔ ان اہم خارجی اور داخلی محرکات کا تجزیہ کرنا پڑے گا جو مرزا صاحب کی مرثیہ گوئی کے لئے محرکات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مرزا سلامت علی دبیر (متولد دہلی ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء) اپنے والد مرزا غلام حسین کے ہمراہ جب تقریباً سات برس کے سن (۱۸۱۰ء) میں لکھنؤ آئے تو یہاں ان کے متعدد پیش رو مرثیے کی توسیع و ترقی کے لئے راہ کو ہموار کر رہے تھے۔ مرزا صاحب مشہور مرثیہ نگار میر ظفر حسین ضمیر (متوفی ۱۸۵۵ء) کے شاگرد ہوئے۔ میر ضمیر اردو مرثیہ کی تاریخ میں دور تعمیر کے صف اول کے مرثیہ نگار تھے۔ ضمیر جیسے ماہر استاد کو دبیر جیسا باصلاحیت شاگرد مل جانا دونوں کے لئے سہاگا ثابت ہوا۔

استاد کی تربیت کے علاوہ دبیر کی مرثیہ نگاری میں متعدد علماء و مشاہیر کا فیض بھی شامل نظر آتا ہے۔ مجتہد العصر زائر الزمان سلطان العلماء سید محمد صاحب اور سید العلماء میر علی صاحب سے دبیر کے گہرے روابط رہے ہیں۔ ان دونوں مذہبی ہستیوں کی مدح دبیر نے اپنے اس مرثیے میں بھی کی ہے جس کا مطلع ہے ؎

"طغرا نویس کن فیکوں ذوالجلال ہے"

مولانا مفتی سید محمد عباس صاحب مرحوم عہد دبیر کے صف اول کے عالم دین تھے اور ان سے مرزا دبیر کے گہرے تعلقات کے ثبوت مولانا مفتی صاحب کے سوانح حیات "تجلیات" میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ دبیر نے اپنے زمانے کی جن جلیل ہستیوں سے فیض تعلیم حاصل کیا تھا ان میں مولانا مرزا کاظم علی ، صاحب ملا مہدی صاحب مجتہد مازندرانی وغیرہ جیسے پابند شرع علمائے دین بھی شامل تھے۔ ان تمام مذہبی حضرات کے فیض صحبت نے بھی دبیر کو مرثیہ جیسی مذہبی صنف کی جانب متوجہ کیا ہوگا۔

مرزا دبیر کے صحیفۂ حیات کی ورق گردانی کرنے پر ہم اس نتیجے تک پہنچ سکتے ہیں کہ مرزا صاحب ایک محتاط، اصول و پابند شرع انسان تھے۔ مذہب مرزا دبیر کے صحیفۂ حیات کا ایک اہم باب ہی نہیں بلکہ اس کتاب کے ہر ورق پر مذہب کی گہری چھاپ ملتی ہے۔ سیرت و شخصیت، افعال و اقوال، عقائد و نظریات، افکار و خیالات، عادات و اطوار، گفتار و کردار غرض کہ جس اعتبار سے دیکھا جائے، مرزا دبیر کی حیات و سیرت کا ہر پہلو مذہب سے گہری وابستگی رکھتا ہے۔ زندگی کی

[illegible] تخلیقات پر بھی مذہب غالب نظر آتا ہے
[illegible] زندگی کے گہرے رشتے کی تفسیر و تصدیق کے
[illegible] ہے جس طرح زندگی کے میدان میں دبیر نے مذہب
کے دائرے سے باہر نکلنا مناسب نہ سمجھا اسی طرح ادب کے
میدان میں بھی وہ عام طور پر مذہب کے احاطے میں ہی رہے
[illegible] سلام، نوحہ، مرثیہ، مخمس اور مرثیے کے علاوہ دبیر
نے اپنی مثنویوں میں بھی مذہبی موضوعات سے سروکار رکھا
ہے حتیٰ کہ اردو نثر میں دبیر کی غیر معروف کتاب
ابواب المصائب بھی سورۂ یوسف کی تفسیر ہے جس کو
جگہ جگہ ربط مصائب دے کر ذاکری کی کتاب کی شکل دی
گئی ہے۔

دبیر کی مرثیہ گوئی جن عوامل و محرکات کی رہین منت
نظر آتی ہے اُن میں ضمیر کی شاگردی اور علمائے دین کی صحبت
کے [illegible] ساتھ مرثیے کے لئے لکھنؤ میں اس رازگار ماحول
کی کارفرمائی بھی شامل رہی ہے جس کے زیر سایہ عہد دبیر
[illegible] عزاداری کے لئے ایک زبردست مرکز کی حیثیت
اختیار کر چکا تھا۔ یہاں اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے
کہ شمالی ہندوستان کے مختلف قصبوں میں تعزیہ داری
لکھنؤ سے قبل رائج ہو چکی تھی جیسا کہ تاریخ مسلمانان
پاکستان و ہند کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے

"چند تورانی خاندانوں کے اسواد مغل،
دربار کے اکثر عمائد انہی (شیعہ) عقائد
میں راسخ تھے۔ بہت سے مرد و زن مغل
امیروں کی طرح [illegible] تھیں۔ سندھ
سے بنگال تک شمالی ہندوستان میں جتنی
ریاستیں قائم ہوئیں اُن میں اکثر شیعہ
خاندانوں کی میراث تھیں۔ مشائخ، صوفیہ
[illegible] نقش بندیوں کے بجز سبھی خاندانے
حضرت علی ابن ابی طالبؑ سے شجرہ ملاتے
[illegible] تھے اور تعزیت کا [illegible] اور تعزیت کا
[illegible] تھے۔ [illegible]
قرار دیتے تھے۔ اہل بیت [illegible]
[illegible] لئے جاتے تھے۔ [illegible]
کے علاوہ ہندوستان [illegible] عام
طور پر شیعوں کے ہم آہنگ [illegible]
کی تعزیہ داری شیعوں کے ہاں بھی بڑی پابند
اور شدومد سے منائی جاتی تھی۔ [illegible]
[illegible] کی شکل [illegible] کا بھی [illegible] اور عام
[illegible] رکھتے تھے۔"

لکھنؤ سے قبل شمالی ہند کے [illegible]
کے رواج کے باوجود اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا
اودھ کے حکمرانوں کی سرپرستی میں تعزیہ داری نے [illegible]
جتنا فروغ پایا اس کی مثال کہیں [illegible]۔ دبیر کی مرثیہ گوئی
[illegible] کو بڑی حد تک لکھنؤ کی اسی عزاداری کی رہین منت سمجھا
[illegible] دبیر کی مرثیہ گوئی پر گفتگو کرتے وقت لکھنؤ [illegible]
کے فروغ کی کہانی پر بھی نظر رکھنا مناسب ہوگا۔

عام خیال یہ ہے کہ لکھنؤ میں عزاداری کا رواج اور
امام باڑوں کی تعمیر کا آغاز اس وقت سے ہوا جب نواب
شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد اُن کے فرزند نواب آصف الدولہ
نے ۱۱۸۹ھ/۱۷۷۵ء میں اودھ کے پایۂ تخت کو فیض آباد سے
لکھنؤ منتقل کیا لیکن سید کمال الدین کے مندرجہ ذیل بیان
سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عہد شجاع الدولہ میں بھی لکھنؤ میں
[illegible] موجود تھے۔ کمال الدین سید نے
لکھا ہے:

"آغا باقر خاں عرف آغا اسمٰعیل دلاور جنگ
کے تھے۔ نواب شجاع الدولہ کے عہد دولت
میں رسالدار پانچ [illegible]

آغا اسمٰعیل کے کارندے تھے . . . آغا اسمٰعیل نے عمو سے کہا کہ تم قریب مسافر خانہ ایک امامباڑا بنوا دو۔ اُس زمانے میں سوائے آغا ابوطالب خاں کے امامباڑے کے دوسرا امام باڑا شہر (لکھنؤ) میں نہ تھا۔[۵۸]

تاریخ ہند کے صفحات میں ہمیں ایک ایسا واقعہ بھی درج ملتا ہے جس سے عزاداری کے لئے نواب شجاع الدولہ کے شغف کا پتہ چلتا ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ انوپ شہر کے مقام پر نواب شجاع الدولہ جب احمد علی شاہ ابدالی کے ہمراہ ہمسفر تھے تو اگست ۱۷۶۰ء میں عشرۂ محرم کے دوران میں ایک روز نواب وزیر نے اپنے رفقاء کی مدد سے ایک مجلس عزا کا اہتمام کیا۔ اس جلوس میں نواب شجاع الدولہ بھی شامل تھے۔ جلوس کا رنگ سراسر برہنہ پا تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں علم، زبان پر مرثیے اور ماتم کی صدائیں اور جسموں پر سیاہ ماتمی لباس تھے۔[۵۹]

شجاع الدولہ کی وفات کے بعد اُن کے فرزند نواب آصف الدولہ (۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء)[۶۰] نے اودھ کے پایۂ تخت کو ۱۷۷۵ء میں جب فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کیا تو لکھنؤ میں عزاداری کو زبردست تقویت ملی۔ لکھنؤ میں عہد آصفی کے دوران میں تعزیہ داری کے اس زبردست فروغ میں مولانا دلدار علی صاحب (غفران مآب) (۱۱۶۶ھ - ۱۹ رجب ۱۲۳۵ھ)[۶۱] اور سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں، نائب آصف الدولہ کی کوششیں بھی شامل رہی ہیں۔ نواب حسن رضا خاں کے مکان پر ہی مولانا دلدار علی صاحب نے ۱۳ رجب ۱۲۰۰ھ (۱۳ مئی ۱۷۸۶ء) کو لکھنؤ میں شیعہ فرقے کی پہلی نماز ظہر بہ جماعت قائم کی اور اس کے دو ہفتے بعد مولانا دلدار علی صاحب نے ہی ۲۷ رجب ۱۲۰۰ھ (۲۶ مئی ۱۷۸۶ء) کو لکھنؤ میں شیعوں کی پہلی نماز جمعہ جماعت کی امامت کے فرائض سرانجام دیئے۔[۶۲]

سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں نے عہد آصف الدولہ میں لکھنؤ کی مشہور درگاہ حضرت عباس کی بنا کی جو بعد میں مختلف موقعوں پر توسیع و تجدید کے مراحل سے گزرتی رہی۔ سرفراز الدولہ کی تجویز پر ۱۷۸۵ء میں لکھنؤ کے شاندار تاریخی حسینیۂ آصفی کی تعمیر کا آغاز ہوا جس کی تکمیل ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰-۹۱ء میں عمل میں آئی تھی۔[۶۳] ۱۲۱۰ھ/۱۷۹۵ء میں مولانا دلدار علی صاحب نے اپنا وسیع عزاخانہ حسینیۂ غفران مآب تعمیر کرایا۔[۶۴] عہد آصفی میں درگاہ حضرت عباس، حسینیۂ آصفی اور غفران مآب کے امام باڑے نے . . . . . لکھنؤ میں تعزیہ داری اور مجالس عزا کے رجحان کو کافی فروغ عطا کیا۔

نواب وزیر اودھ نواب سعادت علی خاں کے عہد (۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء تا ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء)[۶۵] میں لکھنؤ کی مشہور تال کٹورے کی کربلا تعمیر ہوئی۔[۶۶] نواب سعادت علی خاں کے فرزند غازی الدین حیدر کے زمانۂ حکومت (۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء تا ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء)[۶۷] کے دوران [۱۲۳۲ھ/۱۸۱۶-۱۷ء] میں حسینیہ شاہ نجف کی تاریخی عمارت بنی جو حضرت علیؑ کے روضہ کی شبیہہ ہے۔[۶۸] غازی الدین حیدر کے مذہبی انہماک پر وقائع دل پذیر میں مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔[۶۹]

غازی الدین حیدر کے زمانہ میں شرف الدولہ غلام رضا خاں نے لکھنؤ میں روضۂ کاظمین تعمیر کرایا۔[۷۰] غازی الدین حیدر کی خاص محل بادشاہ بیگم جس زبردست اہتمام و انتظام سے شاہانہ جلوس کے ساتھ درگاہ حضرت عباس جایا کرتی تھیں وہ لکھنؤ کے مذہبی رجحان کا مظہر ہے۔ بادشاہ بیگم کی ایسی ہی ایک سواری کا تفصیلی آنکھوں دیکھا حال ایک یورپی خاتون مسز حسن علی نے بیان کیا ہے۔[۷۱] غازی الدین حیدر کے وزیر معتمد الدولہ آغا میر نے بھی محلہ زیبی لکھنؤ میں ایک کربلا اور ڈیوڑھی آغا میر میں ایک امام باڑا تعمیر کرایا تھا۔[۷۲] اس امام باڑے کی عمارت میں ہی آج کل گورنمنٹ جبلی انٹر کالج لکھنؤ قائم ہے۔

عہد نصیر الدین حیدر (۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء تا ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء) میں

ولیم نائٹن کا مندرجہ ذیل
نصیر الدین حیدر کے مذہبی شغف کو سمجھنے میں معاون
ثابت ہوتا ہے:

"محرم آگیا اور کامل چالیس دن تک ہم
لوگ دربار سے الگ تھلگ رہے۔ کبھی کبھار
دربار صبح کا ہی میں اتفاقاً بادشاہ (نصیر الدین
حیدر) کی زیارت ہو جاتی تھی۔ عزاداری کی
وجہ سے تاج رنگ اور انگریزی وضع میں یکقلم
بند تھیں۔ وجہ یہ تھی کہ بادشاہ نے اپنی تخت نشینی
سے پیشتر منت مانی تھی کہ اگر مجھے تخت شاہی
نصیب ہوگا تو میں بجائے عشرے کے اربعین
(چہلم) تک عزاداری کیا کروں گا۔ چنانچہ
وہ اسی عہد پر سختی سے قائم ہیں۔" [۲۴]

ولیم نائٹن کی اس معاصر شہادت کے علی الرغم مانند
کی زبان دہی کئے بغیر سفارش حسین رضوی کا یہ بیان نظر ثانی
کا محتاج ہے کہ "لکھنؤ کے بادشاہ تخت کے لئے منتیں مانتے
تھے۔ ایسی ہی ایک منت پوری کرنے کے لئے غازی الدین حیدر
نے عزاداری کو ترقی دے کر چہلم تک بڑھایا" [۲۵] اپنی منت کے
تحت لکھنؤ میں عزاداری کو اربعین کے جس بادشاہ نے چہلم
تک بڑھایا تھا وہ غازی الدین حیدر کے بجائے ان کے فرزند
نصیر الدین حیدر تھے جیسا کہ ولیم نائٹن کے محولہ بیان سے
ظاہر ہے۔ ولیم نائٹن کے اس بیان کی تصدیق مرزا رجب علی
بیگ سرور (متوفی محرم ۱۲۸۹ھ / اپریل ۱۸۷۲ء) [۲۶] کے مندرجہ ذیل بیان
سے ہو جاتی ہے جو نصیر الدین حیدر کے شغف عزاداری کے
بارے میں معاصر شہادت کی حیثیت رکھتا ہے۔ نصیر الدین حیدر
کے بارے میں سرور کا بیان ہے:

"اس عیش پسندی پر عشرۂ محرم
میں یہ حال تھا کہ راہ چلنا کہ مسکرانا محال
تھا۔ روز و شب غم اہل بیت میں روتا اربعین
تک زمین پر سوتا، لباس آبی یا سیاہ، ہر دم
نالہ و آہ۔ ہزار ہا روپیا اور جہان کی نعمت
مرثیہ خواں اور سید محتاج آب و نان پاتے
تھے۔ تحصیل حسنات و ثواب فرماتے تھے۔
دوازدہ امام کی درگاہ، صاحب الامر کا نام
بنوایا، لاکھوں روپے کا اسباب چڑھایا۔" [۲۷]

نصیر الدین حیدر کے شغف عزاداری کے بارے میں
میر ضمیر کی مندرجہ ذیل منظوم شہادت بھی ملاحظہ ہو:

محرم کے عشرے میں کیا زار زار
یہ روتا ہے مانند ابر بہار
غم آل احمد میں ہے دل حزیں
یہ پوشش رہا ہے [illegible]
[illegible] نصیر الدین حیدر [illegible] بادشاہ کی یادگار ہے
جو آج بھی [illegible] لکھنؤ کے ریلوے اسٹیشن کے [illegible]
موجود ہے اور اسی کربلا کی طرح آراستگی پر آج بھی شہر لکھنؤ کا
لکھنؤ بنا ہوا ہے۔ نصیر الدین حیدر کی ایک بیگم دلاب [illegible]
کا تعمیر [illegible] عالیشان عزاخانہ ۱۲۳۶ھ میں بنایا [illegible] اس امام باڑے
کے نیچے کھنڈر آج بھی گوجن روڈ لکھنؤ پر واقع ہے۔ اس
لانڈری کے عقب میں موجود ہیں۔ ملکہ زمانہ کے اس عزاخانہ
میں دو تیرہ مرثیے پڑھوائے جایا کرتے تھے۔ ملکہ زمانہ کی
بیٹی سلطان عالیہ تخلص بلقیس کو فن شاعری کا شوق تھا اور
وہ مرزا دبیر کی عزیز شاگرد تھیں۔ [۲۸] مقبرۂ سلطان عالیہ
آج بھی لکھنؤ کے محلہ گولہ گنج میں مشہور و موجود ہے۔ نصیر الدین
حیدر کی ایک اور بیگم ممتاز الدہر نے بھی محلہ گولہ گنج آغا میر
لکھنؤ میں ایک امام باڑہ بنوایا تھا۔ [۲۹]

نصیر الدین حیدر کے بعد عہد محمد علی شاہ [۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء
تا ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء] کے دوران میں ۱۲۵۳ھ / ۲۰ لاکھ روپے کی کثیر
معاونت سے حسین آباد کا عظیم الشان تاریخی امام باڑہ تعمیر ہوا۔
محمد علی شاہ نے حسین آباد کے امام باڑے میں عزاداری اور

دو سو روپیہ تنخواہ کے لئے ۲۰ لاکھ روپے سے ایک زنف بھی تمام کر دیا۔ حسین آباد کے عزاخانے کی تعریف و توصیف میں جس عہد کی جن مشہور ادبی ہستیوں نے منظوم و منثور عقیدت کے نذرانے پیش کئے ہیں۔ اُن میں ناسخ لکھنوی، دلگیر اور رجب علی بیگ سرور بھی شامل ہیں۔ ناسخ لکھنوی نے حسین آباد کے امام باڑے کی جو تاریخ کہی تھی وہ ذیل میں درج کی جاتی ہے:۔

جناب محمد علی بادشاہ — پسندیدۂ بارگاہ الٰہ
بنا جب کہ صاحب قرینہ خانہ است — بنا از سما قرینہ خانہ است
خرد سال جائے عزائے حسین
بگفتا مزار شہ مشرقین
(۱۲۵۳ ہجری)

حسین آباد کے عزاخانے کی توصیف میں مشہور مرثیہ نگار دلگیر کے بھی متعدد منظوم بیانات موجود ہیں۔ حسین آباد کے امام باڑے میں منعقد ہونے والے مذہبی اجتماعات کے بارے میں میاں دلگیر (متوفی ۱۲۶۴ھ) کا بیان جو آنکھوں دیکھے حال کا درجہ رکھتا ہے۔ دلگیر کی ایک مثنوی سے ذیل میں منقول ہے:۔

غنی دیکھوں ہوئے خلقت ہے آگاہ
حسین آباد کے صدقے سے واللہ
وہاں کا ہے وہ عالی کارخانہ
کہ فیض اللہ زد ہے سارا زمانہ
حسینیں آٹھویں دن کی ہے محفل
ہر اک کو اس سے ہے اک فیض حاصل
خدا کے فضل سے رہتی ہے کثرت
سدا مجلس میں ہے اک جوش و رقت
جو ذاکر خوب ہیں سارے جہاں کے
بہ حکم شہ ہیں خواندے وہاں کے
رواج سلطنت سے زیادہ

نہ کثرت کیوں کہ ہو حد سے زیادہ
ہوا ہے شاہ کا یوں حکم صادر
کہ سب ارکان ہوں مجلس میں حاضر
ہے سب شہزادوں کو بھی حکم پہنچا
کہ آئیں وقت پر مجلس میں اس جا

رجب علی بیگ سرور عینی شاہد کی حیثیت سے حسین آباد کے امام باڑے کی شان و شوکت یوں بیان کرتے ہیں:۔

"اور حسین آباد کے امام باڑے کی بنا ہے بزرگ سے مثال ہلال عید نمایاں ہے۔ جل جلالہ کیا شوکت و صولت ہے! برج طلائی خورشید نمط درخشاں ہے ..... ماتم خانۂ شاہ شہیدا ہے۔ جس دم عزیز پاک نظر آئی، دل تڑپ، دیدہ جیحون ہو اچھلا بھر آئی ..... ہزار در ہزار علم ہائے نادر جن کے دیکھنے سے الم آب حبا ہو۔ خلاصہ یہ کہ امام باڑا ہو تو ایسا ہو۔ صحن میں حوض مصفا، پانی سے لبالب بھرا، تشنگی اہلبیت کی لہروں سے یاد دلاتا، ڈبڈبائی آنکھ سے کم نہیں۔ کسی چیز کو حسین علیہ السلام کا غم نہیں ..... "

محمد علی شاہ کی زوجہ ملکۂ آفاق نے بھی محمد علی شاہ کے عہد حکومت میں ایک کربلا تعمیر کرائی جو ملکۂ آفاق کی کربلا کے نام سے موسوم اور شیعہ کالج، ڈالی گنج لکھنؤ کے قریب آج بھی موجود ہے۔ اس کربلا کو عسکریین بھی کہا جاتا ہے۔ عہد محمد علی شاہ میں ہی ۱۲۵۳ھ میں محلہ چوک کے قریب میر باقر سوداگر کا امام باڑا بھی تعمیر ہوا جس میں میر ضمیر اور مرزا دبیر مجلسیں پڑھا کرتے تھے۔ سوداگر کا امام باڑا آج بھی اچھی حالت میں موجود ہے۔

محمد علی شاہ کے بعد اُن کے فرزند امجد علی شاہ کے دور حکومت

[illegible] میں لکھنؤ میں مذہبیت کو بہت زیادہ فروغ ہوا۔ لکھنؤ میں حضرت گنج کے قریب سبطین آباد کا امام باڑا اسی بادشاہ کی یادگار ہے جو بادشاہ کے انتقال کے بعد اُن کے جانشین واجد علی شاہ نے دس لاکھ روپے کے مصارف سے بنوایا تھا۔[illegible] امجد علی شاہ کے زمانے میں علمائے دین کو بڑا عروج حاصل تھا۔[illegible] اسی زمانے میں تال کٹورے کی کربلا کے نزدیک کربلائے عظیم اللہ خاں ۱۲۴۰ھ میں تعمیر ہوئی۔[illegible]

امجد علی شاہ کی وفات کے بعد واجد علی شاہ کے عہد حکومت [۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء تا ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء] میں بھی لکھنؤ میں عزاداری کو برابر فروغ رہا۔ واجد علی شاہ فنونِ لطیفہ کے شوقین کے ساتھ ساتھ مذہبی شغف بھی رکھتے تھے۔ واجد علی شاہ کے مذہبی انہماک کے بارے میں اُن کے ہم عصر رجب علی بیگ سرور کا بیان ہے:۔

"... تقویٰ ذاتِ اقدس سے تقویت رکھتا ہے۔ زہد و ورع کو بصد ناز ہے، عین عالمِ شباب میں سلطان مقید روزہ و نماز ہے ..."[۴۵]

واجد علی شاہ اختر کے منظومات میں مراثی بھی موجود ہیں۔[۴۶] شرر لکھنوی کے مطابق واجد علی شاہ نے سیکڑوں مرثیے اور سلام کہے تھے۔[۴۷] واجد علی شاہ کے صحیفۂ حیات کی ورق گردانی کرنے پر ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اودھ کے اس تاجدار نے دوسرے شعراء کے ساتھ ساتھ مرثیہ نگاروں کی بھی بہت افزائی اور قدردانی میں کمی نہ کی تھی۔ جیسا کہ مرزا دبیر کے لئے واجد علی شاہ کی اس بیت سے ظاہر ہے ؎

بچپن سے ان کے دامِ سخن کا اسیر ہوں
میں کم سنی سے عاشقِ نظمِ دبیر ہوں[۴۸]

واجد علی شاہ (متوفی ۱۸۸۷ء)[۴۹] اور میر زا دبیر (متوفی ۱۸۷۵ء) کے ہمعصر مولانا عبد الحلیم شرر لکھنوی (متولد ۱۸۶۰ء)[۵۰] نے گزشتہ لکھنؤ کی عزاداری اور اُس کے لوازم کا چشم دید حال بیان کرتے ہوئے ذیل میں جو کچھ تحریر کیا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہان اودھ اور امراء کے علاوہ عزاداری، سوز، مرثیوں اور نوحوں کی عوام میں بھی زبردست مقبولیت تھی۔ مولانا شرر لکھنوی کے بیان کے ضروری حصے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

"جس طرح مذہبی سرگرمی نے شاعری میں مرثیہ گوئی اور تحت اللفظ خوانی کو پیدا کیا اُسی طرح موسیقی میں سوز خوانی پیدا کر دی پھر ان دونوں فنوں کو یہاں تک ترقی دی کہ مستقل فن بن گئے اور ایسے فن جو ابتدا سے انتہا تک لکھنؤ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ تحت اللفظ خوانی مرثیوں کا متانت اور بے تکلفی کے ساتھ اس طرح پڑھنا اور بتا بتا کر سنانا ہے جس طرح شاعر مشاعرے میں غزل سناتا ہے اور سوز خوانی اُن کو پُرسوز و گداز نغمے کے ساتھ سُناتا ہے۔ اصلی اور پُرانی مرثیہ خوانی سوز خوانی ہی تھی یعنی مرثیے مجلسوں میں ہمیشہ نغمے کے ساتھ سُنائے جاتے تھے اور اُن کا رواج دہلی ہی (میں) نہیں ہندوستان کے اُن تمام شہروں میں تھا جن میں شیعہ حضرات آباد تھے ... مرثیوں کو شاعروں کی شعر خوانی کے لہجے میں ادا کرنا خاص لکھنؤ کی ایجاد ہے اور اس میں میر انیس اور مرزا دبیر وغیرہ نے جو کمالات دکھائے اُن کا ذکر ہم شاعروں کے سلسلے میں کر چکے ہیں۔ سوز خوانی اگرچہ پہلے سے تھی اور ہر جگہ تھی مگر اُس میں لکھنؤ کے سوز خوانوں نے ایسے ایسے کمال دکھائے کہ اس فن کو بھی

اپنے ساتھ مخصوص کرلیا۔۔۔ لکھنؤ میں
سوز خوانی کا فن گویوں سے نکل کے شرفا میں
آگیا۔ یہ با اصول اور باقاعدہ نوحہ خوانی
عورتوں میں پہنچی تو اس میں قیامت کی دلکشی
پیدا ہوگئی اور چند روز میں شیعہ ہی نہیں ادنیٰ
طبقے کی سنیوں کی عورتوں میں بھی نوحہ خوانی
کا شوق پیدا ہوگیا۔۔۔ سُنّی اور شیعہ دونوں
گروہوں کے گھروں میں نوحہ خوانی کے شوق
میں تعزیہ داری ہونے لگی اور سُنّی مسلمان ہی
نہیں ہزارہا ہندو بھی تعزیہ داری اختیار
کرکے نوحہ خوانی کرنے لگے۔"

لکھنؤ میں عزاداری اور مجالس کے زبردست فروغ
کے بارے میں مولانا شرر لکھنوی مزید لکھتے ہیں:۔

"آداب صحبت میں دوسری چیز مذہبی
صحبتیں یعنی عزاداری کی مجلسیں اور
مولود شریف کی محفلیں ہیں۔ مجلسوں کا
عام رواج شیعوں میں ہے اور مولود شریف
کا سُنیوں میں۔ اگرچہ دونوں میں دونوں فرقوں
کے لوگ شریک ہوتے ہیں بلکہ یہ بھی ہوتا
ہے کہ کبھی بعض محب اہل بیت سُنّی مجلس عزا
کرتے ہیں اور شیعہ حضرات کے یہاں مولود
شریف کی محفل ہوتی ہے مگر لکھنؤ کی خاص
چیز جس نے لکھنؤ کی سوسائٹی پر اثر ڈالا اور
نیز سوسائٹی اس سے متاثر ہوئی وہ مجلسیں
ہیں۔ مولود کی محفلوں میں کوئی خصوصیت
نہیں جیسی سارے ہندوستان میں ہوا
کرتی ہیں یہاں بھی ہوتی ہیں گو اس میں
شک نہیں کہ بعض امراء کے یہاں مولود
میں بھی قریب قریب وہی بناوٹ وتہذیب
نظر آتی ہے جو شیعوں کی شائستگی کی وجہ سے
ہے مجالس میں ہوا کرتی ہے۔ عزاداری کی
مجلسیں بہت کثرت سے ہوتی ہیں اور اگر
کوئی شخص چاہے اور پتہ لگاتا رہے تو سال
بھر۔۔۔ محض مجالس کی شرکت سے اپنا
پیٹ پال سکتا ہے اور فیاض و عقیدت مند
شیعوں کی فیاضی پر جی سکتا ہے۔ مجالس ہی
کی برکت ہے یہاں مختلف قسم کے ذاکر پیدا
ہوگئے جو جدا جدا عنوانوں سے مصائب
سید الشہداء علیہ السلام کو بیان کرکے روتے
رلاتے ہیں۔۔۔ مرثیہ خوانی کی ضرورت
دبیر نے میر انیس اور مرزا دبیر پیدا کئے
جو کمال شاعری کے اعلیٰ ترین شہ نشین پر
پہنچ گئے۔ یا تو یہ مثل مشہور تھی کہ بگڑا شاعر
مرثیہ گو یا لکھنؤ کے کمال مرثیہ گوئی نے سارے
ہندوستان سے منوالیا کہ عالم شعر و سخن میں
مرثیہ گوئی کا رتبہ دیگر اصناف سخن سے بڑھا
بڑھا ہوا ہے۔ قدر دانی نے بیسیوں مرثیہ گو
اور صدہا مرثیہ خوان پیدا کر دیئے جو محرم
اور دیگر ایام عزاداری میں لکھنؤ سے نکل
کے ہندوستان کے طول و دور دراز میں پھیل
جاتے ہیں اور وہاں کی صحبتوں میں اپنے
کمالات کا سکہ بٹھا کے واپس آتے ہیں۔۔
لکھنؤ میں بہت سے اس پائے کے سوز خوان
پیدا ہوئے کہ بڑے بڑے اُستاد گویئے اُن
کے آگے کان پکڑنے لگے۔ بہرحال جو درجہ
کمال مرثیہ گوئی نے شاعری میں حاصل کیا
وہی سوز خوانوں نے موسیقی میں۔ یہ سب فن
مجالس عزا کی برکت سے پیدا ہوئے اور خاص
لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور ان سب نے علاوہ
۔۔۔۔۔۔۔۔

اردو کو بے انتہا ترقی دینے کے نظم و نثر
آزادی کی دنیا میں یہ خاص شان پیدا کر دی
کہ انسانی جذبات کو جس طرح چاہیں حرکت
میں لائیں اور جس قسم کے جذبات اور جیسے
جوش کو چاہیں پیدا کریں۔ اصل حقیقت یہ
ہے کہ شیعوں کی مجلسوں نے لکھنؤ کی معاشرت
پر بہت نمایاں اثر ڈالا ہے اور ان کے
ذریعے آداب صحبت اور تہذیب و شائستگی
کو بہت زیادہ ترقی ہو گئی ہے۔"[۵۴]

ڈاکٹر سید صفدر حسین اپنی کتاب لکھنؤ کی تہذیبی میراث میں لکھنؤ میں عزاداری کے فروغ پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:۔

"عزاداری شیعیت کی ایک بنیادی رسم ہے، اس لئے اودھ میں شیعیت کے عروج کے ساتھ محرم کی دھوم دھام بھی بڑھتی رہی یہاں تک کہ رفتہ رفتہ لکھنؤ میں سیکڑوں امام باڑے، درجنوں کربلائیں اور ائمہ معصومین کے روضوں کی بہت سی عمارتی نقلیں تعمیر ہو گئیں۔ چنانچہ اس شہر میں آج بھی روضۂ امام رضاؑ، روضۂ حضرت زینبؑ، روضۂ حضرت عباسؑ، روضۂ امام موسیٰ کاظمؑ اور امام محمد تقیؑ، روضۂ نجف اشرف، روضۂ پسران حضرت مسلمؑ، فاطمین ... وغیرہ کی متعدد عمارتی نقلیں موجود ہیں اور ان کے علاوہ کربلائے زبانت الدولہ، کربلائے نواب عظمت الدولہ، کربلائے نواب ملکہ آفاق، کربلائے حاجی مسیتا، کربلائے بی مصری، کربلائے میر خدا بخش اور کربلائے نصیر الدین حیدر وغیرہ واقع ہیں۔ امام باڑوں کی تعداد کا شمار اس لئے مشکل ہے کہ گلی گلی اور کوچے کوچے میں علم نصب ہوتے اور گھر گھر میں مجلسیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ لوگ جگہ جگہ لنگر اور سبیلیں جاری کرتے اور حب اہل بیت میں روپے کو پانی کی طرح بہاتے تھے۔

اس اہتمام کے ساتھ عزاداری منانے کا یہ اثر ہوا کہ ہر نقطۂ خیال کا آدمی کسی نہ کسی پہلو سے امام اور اہلبیتؑ کے غم میں شریک ہو گیا۔ یہ اثرات مسلمانوں کے مخصوص طبقوں یعنی سنی اور شیعہ تک ہی محدود نہ رہے بلکہ لکھنؤ کے ہندوؤں اور عیسائیوں تک نے بلا تفریق مذہب و ملت، محرم کی بہت سی رسمیں خلوص و عقیدت کے ساتھ ادا کیں اور مسلمانوں کے ساتھ عزاداری میں حصہ لیا۔ چنانچہ آج بھی محلہ نواز گنج میں جھاؤلال کا امام باڑا موجود ہے۔ اسی طرح سیٹھ رائے راجا بہرا اور راجا میرا رام کے بھی ذاتی امام باڑے ہوا کرتے تھے جن کی تعمیر و تزئین پر ان کے بانیوں نے لاکھوں روپے صرف کئے تھے۔ گویا مسلمانوں کی طرح ہندو عوام بھی علم نصب کرتے، تعزیے نکالتے، مہندیاں اٹھاتے، سوز خوانیاں کرتے اور مرثیے پڑھتے تھے۔ مرثیہ گوئی کے ذیل میں مسلمان شعراء کے نامور کے ساتھ ساتھ ہندو شاعروں کے نام آتے ہیں چنانچہ راجہ الفت رائے الفت، کنور دھنپت رائے محب کا اس فن کا کلام اب بھی موجود ہے۔ محب کے مرثیوں اور سلاموں کا ایک ضخیم مجموعہ پروفیسر سعید حسن رضوی کے پاس میں نے دیکھا تھا۔ اس مجموعے کے

شروع میں ایک مجلس کے دعوت نامے کی نقل شامل تھی جس سے پتہ چلتا تھا کہ اس مجلس میں اُن کے یہاں مرزا دبیر مرثیہ پڑھنے والے تھے۔ مختصر یہ کہ شیعیت کے تاثر میں بہت سے ہندو حضرات نے بھی ماتم داری کی اور مرثیے تصنیف کئے۔[۵۳]

سطور گزشتہ میں پیش کئے جانے والے سرسری جائزے سے بخوبی واضح ہو سکتا ہے کہ اودھ کے مختلف فرماں رواؤں کے عہد حکومت کے دوران میں کثرت سے تعمیر ہونے والے امام باڑوں، روضوں اور کربلاؤں کے باعث لکھنؤ عزاداری کا ایک زبردست مرکز بن گیا تھا۔ نوحے، سوز اور مرثیے بلا قید مذہب و ملت عوام و خواص میں بے حد مقبول ہو گئے تھے۔ ان حالات میں یہاں خواص و عوام (جن میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی شامل تھے) مجالس عزا کے انعقاد میں [illegible] تمام سے کام لیتے تھے اُس کے پیش نظر لکھنؤ میں صنف مرثیہ کا غیر معمولی فروغ پانا باعث حیرت نہیں۔ بہر حال اس دور میں لکھنؤ صحیح معنوں میں مرثیہ نگاری کا ایک زبردست مرکز بن گیا تھا۔ اہم اور مشہور مرثیہ نگاروں کے علاوہ متعدد [illegible] شعرا جن کا اصل میدان قصیدہ، غزل یا مثنوی تھا صنف مرثیہ سے دلچسپی لینے لگے تھے۔ مرزا رفیع سودا، میر تقی میر، میر حسن، جرأت، مصحفی، انشا، امیر، بحر لکھنوی اور شاذ عظیم آبادی وغیرہ کا اصل میدان مرثیہ گوئی نہ تھا لیکن تاریخ مرثیہ کے صفحات میں ان شعرا کے ناموں کی شمولیت[۵۴] صنف مرثیہ کی مقبولیت پر دال ہے۔ ان شعرا کے علاوہ فصیح، دلگیر، خلیق اور ضمیر کی بھرپور شاعرانہ صلاحیتوں نے صنف مرثیہ کو جو تقویت بخشی تھی اُس کے پیش نظر بھی لکھنؤ میں مرثیہ گوئی کی مقبولیت میں زبردست اضافہ ہوا تھا۔ مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری دوسرے محرکات کے ساتھ ساتھ ان تمام مؤثرات کی کارفرمائی کی بھی رہین منت رہی ہے۔

انیس و دبیر دونوں کی مرثیہ نگاری پر ماضی میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ زمانۂ حاضر میں بھی انیس پر تو بہت کچھ لکھا جا رہا ہے لیکن اب ہندوستان میں دبیر پر لکھنے والوں کی شدید کمی نظر آ رہی ہے۔ ہمارے قدر اول کے اہل قلم بھی دبیر پر لکھنے سے گریز کر رہے ہیں۔ مراثی دبیر کی جلدیں پہلے کمیاب تھیں تو اب تقریباً نایاب ہوتی جا رہی ہیں۔ راقم الحروف نے نجی طور پر متعدد اہم صاحبان قلم سے سرفراز لکھنؤ کے دبیر نمبر کے لئے لکھنے کی درخواست کی مگر جواب میں جو خطوط آئے ان میں سے بیشتر میں معذرت ہی کی گئی ہے۔ ہماری کتنی ہی دانش گاہوں کے اُردو ادب کے نصاب سے دبیر کو نکال دیا گیا ہے۔ ادبی حلقوں میں دبیر کا یوں نظر انداز کیا جانا دبیر سے زیادہ خود اردو ادب کے لئے مضرت رساں ثابت ہوگا۔ میری ناچیز رائے میں اردو مرثیے کے ارتقا کو صحیح طور پر سمجھنے میں مطالعۂ دبیر کو کسی طرح نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ انھیں اسباب کی بنا پر راقم السطور نے ہفت روزہ سرفراز لکھنؤ کی مجلس منتظمہ میں سرفراز کے دبیر نمبر کی تجویز پیش کی جو منظور کر لی گئی اور اسی تجویز پر محرم ۱۳۹۷ھ کے موقع پر سرفراز کا دبیر نمبر شایع کیا جا رہا ہے۔ یہاں یہ امر بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ میرے محدود مطالعہ میں ابھی تک ہندوستان کے کسی جریدے کا دبیر نمبر نہیں آیا ہے۔ ہندوستان میں سرفراز لکھنؤ کا دبیر نمبر اس اعتبار سے بھی غالباً اولیت کا شرف رکھتا ہے۔ برادرم عبدالقوی صاحب دسنوی صدر شعبۂ اردو سیفیہ کالج بھوپال کی کوششوں سے رسالۂ کتاب نما دہلی کا دبیر نمبر بھی تیاری کی منزلوں سے گزر کر شایع ہونے والا ہے۔ کتاب نما دہلی کے دبیر نمبر کے لئے راقم الحروف نے برادرم عبدالقوی صاحب دسنوی

[illegible] رسالہ بھی بعد تعاون پیش کیا ہے۔ خدا کرے کہ یہ نمبر بھی جلد منظر عام پر آسکے۔

سرفراز اور کتاب نما کے دبیر نمبروں کے علاوہ پاکستان سے شائع ہونے والے دو رسائل پیام عمل لاہور اور ماہ نو راولپنڈی کے دبیر نمبر میرے پیش نظر موجود ہیں جو ۱۹۷۵ء میں حصۂ شہود پر آچکے تھے۔ میں سرفراز کے دبیر نمبر میں ان دونوں رسائل کے بھی بعض مضامین شامل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

حواشی :-

۱؎ مشمولہ: دفتر ماتم جلد اول : مرزا دبیر۔ مطبع محمد تیغ بہادر لکھنؤ۔ جنوری ۱۹۱۰ء، مرثیہ نمبر ۱ بند نمبر ۳۵ تا ۴۰

۲؎ تجلیات : مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی۔ نظامی پریس لکھنؤ ۱۳۴۴ھ (حصہ دوم) باب السیرۃ ص ص ۱۹۰ تا ۱۹۳

۳؎ اس قول کے لئے تائیدی شواہد مندرجہ ذیل کتب میں موجود ہیں :-

(۱) فارسی کتاب شمس الضحیٰ : مولوی میر صفدر حسین۔ مطبع ثنائی، لکھنؤ ۱۲۹۸ھ

(۲) حیات دبیر جلد اول : فضل حسین ثابت لکھنوی سیوک سٹیم پریس، لاہور ۱۹۱۳ء

(۳) فکر بلیغ : مؤلفہ شاد عظیم آبادی۔ مرتبہ نقی احمد ارشاد۔ نسیم بک ڈپو، لکھنؤ۔ اگست ۱۹۷۴ء

(۴) دبستان دبیر : ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی۔ نسیم بک ڈپو۔ لکھنؤ سنہ ۱۹۶۶ء

(۵) اردو مرثیہ اور مرزا دبیر : کاظم علی خاں۔ احباب پبلشرز، لکھنؤ۔ مطبوعہ سرفراز قومی پریس، لکھنؤ۔ اگست ۱۹۶۵ء۔ وغیرہ وغیرہ — کاظم علی خاں

۴؎ اس سلسلے میں میرے ایک مضمون "مقنویات مرزا دبیر پر ایک نظر" میں مفصل گفتگو کی گئی ہے۔

۵؎ ایجاب الصائب : مرزا دبیر۔ مطبع مجتبائی دہلی۔ (سنہ اشاعت ندارد)

۶؎ اس بیان کے لئے تذکرۂ مسرت افزا وغیرہ کی مدد سے ڈاکٹر مسیح الزماں نے اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے "اردو مرثیے کا ارتقاء" لکھنؤ ۱۹۶۸ء (ص ص ۱۳۵ تا ۱۳۹) میں متعدد مفید تائیدی ثبوت پیش کئے ہیں جو ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں

۷؎ تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت : سید ہاشمی فرید آبادی۔ انجمن ترقی اردو پاکستان۔ بحوالہ دبستان دبیر لکھنؤ ۱۹۶۶ء ص ص ۱۲۱/۱۲۰

۸؎ سوانحات سلاطین اودھ جلد اول : سید کمال الدین حیدر۔ مطبع منشی نولکشور، لکھنؤ ۱۸۹۶ء۔ ص ۴۸۳۔ (بحوالہ اردو مرثیے کا ارتقاء ص ص ۱۴۰/۱۳۹)

۹؎ انگریزی کتاب شجاع الدولہ جلد اول : ڈاکٹر اے ایل۔ سری واستوا (بحوالہ لکھنؤ کی تہذیبی میراث : ڈاکٹر سید صفدر حسین۔ بارگاہ ادب۔ لاہور ۱۹۷۵ء ص ص ۲۳۶/۲۳۵)۔

۱۰؎ بحوالہ سرود سلطانی : رجب علی بیگ سرور۔ مرتبہ پروفیسر آغا سہیل مجلس ترقی ادب۔ لاہور اکتوبر ۱۹۷۵ء ص ۹۔ (حاشیہ نمبر ۴)

۱۱؎ بحوالہ لکھنؤ کی تہذیبی میراث۔ ص ۲۳۲ نیز ص ۲۳۶۔

۱۲؎ ماسبق ص ص ۲۳۳/۲۳۲۔

۱۳؎ ر۔ک (۱) اردو مرثیے کا ارتقاء ص ۱۴۳۔ (۲) تاریخ آصفی اردو ترجمہ نوشیع الغافلین از مرزا ابو طالب اصفہانی۔ ترجمہ و ترتیب از ڈاکٹر زوار حسین علی۔ ادارۂ صبح ادب۔ دہلی۔ ۱۹۶۸ء۔ ص ۵۰۱

۱۴؎ بحوالہ اردو مرثیے کا ارتقاء۔ ص ۱۴۳۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے تحقیقی مقالے دبستان دبیر

(طبع اول ص ۱۳۹) میں رقم طراز ہیں کہ لکھنؤ کا آصفی امام باڑا اور حسینیہ غفران مآب، مرزا محمد رفیع سودا کی زندگی میں ہی بن چکا تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کا یہ بیان حقائق پر مبنی نہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم کی تحقیق کے مطابق سودا کا سنہ وفات ۱۱۹۵ھ ہے جو ۱۷۸۱ء کے مطابق قرار دیا جا سکتا ہے (ر۔ک۔ مرزا محمد رفیع سودا: ۔ ڈاکٹر خلیق انجم۔ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔ طبع اول۔ ص ص ۱۲۹ تا ۱۳۳) اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے حسینیہ آصفی کی تعمیر ۱۱۹۹ھ/۱۷۸۵ء تا ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء کی درمیانی مدت میں ہوئی تھی۔ نیز حسینیہ غفران مآب ۱۷۹۰ء/۱۲۱۰ھ میں بنا تھا۔ گویا حسینیہ آصفی و غفران مآب دونوں کی تعمیر سودا کی حیات کے بجائے سودا کی وفات کے بعد ہوئی تھی۔

۱۵ سرور سلطانی۔ مرتبہ پروفیسر آغا سہیل۔ لاہور۔ ص ۹ (حاشیہ نمبر ۶)

۱۶ ر۔ک۔ سوانحات سلاطین اودھ جلد اول ص ۱۶۹ (بحوالہ اردو مرثیے کا ارتقاء)

۱۷ ر۔ک سرور سلطانی۔ ص ۶ (حاشیہ نمبر ۷)

۱۸ لکھنؤ کی تہذیبی میراث۔ ص ۲۵۲

۱۹ وقائع دلپذیر: منشی عبدالاحد

۲۰ بحوالہ بیگمات اودھ: شیخ تصدق حسین۔ کتاب نگر۔ لکھنؤ۔ ۱۹۵۶ء ص ص ۸۸/۸۹

۲۱ ۔ ر۔ک۔ انگریزی کتاب "میمنرس اینڈ کسٹمس آف دی مسلمانس آف انڈیا": مسٹر میر حسن علی (بحوالہ بیگمات اودھ ص ص ۶۷ تا ۷۱)

۲۲ بحوالہ منظومات میاں دلگیر: ڈاکٹر اکبر حیدری مطبوعہ سرفراز قومی پریس۔ لکھنؤ۔ ۱۹۷۰ء ص ۱۲۷ (حاشیہ نمبر ۳)

۲۳ ر۔ک۔ فسانۂ عبرت: رجب علی بیگ سرور۔ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ کتاب نگر۔ لکھنؤ۔ دسمبر ۱۹۵۷ء ص ۹ نیز ص ۱۷۔

۲۴ ر۔ک۔ شباب لکھنؤ ترجمہ انگریزی کتاب پرائیوٹ لائف آف اینٹ ایسٹرن کنگز: ولیم نائٹن۔ مترجمہ محمد احمد علی۔ الناظر پریس۔ لکھنؤ ۱۹۱۲ء ص ص ۵۸/۵۷ (بحوالہ لکھنؤ کی تہذیبی میراث ص ۲۳۸)

۲۵ اردو مرثیہ: سفارش حسین رضوی۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔ جولائی ۱۹۶۵ء ص ۱۹۵

۲۶ ۔ ر۔ک۔ رجب علی بیگ سرور۔ حیات اور کارنامے تحقیقی مقالہ برائے ڈی۔فل: ڈاکٹر نیر مسعود۔ اسرار کریمی پریس، الہ آباد ۱۹۶۷ء۔ ص ص ۴۰۱/۴۰۰۔

۲۷ فسانۂ عبرت ص ۱۶

۲۸ میر ضمیر (تحقیقی مطالعہ): ڈاکٹر اکبر حیدری۔ طبع اول ۱۹۷۲ء۔ ص ۱۳۱۔

۲۹ مکہ زمانیہ کے حالات کے لئے ملاحظہ ہو: بیگمات اودھ ص ص ۱۰۲ تا ۱۱۴

۳۰ بحوالہ دبستان دبیر ص ص ۴۲۵/۴۲۴

۳۱ بحوالہ بیگمات اودھ ص ۱۷۳

۳۲ بحوالہ سرور سلطانی۔ صفحہ ۹ (حاشیہ نمبر ۱۹)

۳۳ بحوالہ منظومات میاں دلگیر۔ ص ۳۱

۳۴ بحوالہ بیگمات اودھ۔ ص ۱۷۵

۳۵ دیوان ناسخ (قلمی) بحوالہ منظومات میاں دلگیر ص ۳۲ (فٹ نوٹ نمبر ۳)

۳۶ ۔ ر۔ک۔ منظومات میاں دلگیر۔ ص ص ۴۹ لغایت ۵۲۔ ص ۵۶۔ ص ص ۶۳/۶۲۔ وغیرہ وغیرہ

۳۷ دیوان اسیر جلد اول (قلمی) مملوکہ لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری۔ میں اسیر نے میاں دلگیر کی مندرجہ ذیل تاریخ وفات لکھی ہے (مخطوطے میں صفحات درج نہیں ہیں)

آہ آہ از جہان فانی شد
مرثیہ گوئے شاہ عرش نظیر

[illegible] اخبر تاریخش
دانے دلگیر عاشق شبیر (۱۲۶۴ ہجری)

۳۸ منظومات میاں دلگیر۔ ص ۷۱

۳۹ نسلہ عبرت۔ ص ۴۴

۴۰ بحوالہ کیفیات اودھ۔ ص ۲۷۶

۴۱ حسینیہ میر باقر سوداگر کا سنہ تعمیر برق کے ایک فارسی قطعۂ تاریخ سے برآمد ہوتا ہے۔ دیوانِ برق مطبوعہ ۱۸۵۳ء (ص ۱۶۵۴) میں یہ فارسی قطعۂ تاریخ موجود ہے۔ اس اطلاع کے لئے ڈاکٹر اکبر حیدری کا ممنون ہوں۔

۴۲ بحوالہ گزشتہ لکھنؤ: مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی مرتبہ شمیم انہونوی۔ نسیم بک ڈپو۔ لکھنؤ۔ جولائی ۱۹۶۵ء ص ۹۴۔

۴۳ رک (۱) اودھ کا شاہی اسٹیج: سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ کتاب نگر لکھنؤ ۱۹۶۸ء ص ۶۷

(۲) لکھنؤ کی تہذیبی میراث۔ ص ۱۰۵

۴۴ بحوالہ منظومات میاں دلگیر۔ ص ۳۳۔ (نسخہ نو)

۴۵ سرود سلطانی: رجب علی بیگ سرور، مرتبہ آغا سہیل ص ۵۱۰۔

۴۶ رک۔ اُمدہ مرثیہ (تاریخ مرثیہ): سفارش حسین ص ۳۹۰۔

۴۷ حزنِ اختر (مقدمہ) بحوالہ تاجدار اودھ: امجد علی خاں۔ مفید الواعظ پریس۔ لکھنؤ ۱۹۷۱ء ص ۷۔

۴۸ بحوالہ دبستانِ دبیر۔ ص ۴۳

۴۹ رک (۱) ایک نادر روزنامچہ: مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی۔ ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ۔ طبع اول ص ۴۳۔

(۲) مضمون سید مسعود حسن رضوی ادیب "سلطان عالم واجد علی شاہ اختر — انسان، مصنف، شاعر" مشمولہ کتاب نذیر مقبول: مرتبہ خیر بہوروی۔ نامی پریس۔ لکھنؤ فروری ۱۹۷۰ء (ص ۳۱)

۵۰ بحوالہ گزشتہ لکھنؤ۔ قاضی بیان از شمیم انہونوی ص ۹۰

۵۱ گزشتہ لکھنؤ: شرر لکھنوی۔ ص ص ۲۱۲، ۲۱۴، ۲۱۵

۵۲ گزشتہ لکھنؤ: مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی۔ مرتبہ شمیم انہونوی۔ نسیم بک ڈپو۔ لکھنؤ۔ جولائی ۱۹۶۵ء ص ص ۳۵۶ تا ۳۵۸ نیز ص ۳۹۰

۵۳ لکھنؤ کی تہذیبی میراث: ڈاکٹر سید صفدر حسین بارگاہِ ادب، لاہور۔ ۱۹۷۵ء۔ ص ص ۲۹۸/۲۹۷

۵۴ رک اردو مرثیہ (تاریخ مرثیہ): سفارش حسین ص ص ۲۲۴ تا ۲۳۳، ص ص ۲۳۸ تا ۲۴۰، ص ص ۲۴۶ تا ۲۴۹، ص ص ۲۴۰ تا ۲۴۱، ص ص ۳۵۷ تا ۳۵۹، ص ص ۳۸۹ تا ۳۹۹

کاظم علی خاں

تعریفِ اشکِ عزا

اشکِ غمِ شبیرؑ دُرِ یکتا ہے
ہر دیدۂ حق بیں سے یہ دُر پیدا ہے
بے اشکِ عزا آبروئے چشم ہے خاک
پانی نہ ہو جس میں وہ کنواں اندھا ہے

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری

مرزا دبیر کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ

جب کوفہ میں پابندِ بلا ہو گئے مسلمؑ

(نوٹ: راقم الحروف کو لکھنؤ کے مشہور و معروف علم دوست اور ادب نواز جناب مرزا علی سجاد حسین صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر نے مراثی کا ایک مخطوطہ عنایت فرمایا تھا اس کا سائز ۶" × ۸" ہے اور اس میں میر خلیق، مرزا فصیح، میاں دلگیر، آباد، قبول، عرش، مشرف، شریف، انس، مونس اور انیس و دبیر کے بہت سے مرثیے ہیں۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ مخطوطہ میں بہت سے مرثیے ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔ اس میں مرزا دبیر کے کئی مرثیے ہیں۔ ایک مرثیہ یہ ہے ع

"صبح عاشور ہوا گرم جو بازارِ قضا"

اس کی ابتدا میں یہ عبارت ہے:۔

"صحیح و مقابلہ نمودہ شد۔ تصنیف مرزا دبیر سلمہ اللہ تعالیٰ"

آخر میں ذیل کا ترجمہ ہے:۔

"تمام شد کتبہٗ احقر العباد محمد مہدی خاں کربلائی عفی اللہ عنہ بتاریخ شانزدہم شہر صفر ۱۲۷۴ ہجری و مالک ہم مشار الیہ فقط"

اسی مخطوطہ میں دبیر کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ ہے۔ اس میں ۳۸ بند ہیں۔ مرثیہ سے پہلے سادہ صفحہ پر یہ عبارت ہے: "مرثیہ دبیر بند ۳۸" اور اس کے نیچے کی عبارت یہ ہے:۔ "مالک این مرثیہ بخود صاحبہ" مرثیہ میں مقطع نہیں ہے لیکن مخطوطہ بہت پرانا ہے اور اس میں جتنے مرثیے ہیں وہ سب مستند ہیں لہٰذا زیرِ نظر مرثیہ کے مستند ہونے میں راقم کو کلام نہیں۔)

جب کوفہ میں پابندِ بلا ہو گئے مسلمؑ — از مورد بیداد و جفا ہو گئے مسلمؑ
بچوں سے بھی غربت میں جدا ہو گئے مسلمؑ — ان صدموں سے مشتاقِ قضا ہو گئے مسلمؑ
ہر روز مسافر کے لئے زادِ بدری تھی
ہر شام کو عمر ان کی چراغِ سحری تھی

وہ شہر پہ آفت وہ تلاطم وہ شب تار — جلاد کمیں گاہ میں، دشمن در و دیوار
اک دوست تھا پانی پہ جو قتل وہ دیندار — پر رہنے کا گھر میں نہ ہوا کوئی روادار
بیٹھیں کہیں تھک کر کہ اجل سر پہ کھڑی تھی
اک سر پہ زمانے کی بلا ٹوٹ پڑی تھی

نہ کوچہ سے آگاہ، نہ رستے سے خبردار — اور پوچھے تو کس سے کہ ہر اک سر کا خریدار
ناقوں سے جو لغزش تھی قدم کو دم رفتار — چپکے سے یہ کہتے تھے کہ یا حیدر کرار
ہر کوچہ میں تھا غل کہ کوئی آنے نہ پاوے
ہاں لیجیو مسلم کو نکل جانے نہ پاوے

وارد ہوئے ناگاہ در طوعہ پہ ستمگر — تسبیح بکف ذکر خدا میں تھے وہ در پر
حضرت نے کہا خشک زباں اپنی دکھا کر — نذر سپر فاطمہ اک پانی کا ساغر
احسان کرو اللہ و پیغمبر کا تصدق
پانی دے مجھے ساقی کوثر کا تصدق

طوعہ گئی اور جام لبالب دیا لا کر — حضرت نے پیا بیٹھ کے دروازے کے اوپر
پھر کوزے کو رکھ کر جو وہ یہاں مکرر — دیکھا کہ ہیں بیٹھے ہوئے زانو پہ رکھے سر
دل میں کہا طوعہ نے کہ رنج اس کو بڑا ہے
توہم شرفا سے ہے مگر وقت پڑا ہے

آخر کہا طوعہ نے کہ اے بیکس و تنہا — بس پی چکا پانی مرے دروازے سے اٹھ جا
تو دیکھتا ہے شہر میں کیا فتنہ ہے برپا — جا گھر میں ترے ورنہ ترے ناموس کو ہوگا
اس وقت میں ہر اک سے کنارہ ہی بھلا ہے
تو نے بھی سنا ہوگا جو پانی پہ بلا ہے

اٹھ جانے کو طوعہ نے کہا جب کہ کئی بار — کعبہ کی طرف مڑ کے یہ کرنے لگا گفتار
یا سبط نبی ہم بھی ہیں کیا بیکس و ناچار — دروازے پہ رہنے کا نہیں کوئی روادار
اس رات کی رات اور تباہی ہم اٹھا لیں
نانا سے کہو کل ہمیں جنت میں بلا لیں

پھر دیکھ کے طوعہ کی طرف بولے یہ رو کر — گھر ہوتا تو ہم کاہے کو یوں بیٹھتے در پر
یاں میرے لئے فکر کسے ہووے گی خواہر — زینب ہے نہ بانو ہے نہ زوجہ ہے نہ دختر
شبیر جدا مجھ سے ہیں عباس جدا ہیں
اک ہم تن تنہا یہاں پابند بلا ہیں

جیسے ہوئی طوعہ کو یہ بولی وہ حق آگاہ — شبیرؑ ترا کون ہے اے بندۂ اللہ
رو کر کہا سردار ہیں آقا ہیں شہنشاہ — وہ بولی کہ کیا آیا تھا مسلم کے تو ہمراہ
شرما کے کہا وہ وطن آوارہ میں ہی ہوں
مسلم جسے کہتے ہیں وہ بے چارہ میں ہی ہوں

ہاتھوں کو پکڑ کر یہ پکاری وہ خوش ایماں — اے موت کے مہمان تو میرے گھر میں ہو مہماں
تو نائبِ شبیرؑ ہے آ میں ترے قرباں — آواز بتول آئی کہ ہم پر ہے یہ احساں
مسلمؑ کو تو حجرہ دیا اس اہل ولا نے
بخشا اُسے فردوس کا گلزار خدا نے

لکھا ہے نویں رات تھی ذیحجہ کی یہ آہ — مسلمؑ نے کفن دھو کے معطر کیا ناگاہ
سر سجدے میں اب ذکر میں اور دل سوئے اللہ — جب آئی تھی طوعہ تو یہ کہتا تھا وہ فریاد
فردوس کی خنجر کے تلے دید کریں گے
کل عرفہ کو قربانی کے ہم عید کریں گے

ناگہ پسرِ طوعہ نے یہ تذکرے سن پائے — کی فکر شقی نے کہیں گھر بار نہ لٹ جائے
کچھ شب تھی کہ حاکم کو یہ دی اس نے خبر لائے — مسلم میرے گھر میں ہے کوئی جا کے پکڑ لائے
دی اس نے صدا فوج کمر باندھ کے آئے
ہاں صبح نہ ہویدا ہو کہ مسلم کا سر آئے

لشکر کی ہوئی خانۂ طوعہ پہ چڑھائی — مسلمؑ نے یہاں جائے نماز اپنی اٹھائی
ہمسائے کو طوعہ نے یہ آواز سنائی — مہمان مرا جاتا ہے مرنے کو دہائی
گھر طوعہ کا گھیرا گیا مہمان کی خاطر
ناحق کا یہ انبوہ ہے اک جان کی خاطر

مسلم نے کہا ضامن جنت ہوں میں تیرا — اے فاطمہؑ کی لونڈی رضا دے پئے زہرا
پھر دھیان میں بیٹوں کے یہ کہہ کر بڑے گویا — پردیسیو بابا نے خدا کو تمھیں سونپا
ہم مر کے یہاں بے کفن و گور رہیں گے
سر کٹ کے بدن پیاروں کے دریا میں بہیں گے

یہ کہہ کے برآمد ہوا وہ نائبِ شبیرؑ — بادل کی طرح چھا گئے سب ظالم بے پیر
ہاتھوں میں لئے برچھیاں چلوں میں تلے تیر — پڑنے لگی مظلوم پہ شمشیر پہ شمشیر
جب زخم سناں کھاتے تھے خوش ہوتے تھے مسلمؑ
زہراؑ کے مسافر کے لئے روتے تھے مسلمؑ

کرب و بلا میں لگا شمر جفا کار — موجود گھوڑے سے نیزوں کے ہو ڈالا کئی بار
پہلے یہ تھا کہ نہ پاس آتے تھے کفار — اصغر کو دغا کی یہ پکارے وہ ستمگار
پھر لڑنا ذرا پوچھو تو بھائی کی خبر کو
وہ ناقہ سوار آتا ہے کعبہ سے ادھر کو

بھائی کا تو شاہ تھا تلوار کو رد کا — بس رُخ کے پھراتے ہی اجل نے کیا مجرا
تیر خطا نہ قاصد تھا فقط پیک اجل تھا — برچھی تو کلیجہ میں تھی، برچھی میں کلیجا
منہ سوئے نجف کر کے کہا اپنے چچا سے
مظلوم بھتیجے کو ترے مارا دغا سے

یہ سوئے نجف کہہ کے گرے مسلم ذی جاہ — لائے زبر حاکم پہ اٹھا کر انھیں بدخواہ
سائل ہوئے پانی کے کسی نے نہ دیا آہ — ساغر لئے طوعہ وہاں وارد ہوئی ناگاہ
رو کر کہا تم پیاسے ہو کل رات سے آقا
لو پانی پیو خادمہ کے ہاتھ سے آقا

القصہ کہ حاکم نے حضور اپنے بلایا — اور وہ کلمۂ سخت ستمگر نے سنایا
جس سے محمد احمد مرسل کو بلایا — مسلم نے ملا ہاتھوں کو رونا بہت آیا
حاکم نے کہا قبر میں بھی ہاتھ ملے گا
اب خنجر بیداد مرا تجھ پہ چلے گا

وہ بولا کہ حاشا جو تاسف ہو کچھ اپنا — رخصت دے عمر کو وصی ہوئے وہ میرا
لو دوات و قلم اس وقت تو منگوا — کچھ مجھ کو مدینہ کے مسافر کو ہے لکھنا
تحریر فقط حال کی منظور ہے مجھ کو
بھجوانے نہ بھجوانے کا مقدور ہے تجھ کو

حاکم کا جو ایسا پسر سعد نے پایا — تب لے کے وہ قرطاس و دوات و قلم آیا
مسلم نے لہو زخموں کا کاغذ پہ لگایا — اور پھر رقم ہاتھ تین کاغذ کو اٹھایا
لکھا شہ والا کو کہ کیا حال رقم ہو
اغلب ہے کہ خط لکھنے سے سر تن سے قلم ہو

ذابح کی نویں عرفے کا دن قتل کا سامان — پر عید پہ ہی جاتا ہوں میں آپ پہ قرباں
شہزادوں کا اور شاہ کا اللہ نگہباں — لکھتا ہوں رقیہ کی سفارش مگر اس آن
گرہ گرہ کے مرے غم میں نہ دم اس کا نکل جائے
صدقے میں سکینہ کے رقیہ مری مل جائے

زوجہ ہے میری خواہر عباسِ دلاور — وہ مرتبہ زاں خود ہے یہ کہہ دینا برادر
روئے مجھے تو بانو نے شبیرؑ سے چھپ کر — ایسا نہ ہو شرمندہ ہو کچھ بانو سے سرورؑ
عباسِ دلاور کے برابر میں نہیں ہوں
وہ بانو کی لونڈی میں غلامِ شہِ دیں ہوں

رُوداد بہت زحمت ہے کم کیا کروں ارقام — جلاد مرے سر پہ ہیں کھینچے ہوئے صمصام
بس میرا یہی خط ہے یہی آخری پیغام — اب کوفے میں آنے کا بھی لینا نہ کبھی نام
خط پہلی طلب کا جو برادر نے لکھا ہے
میں نے نہیں لکھا ہے مقدر نے لکھا ہے

تقصیر ہوئی بخشیو، لکھنے پہ نہ جانا — کیا جانتا تھا خون کا پیاسا ہے زمانا
واللہ دغا ہے یہاں للہ نہ آنا — اور خیر جو تم آنا تو زینبؑ کو نہ لانا
لاؤ گے تو وہ زغۂ اعدا میں گھرے گی
سر ننگے بہن آپ کی بلوے میں پھرے گی

عمران کے فرزند سے حاکم ہوا گویا — اب دیر نہ کر بام پہ مسلمؑ کو تو لے جا
لٹکا دے در کوفہ میں سر کاٹ کے اس کا — اور بام سے بالائے زمیں پھینک دے لاشا
ہاں باندھ کے پھر لاش کے پاؤں میں رسن کو
تشہیر کرو مسلمِ آوارہ وطن کو

جلاد نے پھر بازوئے مسلمؑ کو لیا تھام — ساتھ اس کی غریبی (کرم خوردہ) مسلمِ ناکام
ہر زینے پہ معراجِ شہادت ملی ہر گام — اور بام پر آ کر ہوئے خورشید لبِ بام
چپ بیٹھے تھے مسلمؑ وہاں صمصام کے نیچے
تھی حق تماشے کو کھڑی بام کے نیچے

تب دھیان میں شبیرؑ کے مسلمؑ یہ پکارے — کعبہ کی ہوا راہ میں صدقے میں تمہارے
اب کٹتا ہے سر لوگ تماشائی ہیں سارے — دیکھو مرے آقا مری حسرت کے نظارے
اعجاز سے بردے مری آنکھوں سے اٹھا دو
یا سبطِ نبی آخری دیدار دکھا دو

کعبہ سے اسی روز روانہ ہوئے تھے شاہ — مسلمؑ تو لبِ گور تھے شبیرؑ سرِ راہ
جبریل نے کوفہ کی زمیں سے کہا ناگاہ — ہاں حکمِ خدا سے تو بلند ہو ابھی واللہ
مسلمؑ شہِ مظلوم کی تصویر کو دیکھے
شبیرؑ اسے دیکھے وہ شبیرؑ کو دیکھے

کوفہ کی زمیں نے سر رفعت کیسا پیدا — پر ساری زمینوں پہ ہوا زلزلہ برپا
چلنے سے رکا راہ میں اسپ شہ والا — اور تھم گئے سب اشتر زینب زہرا
ہاتف نے ندا دی یہ محمدؐ کے خلف کو
یا سبط نبیؐ دیکھ لو کوفہ کی طرف کو

کوفے کی طرف شاہ نے چہرے کو پھرایا — سیدانیوں نے محملوں سے پردہ اٹھایا
اللہ نے مسلم کا جمال ان کو دکھایا — بیٹھا ہوا تلوار کے نیچے نظر آیا
باہم تھی نظاروں میں صدائے اخی کی
یاں فاطمہؑ روتی تھی وہاں روح نبیؐ کی

چہروں پہ طمانچے حرم شہ نے لگائے — ملنے کے لئے ہاتھ رقیہ نے بڑھائے
چلائی کہ لو اماں وہ بابا نظر آئے — سب کہتے تھے بابا نے وہاں شہر بسائے
نہ فرش پہ نہ سایۂ دیوار کے نیچے
بابا تو مرے بیٹھے ہیں تلوار کے نیچے

کیا روتے ہو لوگو مرے بابا کو پکارو — لے جا کے رقیہ کو پدر خستہ پہ وارو
زینبؑ پھوپھی اشتر سے مجھے جلد اتارو — یا حضرت عباس حمایت کو سدھارو
بھیا علی اکبرؑ یہ بہن تیری بلا لے
لونڈی ہوں میں تیری مرے بابا کو بچا لے

پھر پیٹ کے سر ہاتھوں سے حضرت کو پکاری — فریاد چچا جان دہائی ہے تمہاری
ذات آپ کی ہے عقدہ کشا سب کی میں واری — صغرا کے لئے دیکھو صغیری پہ ہماری
دیتی ہوں سکینہ کی قسم جا کے بچا لو
بابا کو مری تیغ کے نیچے سے بچا لو

شبیرؑ پکارے ترا بابا ہے بہت دور — پدر خالق اکبر کو اب ہے یہی منظور
قاتل سے گلے بھٹنے زباں مسلم رنجور — حسرت مری پوری ہوئی اے قاتل مقہور
لے کاٹ لے سر جلد کہ مرنے کا مزا ہے
مرتا ہوں میں جس کے لئے وہ دیکھ رہا ہے

قاتل نے لگائی سر مسلم پہ جو شمشیر — سر کٹ کے پکارا میں فدائے سر شبیرؑ
گھوڑے سے گرایا جو تن مسلم دلگیر — یا حیدر کرارؑ کہا اور کہی تکبیر
قطرے جو گرے خون کے دامان علیؑ میں
سر گود میں زہراؑ کے تن آغوش نبیؐ میں

سر پیٹنے کی جا ہے مگر اجب کہ وہ لاشا — موجود تھے حاکم کی طرف سے وہاں اعدا
میں کیا کہوں اک ایک نے دی لاشہ کو ایذا — پھر لاشے کے پاؤں میں غرض رسی کو باندھا
پہلے اُسے دربارِ ستمگار میں لائے
پھر کھینچتے ہر کوچہ و بازار میں لائے

پھر لاش کو کوچوں میں پھرا کے تھے جو بدخواہ — رونے کی فرشتوں کے صدا آتی تھی واللہ
اک بی بی بھی پوشیدہ تھی اس لاش کے ہمراہ — چلاتی تھی وہ یا ولدی یا ولدی آہ
جب پوچھتا تھا کوئی کہ یہ کس کی بکا ہے
کہتی تھی زمیں فاطمہؑ مشغولِ بکا ہے

الوداع شاہِ خراساں

از مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہ

الوداع اے بے وطن شاہِ خراساں الوداع
الوداع اے بے کفن شاہِ شہیداں الوداع
الوداع اے کشتۂ زہرِ دغا، بیکس رضاؑ
الوداع اے زخمیِ شمشیر و پیکاں الوداع
الوداع اے ساکنانِ طوس کے پشت و پناہ
الوداع اے ہند کے شیعوں کے مہماں الوداع
کل سوم ہے آپ کا پردیس میں اے شاہِ طوس
آپ کا چہلم ہے کل اے شاہِ ذیشاں الوداع
لو اُٹھو ماتم کرو فرماتی ہے روحِ حسینؑ
الوداع اے شیعیانِ پاک ایماں الوداع

سید سکندر آغا
ریسرچ اسکالر (لکھنؤ یونیورسٹی)

مقیاس الاشعار از مرزا اوج لکھنوی
ایک تعارف

ولادت ۱۶ر جمادی الاول ۱۲۶۹ھ مطابق ۵ر فروری ۱۸۵۳ء
وفات ۲۵ر جمادی الاخر ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۸ر اپریل ۱۹۰۷ء

میر انیس اور مرزا دبیر کے بعد فن مرثیہ گوئی میں مرزا اوج نے جو کمال پیدا کیا وہ اظہر من الشمس ہے۔ ۱۲۹۲ھ میں انھوں نے اپنے فنی کمالات کا مظاہرہ "مقیاس الاشعار" کی صورت میں ارباب علم کے سامنے پیش کیا۔ فن عروض و قافیہ میں یہ اردو کی ایک مستند کتاب تسلیم کی گئی ہے۔ اس کے متعلق نواب مرزا خاں داغ دہلوی کا قول ہے۔

"اُن کی کتاب علم عروض میں مقیاس نام۔ اُن کی عروض دانی میں اکمل ہونے پر دلیل روشن ہے۔" [1]

اس کا تاریخی نام "ارمغان" ہے جس سے ۱۲۹۲ھ نکلتا ہے۔ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ حصہ اول عروض اور فن شعر سے تعلق رکھتا ہے۔ حصہ دوم میں قافیہ کی بحث ہے اور حصہ سوم فن تاریخ گوئی کے متعلق ہے۔ کتاب بڑے سائز کی ۳۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

یہ کتاب کمیاب ہے۔ بڑی تلاش و جستجو کے بعد راقم الحروف کو اس کا نسخہ دستیاب ہوا۔ اس پر حضرت اوج مرحوم کے دستخط بھی ثبت ہیں۔ جزو اول کے چند الفاظ سات تلامذین کرام کے سامنے فن شعر اور کلام موزوں کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

"۔۔۔ شعر وہ کلام ہے کہ بقصد صاحب ہو واسطے موزوں و مقفیٰ ہونے کے۔ اور نے قصد موزوں و مقفیٰ ہونے کا کیا نہ کیا ہو۔ پس کلام موزوں و مقفیٰ کہ صادر ہو ساہی و منکر و شاک و نایم و مجنون سے اور اُس شخص سے کہ بے قصد و رویہ اُس سے کلام موزوں صادر ہوا ہو، حد شعر میں داخل ہوگا کہ فی نفسہ صلاحیت موزوں و مقفیٰ ہونے کی رکھتا ہے۔ مگر اس صورت میں بعض آیات قرآن مجید اور بعض احادیث شریفہ کہ موزوں معلوم ہوتے ہیں داخل ہوتے ہیں حد شعر میں اور منافی ہے اُس کے قول حضرت حق سبحانہ تعالیٰ کا وما علمناہ الشعر وما ینبغی لہ ان ھو الا ذکر و قرآن مبین" جواب اُن کا دو طرح پر

[1] معراج الکلام ص ۱۴

ہے۔ ایک یہ کہ مراد تفی تعلیم تالیف شعر ہو
کما مترجس سفسائقہ نہ ہوگا۔ موزوں و مقفیٰ
ہونے میں آیات کے لئے دوسرے یہ کہ وہ
آیات کہ موزوں معلوم ہوتے ہیں یا اُس میں
تغیرات وغیرہ ہیں کہ عروض قافیہ عرب میں
جائز نہیں یا انقطاع و وصل کے سبب
کے کلام موزوں نہیں ہوتا اور اسی طرح احادیث
میں بھی (علامہ حسن علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ
اس بات سے کہ حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ
وآلہ نے شعر نہیں کہا یہ ہے کہ اون حضرت
نے کلام شعری نہیں فرمایا نہ یہ کہ کلام موزوں
نہیں فرمایا اس واسطے کہ اطلاق شعر کا اوپر
دونوں معنوں کے ہے اور اون حضرت سے
کلمات موزوں منقول ہیں مثل قول آنحضرت
سے اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِبْ اَنَا ابْنُ
عَبْدِ الْمُطَّلِبْ هَلْ اَنْتِ اِلَّا اِصْبَعٌ
وَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ مَا لَقِیْتِ
(ترجمہ: میں ہوں نبی۔ نہیں جھوٹ۔ ولد
ہوں میں۔ میں ہوں بیٹا عبد المطلب کا آیا ہوا
تو نگر انگشت خون آلودہ اور راہ خدا میں
لاقات نہیں کی تو نے (اور یہ استفہامیہ ہے
تعجب اُس کا یہ ہے کہ وہ حضرت کہیں تشریف
لئے جاتے تھے ناگاہ انگشت پائے مبارک
حالت مشی میں اک سنگ سے ٹھوکر کھا کر
خون آلودہ ہوگئی اُس وقت بے اختیار یہ
کلام بلاغت نظام زبان اقدس پر جاری ہوا
اور یہ بحر رجز میں ہے کتابت اس وقت کو
بضرورت استقامت وزن تبرہ وصل اصبع
کو ساقط نہ کریں کما جاز والا وزن شعر نہ ہوگا

اگر کوئی کہے کہ فی علم مستفعلن سے یہ زحاف
نہیں ہو سکتا ہے اگر الف گرائیں تو ہم جواب
دیں گے کہ یہ زحاف خاص فارسی کا ہے نہ
عربی کا ہے
علم عروض: اقسام شعر کے بارے میں رطب اللسان
ہیں:-

"شعر کی دس قسمیں ہیں (۱) بیت (۲)
رباعی (۳) غزل (۴) قصیدہ (۵) قطعہ (۶) مثنوی
(۷) ترجیع بند (۸) ترکیب بند (۹) مستزاد (۱۰) مسمط
اور ان انواع کے تحت میں بیت، مطلع، حسن
مطلع، مقطع اور ذیل ضمائم میں مسمط
چار خانہ وغیرہ لیکن فرد بھی تھا اور اصطلاح
میں وہ شعر کہ دو مصرعے رکھتا ہو اور دونوں
مصرع اُس کے بایکدگر مقفیٰ نہ ہوں مثال میں
جدم میر انشاء اللہ خاں منفور ہے
جائے مسیح گرچہ بود چرخ چارمیں
حقا کہ تا مقام ابوذر نہ می رسد
(رباعی) بنظم اول اور اصطلاح شعرائے عجم ہے، وہ
شعر کہ اوپر وزن معینہ رباعی کے ہوئی۔ عام اس
بات سے کہ تیسرے مصرع میں قافیہ ہو یا نہ ہو
مثال میں جناب والد علام طاب ثراہ
جو پھول کبھی نہ بوستاں سے نکلے
اس دور میں جو آسماں سے نکلے
صد شکر کہ شہر لکھنؤ تھا جنت
آدم بھی کہ ہم جہاں سے نکلے
یہ رباعی ہنگام ورود عظیم آباد نظم فرمائی
گئی۔ مثال اخیر منفور سے کہ جس کا تیسرا مصرع

---

[1] معیار الاشعار صفحہ ۹ و ۱۰

کوئی ہے حاتم کا دل غالب ہے
کوئی ہے علم خدا دوجا علی غالب ہے
اشرف ہے مطلب بنی طالب ہے
کیا ذات علیؑ ابن ابی طالب ہے

اور یہ رباعی ذو قافیتین بھی ہے۔

غزل بفتحتین۔ بازی کرنا سات محبوب کے۔ اور حکایت کرنا جوانی سے اور حدیث صحبت و عشق زنان سے اور اصطلاح میں بھی مشتمل بایں معنی چند اشعار اک وزن و قافیہ میں اور بیت اول میں دونوں مصرعے مقفیٰ ہوتے ہیں یا مردف بھی اور دیگر ابیات کے لئے اواخر مصاریع مقفیٰ ہوتے ہیں یا مردف بھی اور اشعار غزل کمتر تین بیتوں سے اور زیادہ بارہ بیتوں سے نہیں ہوتی۔۔۔

قطعہ بکسر اول و سکون ثانی پارہ از ہر چیز و بالفتح غلط مگر بعض فصحائے متاخرین کے عندیہ میں جائز بھی ہے اور اصطلاح میں دو بیتیں کہ اس سے کم نہ ہوں اور زیادہ کے لئے کوئی حد نہیں مثل قصیدہ کی اور مطلع رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو وجہ تسمیہ یہ ہے کہ گویا وہ ٹکڑا نظم کا غزل یا قصیدہ سے منقطع ہوا ہے۔

(مثنوی) اصل میں مثنیٰ بفتح میم و سکون ثائے مثلثہ و فتح نون و ہائے ہوز مذکورہ ایک اسم ہے کہ مؤنث ہے اثنین، مثنیہ ہے کہ ترجمہ اس کا دو دو ہیں الف مقصورہ کو مطابق قاعدہ کے حالت الحاق یائے نسبت میں واؤ کے ساتھ بدل کیا مثنوی ہوا چونکہ ابیات مثنوی میں ہر بیت میں دو قافیہ متفق علیحدہ ہوتے ہیں۔ بیت دیگر سے لہٰذا ابیات مختلف القوافی کا مثنوی نام رکھا اور مزدوج بھی اور اصطلاح میں عبارت ہے۔ اسی طرح کے اشعار سے کہ ایک وزن پر ہوں اوزان معینہ مثنوی میں مثل شاہنامہ فردوسی علیہ الرحمہ اور سکندر نامہ کے اور مثنوی کہنا نزدیک اساتذہ کے لئے بحیثیت مجموع مثنوی کے لئے ہوگا کیونکہ یہ اب بھی بحیثیت مجموعی مشکل ہے باعتبار نفس مثنوی نا فہم بہر حال اساتذۂ فارس نے مثنویاں سات وزنوں میں کہی ہیں اسی جہت سے اکثر شعرا کا یہ عندیہ ہے کہ جس طرح رباعی چوبیس وزنوں پر منحصر ہے اسی طور پر مثنوی بھی سات وزنوں سے

---

[1] مقیاس الاشعار صفحہ ۱۴، ۱۵ اور ۱۶

مخصوص ہے . . . [1]

(ترجیع بند) ترجیع یعنی رجوع کرنا اور اصطلاح میں رجوع کرنا غزل سے صرف بند کے اور بند عبارت ہے اک شعر اجنبی سے کہ چند غزلیات متحد الوزن و مختلف القوافی میں بعد ہر غزل کے مکرر واقع ہو اور اس شعر کے دونوں مصرع یا یکدگر مقفیٰ ہوں اور قافیے اُس شعر کے لئے غیر قافیہ جمیع غزلیات ہوں اور وہ شعر از روئے معنی سات آخر ہر غزل کے مربوط ہو اور ہر غزل بے مقطع نہیں غزل آخر کہ اس میں مقطع ہوگا اور تعداد اشعار ہر غزل یکساں ہو اور حد تعداد اشعار غزل پانچ سے بارہ تک ہو۔ [2]

(ترکیب بند) لغت میں ایک چیز کو سات ایک چیز کے وصل کرنا اور اصطلاح میں چند غزلیات متحد الوزن و مختلف القوافی اور ہر غزل بے مقطع سوا غزل آخر کے کہ اس میں مقطع ہوگا اور تعداد اشعار ہر غزل برابر اور بعد ہر غزل ایک شعر غیر مکرر کہ جو آخر شعر ہر غزل سے مربوط ہو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں ایک وہ کہ بعد ہر غزل کے ہر شعر اجنبی جیسے بند کئے ہیں باہم دگر مختلف القافیہ ہو یا متفق القافیہ ہو . . . [3]

(مستزاد) بضم میم و زائے معجمہ زیادہ کیا گیا اور اصطلاح میں وہ بیت مثمن یا مصراع مثمن کہ جس کے آخر میں ایک فقرہ ہموزن دو رکن یا چار رکن اور اسی وزن بیت سے زیادہ کریں سات اس بات کے کہ کلام سابق سے مربوط ہو اور ضرور نہیں کہ معنی بیت کے بامصراع کے بغیر اس کے تمام نہ ہوں . . . [4]

(مسمط) بضم میم و فتح سین و تشدید میم دوم مفتوح و طائے مہملہ دُر در رشتہ کشیدہ و سلک مروارید اور اصطلاح شعرا میں اک قسم قسام شعر سے ہے اور دوسری انواع صنایع سے ہے اور اُس کو مسمط چار خانہ کہتے ہیں اور جو قسم شعر سے ہے اُس کو صرف مسمط کہتے ہیں۔ پس مسمط یعنی شاعر کسی بیت کے قوافی اصلی کی بنا چند مصاریع متفق الوزن و قافیہ پر رکھے اور قافیہ اصلی بیت کا مخالف مصاریع متقدم کے ہو اور وہ بیت مطلع ہوگی یا غیر مطلع پس جن بندوں میں مصاریع متقدم مع بیت اصلی طابق ہوں گے اور وہ بیت مطلع ہوگی تو مصاریع متقدم ہم قافیہ ہوں گے سات اس بیت مطلع کے۔ اور جو بیت غیر مطلع ہوگی بندہائے دیگر میں تو مصاریع متقدم ہم قافیہ ہوں گے بیت اصلی کے پہلے مصرع کے اور قافیہ مصراع آخر بیت اصلی کا ہر بند میں متفق بقافیہ بند اول ہوگا اور مخالف اپنے مصاریع متقدم سے اور جن بندوں میں مصاریع متقدم مع بیت اصلی متفق ہوں گی تو مصاریع متقدم

---

[1] مقیاس الاشعار صفحہ ۲۰ و ۲۱

[2] " صفحہ ۲۳

[3] " " ۲۴

[4] مقیاس الاشعار صفحہ ۲۶

قافیہ ہوں گی اور بیت اصل کے قافیہ مختلف ہوں گے مصاریع مقدم سے لیکن کبھی متفق بھی ہوتے ہیں، حالت تسدیس میں حالانکہ وہ مصاریع مع بیت اصلی جفت ہوتے ہیں اور حالت مربع و مثلث کا مثل مصاریع طاق کے ہے بلحاظ مطلع و غیر مطلع

قافیہ پس مسمط کی آٹھ قسمیں ہیں اور یہ مصاریع مسمط تین سے کمتر اور دس سے زیادہ نہیں ہوتے معشر، مثمن، مسبع، مسدس، مخمس، مربع، مثلث" [1]

سلام

(از مرزا محمد صادق صاحب صادق خلف رفیع صاحب اعلی اللہ مقامہ)

جب بہار آئی تو گلشن میں فنا بھی آئی قافلہ گل کا لئے بادِ صبا بھی آئی
تھا عجب صلِ علیٰ ثانیِ احمد کا جمال دیکھنے حسن جوانی کا قضا بھی آئی
حرملہ سے یہ کہا شاہ نے کیوں مارا تیر کچھ ترے ذہن میں بچے کی خطا بھی آئی
روضۂ شاہ پہ جنت کی ہوا بھی آئی مجرئی نکہت خونِ شہدا بھی آئی
سر اکبر پہ شہادت نے تو سہرا باندھا تھے جو بن بیاہے دلہن بن کے قضا بھی آئی
کہتی ہے رحمتِ حق بارشِ اشکِ غم سے جا کے میں آگ جہنم کی بجھا بھی آئی
اپنا آئینۂ دل صاف رہا اے صادق خود نمائی کی کدورت نہ ذرا بھی آئی

---

[1] مقیاس الاشعار ص ۲۸-۲۹

کاظم علی خاں

مرزا دبیر کے بعض نادر قلمی آثار

یہ مقالہ ماہنامہ آج کل دہلی ستمبر ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اب اس کو بعض اضافوں کے ساتھ سرفراز کے دبیر نمبر میں شامل کیا جا رہا ہے ـــــ کاظم علی خاں

مشہور مرثیہ نگار مرزا سلامت علی دبیر (متوفی ۳۰ محرم ۱۲۹۲ ہجری مطابق ۹ مارچ ۱۸۷۵ء) کے منظوم و منثور تحقیقات کی ایک بڑی تعداد شائع ہو کر منصۂ شہود پر آ چکی ہے لیکن اس کے باوجود دبیر کے قلمی آثار میں ابھی متعدد ایسے نوادر بھی موجود ہیں جو منظر عام پر آنے سے محروم رہے ہیں۔ زیر نظر مضمون میں مرزا دبیر کے بعض ایسے قلمی آثار پیش کئے جا رہے ہیں جو راقم الحروف کی نظر سے مطبوعہ صورت میں نہیں گزرے ہیں اور جن کے غیر مطبوعہ ہونے کا قوی امکان ہے۔ اس مضمون میں دبیر کے قلمی آثار کے علاوہ دو ایسے فارسی خط بھی شامل ہیں دبیر جن کے کاتب تو نہیں البتہ مکتوب الیہ ضرور ہیں۔

(۱) مرزا دبیر کی ایک غیر معروف غزل

مرزا دبیر صنف اول کے مرثیہ نگار تھے لیکن اُن کے قلمی آثار میں مرثیے کے علاوہ بعض دوسرے اصناف سخن کے بھی نمونے ملتے ہیں جن میں صنف غزل شامل ہے۔ دبیر کے سوانح نگار اس بات پر متفق ہیں کہ مشق سخن کے ابتدائی دور میں مرزا صاحب نے کثرت سے غزلیں کہی تھیں مگر کچھ عرصہ بعد اُنھوں نے غزل گوئی ترک کر دی اور اپنی غزلوں کو شہرت نہ دی۔ مرزا دبیر کی غزلیں اُن کے ایام شباب کی یادگار ہیں بعض تذکروں اور کتابوں میں مرزا صاحب کی محض چند مطبوعہ غزلیں ہی ملتی ہیں جو دبیر کے غزلیہ کلام کی کم یابی کی مظہر ہیں اور جن پر راقم السطور اپنے ایک طویل تحقیقی مضمون "مرزا دبیر کی غزل گوئی" میں مفصل بحث کر چکا ہے۔ ان مطبوعہ غزلوں کے علاوہ ایک قدیم قلمی بیاض میں مجھے مرزا دبیر کی ایک ایسی غزل بھی ملی ہے جو میری نظر سے مطبوعہ شکل میں نہیں گزری ہے۔ عجب نہیں کہ یہ غزل مرزا صاحب کے غیر مطبوعہ قلمی آثار کی حیثیت رکھتی ہو۔ مرزا دبیر کی نو دریافت غزل ذیل میں پیش کی جاتی ہے:۔

مرزا دبیر کی نو دریافت غزل

تل نمایاں نہیں ہے عارض جاناں کے تلے
ہے ستارا کہیں روشن مہ تاباں کے تلے

کیا ہی بے چین ہوئے نالۂ بلبل سُن کر
ٹھہرے اک دم جو کسی نخل گلستاں کے تلے

چاک سینہ کو مرے دیکھ کے ناصح بولا
لاکھوں ہی داغ ہیں یاں تیرے گریباں کے تلے

ہم تو چھٹنے کے نہیں ہمدمو اس دام سے آہ

اب تو دل چاہے بھنا زلف پریشاں کے تلے
ہاتھ چھاتی پہ مرے رکھ کے یہ حکمن نے کہا
دل نہیں آگ ہے یاں سینۂ سوزاں کے تلے
اس کو مت برق سمجھ، یہ جو فلک پر ہے چمک
ہے دبیر آہ تری گردش دوراں کے تلے

دبیر کی یہ غزل مجھے ایک قدیم قلمی بیاض میں ملی ہے جس کا نام "غزلیات (انتخاب از متفرق شعراء)" سلیمان قدر ہے۔ مذکورہ بیاض کا قلمی نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری میں [نمبر 591/43181 Rb 891 کے تحت] موجود ہے۔ اس مخطوطے کے اوراق کی تعداد ۱۷۳ ہے اور عام طور پر اوراق کے دونوں رخ مختلف شعراء کی غزلیں درج ہیں۔ اس طرح مخطوطہ ۲×۱۷۳ = ۳۴۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ نسخے میں کاتب کا نام، سنہ کتابت اور رقیمہ موجود نہیں۔ مرزا دبیر کے محولہ بالا غزل بیاض کے اوراق ۱۷۱ اور ۱۷۰ پر درج ملتی ہے۔ اس قلمی نسخے میں متعدد دوسرے شاعروں کا کلام بھی موجود ہے جن میں مندرجہ ذیل شعراء شامل ہیں:۔

(۱) میر (۲) مصحفی (۳) لطف (۴) نظیر (۵) آباد (۶) ترقی (۷) سلیمان وغیرہ وغیرہ

(۲) مرزا دبیر کا ایک غیر معروف مرثیہ

ریاست محمود آباد اتر پردیش کے نادر الوجود کتب خانے میں مرزا دبیر کے ایک ایسے مرثیے کا قدیم قلمی نسخہ موجود ہے جو مطبوعہ صورت میں میری نظر سے نہیں گزرا ہے۔ اس قلمی نسخے کے بارے میں ضروری تفصیلات ذیل میں درج ہیں:۔

(۱) مرثیہ کا مطلع: اے خالق سبحان تو مری عقل رسا کر
(۲) مرثیے کا مقطع: مقدور دبیر آگے زباں کو نہیں اصلا
(۳) تعداد بند: ایک سو چھ (۱۰۶)
(۴) کاتب کا نام: نشیل علی۔
(۵) زمانۂ کتابت: ربیع الاول ۱۲۶۲ ہجری

مرزا دبیر کا متذکرہ بالا مرثیہ رسول مقبول حضرت محمد مصطفیٰ کی بیٹی صدیقۂ طاہرہ حضرت فاطمہ زہرا کے حال میں ہے۔ مرثیے کے ابتدائی دو بند ذیل میں ملاحظہ ہوں:۔

اے خالق سبحان تو مری عقل رسا کر
اے عالم نسیان تو مرا ابہام عطا کر
اے صیقل ایمان تو مرے دل کو جلا کر
اے سرمۂ عرفان مری آنکھوں کی صفا کر
منظور نظر عصمت زہرا کی ثنا ہے
جس پر ہو گواہی یہ کہ ایک ہی ایک خدا ہے

عصمت کا اثر ہے زباں سے بھی نہ ہلے
عفت کا تقاضا ہے قلم سے نہ کرے رقم
اس مدح کے آغاز کا پھر کیوں کر ہو انجام
اب خالق اکبر کی طرف سے یہ ہے الہام
جس نام کو تو عرش پہ خالق نے لکھا ہے
خالق نے لکھا اور فرشتوں نے پڑھا ہے

اس مرثیے کا آخری بند ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

اب فاطمہ کے دفن کا احوال کہوں کیا
اب سوئے بقیع ہو بس اس طرح سے گویا
مقدور دبیر آگے زباں کو نہیں اصلا
یا فاطمہ یا سیدہ یا حضرت زہرا
یا بنت نبی منصورہ تو نام ہے سب میں
اب کیجئے نصرت مری اندوہ و تعب میں

زیر تبصرہ مخطوطے کے بارے میں مختصراً یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ اس کی کتابت چونکہ ۱۲۶۲ ہجری میں ہوئی ہے اس لحاظ سے یہ نہ صرف قدیم ہے، بلکہ دبیر (متوفی ۱۲۹۲ ہجری) کا معاصر قلمی نسخہ ہونے کا شرف رکھتا ہے۔ مخطوطہ مجلد ہے اور قدامت کے باوجود اچھی حالت میں ہے۔ اس میں سرورق

بیت آٹھ اوراق یا سولہ صفحات ہیں۔ مرثیہ سرورق کی پشت (ص ۲) سے شروع ہو کر ورق نمبر آٹھ یا صفحہ نمبر پندرہ پر ختم ہوتا ہے۔ ورق نمبر آٹھ کی پشت یعنی صفحہ نمبر ۱۶ سادہ ہے۔ ورق نمبر دو تا ساتھ کے دونوں جانب مرثیہ تحریر ہے۔ میں جناب امیر حیدر خاں صاحب مہاراج کمار ریاست محمود آباد کا انتہائی ممنون و متشکر ہوں کہ موصوف نے نہ صرف مرثیے کے بعض اجزا نقل کرنے کی اجازت دی بلکہ مخطوطے اور مرثیے کو ادبی حلقوں سے متعارف کرانے میں بھی پس و پیش نہ فرمایا۔ مرزا دبیر کے اس مرثیہ کا غیر مطبوعہ ہونا خارج از امکان نہیں۔

(۳) مرزا دبیر کا ایک غیر معروف فارسی قطعۂ تاریخ

کٹرا ابو تراب خاں لکھنؤ کا ایک قدیم اور مشہور محلہ ہے جہاں خان علامہ نواب تفضل حسین خاں (متوفی ۱۵ شوال ۱۲۱۵ ہجری مطابق یکم مارچ ۱۸۰۱ء) کے فرزند نواب تجمل حسین خاں مرحوم کے نام سے موسوم ایک قدیم امامباڑہ ہے۔ اس عزاخانے کے مشرقی دالان کی جنوبی دیوار میں نصب سنگ مرمر کی ایک پرانی لوح پر راقم السطور کو مرزا دبیر کا ایک فارسی قطعۂ تاریخ کندہ ملا۔ یہ سنگی لوح عرصے سے مقفل کی جہاں بند پڑی ہوئی تھی۔ خانوادۂ میر انیس کی ایک فرد میر ہادی صاحب لائق کی توجہ دہانی پر ۳۰ نومبر ۱۹۷۵ء کو عزاخانہ مذکور جا کر راقم الحروف نے جب چونے کی تہوں کو کھرچا تو دیوار میں نصب سنگ مرمر کی لوح نظر آئی۔ اس لوح پر مرزا سلامت علی دبیر کا جو فارسی قطعہ کندہ ہے وہ خان علامہ نواب تفضل حسین خاں کے خاندان کی ایک فرد نواب ارتضیٰ حسین خاں کے سنہ وفات سے متعلق ہے اور سنگی لوح کے جملہ مندرجات کے ساتھ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

. . . . . .

یا غفار تاریخ او چو فکر مرزا دبیر مدظلہٗ یا ستار
بست و پنجم و یک شنبہ از جمادی دویم
چہ شد کہ زلزلہ افگند بہ رنگ شیون و شین
مگر بہ خاک نہاں گشت ماہ برج کمال
کہ بود مطلع مہر امیر بدر و حنین
جناب خان بہادر رئیس اعظم ہند
فلک شکوہ، زمیں زیب، رونق کونین
قدر بہ کلک قضا ارتضیٰ حسین نوشت
خطاب عالی او با ہزار زینت و زین
ملک بسال وفاتش بگفت با دل صاف
بقصر لعل جنان شد ندیم بزم حسین
۱۲۹۱ ہجری

یہ قطعۂ تاریخ قطعی طور پر ارتضیٰ حسین خاں کی وفات یعنی ۲۵ جمادی الثانی ۱۲۹۱ ہجری کے بعد کہا گیا ہے اور چوں کہ خود مرزا دبیر کی تاریخ رحلت ۳۰ محرم ۱۲۹۲ ہجری ہے لہٰذا یہ قطعۂ تاریخ یقینی طور پر دبیر نے اپنی وفات سے محض چند ماہ قبل کہا ہے۔ گویا اس فارسی قطعۂ تاریخ کو مرزا دبیر کی عمر کے آخری دور کا کلام ہونے کا شرف حاصل ہے۔ مرزا دبیر کے مجموعۂ کلام دفتر ماتم کی بیسویں جلد میں مرزا صاحب کا متفرق کلام شائع ہوا ہے۔ دفتر ماتم کی اسی بیسویں جلد میں مسجد عظیم آباد کے متعلق دبیر کا ایک فارسی قطعۂ تاریخ ضرور ملتا ہے[۵] مگر مندرجہ بالا قطعۂ تاریخ موجود نہیں۔ تلاش کے باوجود دبیر کا مندرجہ بالا قطعۂ تاریخ مجھے مطبوعہ شکل میں کہیں نہیں مل سکا ہے۔ عجب نہیں کہ یہ دبیر کا غیر مطبوعہ کلام ہو۔

دبیر کے محولہ قطعۂ تاریخ کے برابر تجمل حسین خاں کے عزاخانے میں مجھے بعض اور بھی شعرا کے قطعات تاریخ سنگی لوحوں پر کندہ ملے ہیں جن میں میر انیس کا ایک فارسی

قطعۂ تاریخ بھی شامل ہے۔ میر نفیسؔ (فرزند و جانشین میر انیسؔ مرحوم) کے مذکورہ قطعۂ تاریخ کا پہلا اور آخری شعر ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

نواب ذوالاقتدار و شرف ارتضیٰ حسین
لختِ دلِ جناب تفضل حسین خاں

.....

تاریخ سال فوت نفیسؔ حزیں نوشت
زاہد جو او رفت سوے گلشنِ جناں

۱۲۹۱ ہجری

میر نفیسؔ کے اس قطعۂ تاریخ کے غیر مطبوعہ ہونے کا قوی امکان ہے۔ نفیس کے مقطع کے پہلے مصرعے میں اپنے تخلص کے ساتھ لفظ "حزیں" درج کیا ہے۔ ملحوظ رہے کہ میر انیسؔ کا قدیم تخلص حزیںؔ تھا۔ عجب نہیں کہ لفظ "حزیں" کے تصرف میں میر نفیسؔ نے اپنے والد میر انیسؔ کے اسی قدیم تخلص کی رعایت ملحوظ رکھی ہو۔ یہاں یہ عرض کرنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ نواب ارتضیٰ حسین خاں کی وفات پر مرزا دبیرؔ اور میر نفیسؔ کے قطعات تاریخ اس امر کے مظہر ہیں کہ خان علامہ کے خانوادے سے میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ دونوں ہی کے خاندانوں کے قریبی تعلقات رہے ہیں اور اس بات پر خان علامہ کے خاندان کے ایک رکن کی حیثیت سے مجھے فخر کا حق حاصل ہے۔

(۴) دبیرؔ کا ایک فارسی مکتوب اور دبیرؔ کے نام ایک فارسی خط

دبیرؔ کے متعدد فارسی مکاتیب شایع ہو چکے ہیں اور راقم کی نظر سے گزرے ہیں مگر راقم الحروف کو مرزا دبیرؔ کا ایک ایسا فارسی خط بھی ملا ہے جس کے غیر مطبوعہ ہونے کا قوی امکان ہے۔ یہ خط خود دبیرؔ ہی کی تحریر میں ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس خط کے مکتوب الیہ مولوی کمال الدین کا خط بھی موجود ہے جو دبیرؔ کے نام ہے۔ یہ دونوں خطوط ایک ہی کاغذ پر لکھے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں خطوط مجھے اپنے کرم فرما برادرم سید باسط حسن صاحب ماہرؔ لکھنوی سے ملے ہیں اور میں اُن کے لئے موصوف کا انتہائی ممنون و متشکر ہوں۔ ذیل میں مکتوب دبیرؔ بہ خط دبیرؔ کا عکس اور اس فارسی مکتوب کا اردو مفہوم پیش کیا جاتا ہے۔

عکسِ مکتوب دبیرؔ بہ خطِ دبیرؔ

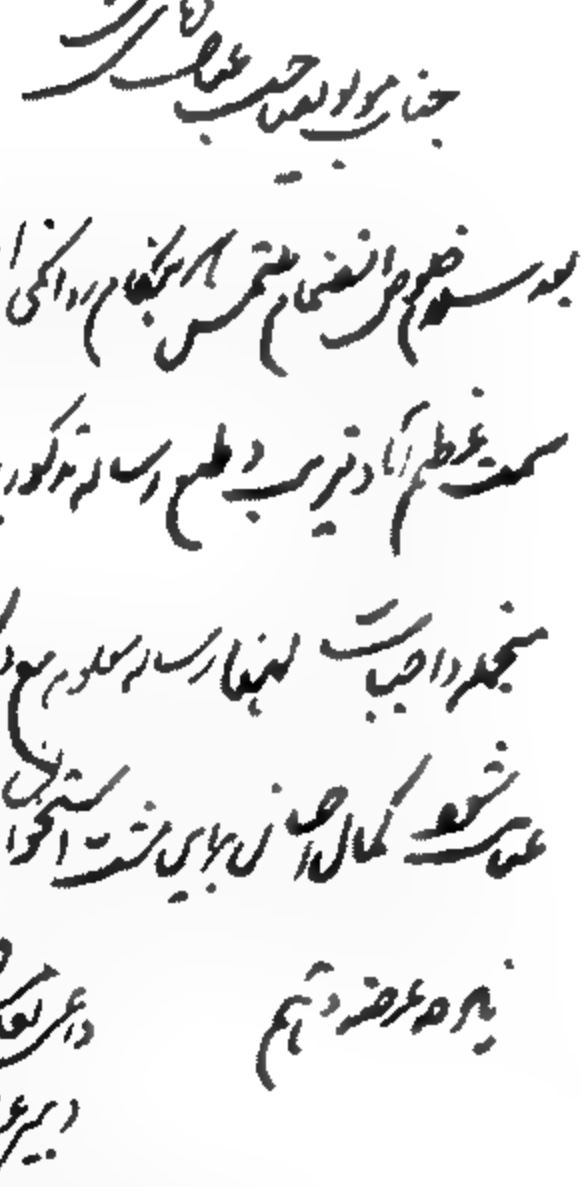

دبیرؔ کے فارسی خط کا اردو مفہوم

جناب مولوی صاحب عنایت فرمائے من دام مجدکم

بعد سلام خلوص انضمام التماس ہے کہ میرے عظیم آباد

جانتے وقت ہی رسالۂ مذکور کی ترتیب و طبع نہایت ضروری ہے لہٰذا رسالۂ مذکور مع دیوان وغیرہ عنایت ہو تو اس مشتاق کو ان پر بہت احسان ہوگا۔ زیادہ کیا تحریر۔

(دستخط) "دبیر عفی عنہ"

دبیر کے محولۂ بالا خط کے مکتوب الیہ مولوی کمال الدین نے دبیر کو جو فارسی خط لکھا ہے اُس کا عکس (بہ خط کمال الدین) ذیل میں ملاحظہ ہو:

عکسِ مکتوب مولوی کمال الدین بہ نام دبیر

دام اقبالکم و مدظلکم الی

بعد تسلیم عرض ہم امسہ دارام کہ امروز بسبب عرض حرارت
ہمہ نماز ہم آپ موقوف باشم از فردا مکرر
ہر روز ہا صرف نمودہ رسانم الساعۃ الدولۃ حکم
از پیرزادہ برای طبع کتابی دیگر ارسال نمودہ
صحیح الدین کمال الدین

مولوی کمال الدین کے مکتوب کا اُردو مفہوم

دام اقبالکم و مدظلکم

بعد تسلیم عرض ہے کہ آج بسبب بعض ضروریات کے جو نہایت اہم ہیں معاف رکھا جاؤں۔ کل سے روزانہ ایک جزو صاف کر کے انشاء اللہ تعالیٰ روانہ کروں گا بلکہ پرسوں سے طباعت اور کاپی وغیرہ کے لئے ارشاد ہو...

(دستخط) "کمال الدین"۔

مندرجۂ بالا دونوں مکاتیب تاریخ تحریر سے محروم ہیں مگر مرزا دبیر نے اپنے خط میں عظیم آباد جانے کا ذکر کیا ہے۔ مرزا صاحب کے سوانحی حالات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ہی سے دبیر نے سال بہ سال عظیم آباد سفر کرنا شروع کیا تھا[۵] ان اُمور کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں خطوط ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد لکھے گئے تھے۔ دبیر کے خط میں جس رسالے اور دیوان وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے اُس کے بارے میں ابھی تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔ دبیر کے خط کے مکتوب الیہ مولوی کمال الدین ہیں۔ افضل حسین ثابت نے بھی ایک بزرگ مولوی کمال الدین کا ذکر کیا ہے جو لکھنؤ کے مشہور عالموں میں تھے اور دبیر کے فرزند مرزا محمد جعفر اوج کے معلم تھے[۶] ہو سکتا ہے کہ دبیر کا محولۂ بالا مکتوب انھیں مولوی کمال الدین کے نام ہو اور دوسرے خط (بہ نام دبیر) کے کاتب یہی مولوی کمال الدین ہوں۔

(۵) میر ضمیر کا ایک فارسی خط اپنے شاگرد مرزا دبیر کے نام

دبیر کے اُستاد میر مظفر حسین ضمیر کے سوانحی حالات کے بارے میں اُردو تحقیق ابھی جن منزلوں سے گزری ہے اُن کے نقوش ہمارے پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی۔ لٹ کے بعض تحقیقی مقالوں میں دیکھے جا سکتے ہیں اور اُن کی مدد سے ہمیں یہ خوبی یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ضمیر کے بارے میں اُردو تحقیق کی سمت و رفتار کچھ زیادہ تسلی بخش نہیں۔ راقم الحروف

کو میر ضمیر کا ایک فارسی مکتوب ملا ہے جس کے مکتوب الیہ ضمیر کے شاگرد رشید مرزا دبیر ہیں۔ سطور ذیل میں دبیر کے نام اُن کے اُستاد میر ضمیر کا فارسی مکتوب اور اُس کا اردو مفہوم پیش کیا جاتا ہے۔

دبیر کے نام اُن کے اُستاد میر ضمیر کا فارسی خط

برہان من، استاد من، اعتقاد من، اعتماد من سلمہ اللہ تعالیٰ۔ بعد اشتیاق دیدار فرحت آثار واضح و لائح باد کہ از پنج روز ورم کلہ تا بہ ذقن و حرارت تب و شدائد جاع (کذا؟ وجاع)۔ بحدی دارم کہ قابل تحریر نیست۔ عند الملاقات مشاہدہ خواہند نمود۔ چوں کہ تاریخ بست و سوم ذکر دہ آں عزیز با تمیز است در اد تخالف نخواہد شد۔ ہمانا وقت تحصیل ثواب نمایند و یوم الجمعہ در عدم ملاقات تاسفہا خورزم۔ سلامی علیکم و قلبی لدیکم۔

رقیمہ ضمیر عفی عنہ[۹]

دبیر کے نام ضمیر کے خط کا اُردو مفہوم

میری دلیل، میری سند، میرے قوت بازو اور میرے اعتماد سلمہ اللہ تعالیٰ

بعد اشتیاق دیدار فرحت آثار واضح ہو کہ پانچ روز سے گلے کا ورم ٹھوڑی تک پہنچ گیا ہے اور بخار کی شدت اور درد کے تکالیف اس حد تک ہیں کہ قابل تحریر نہیں۔ ملاقات کے وقت آپ خود ہی ملاحظہ کرلیں گے۔ چوں کہ ۲۳ تاریخ آپ ہی کی مقرر کردہ ہے لہٰذا اب اُس میں کوئی رد و بدل نہ ہوگا اور اسی وقت ثواب حاصل کرلیں۔ جمعہ کے دن ملاقات نہ ہونے سے بہت صدمہ ہوا۔ سلامی علیکم و قلبی لدیکم

رقیمہ ضمیر عفی عنہ

میر ضمیر کے اس خط پر تاریخ تحریر درج نہیں لیکن خط کے مندرجات بتاتے ہیں کہ یہ خط ضمیر نے اپنی علالت کے دوران میں لکھا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ خط ضمیر نے اپنے آخری زمانے میں لکھا ہو۔ میر ضمیر کا سنہ وفات ۱۲۷۲ ہجری مطابق ۱۸۵۵ء متعین کیا گیا ہے[۱۰]۔ اس لحاظ سے یہ خط ۱۸۵۵ء یا اُس سے قبل لکھا جا چکا تھا۔

میر ضمیر کا یہ خط کئی اعتبار سے اہم قرار دیا جائے گا۔ اول تو یہ خط میر ضمیر کی اُس فارسی نثر کا نمونہ ہے جس کے بارے میں ہمارے پاس مواد کی قلت ہے۔ دوسرے یہ خط میر ضمیر کے بعض امراض کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ خط ضمیر اور دبیر یعنی اُستاد اور شاگرد کے باہمی تعلقات پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ انہی وجوہ کی بنا پر اس خط کی اہمیت ضمیر اور دبیر دونوں ہی کے مطالعے کے لئے مسلّم ہے۔ میر ضمیر کا یہ فارسی مکتوب ڈاکٹر اکبر حیدری کی کتاب میر ضمیر (تحقیقی مطالعہ)، مطبوعہ ۱۹۷۲ء پر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

حواشی

[۱] تفصیل کے لئے راقم الحروف کا مضمون "مرزا دبیر کے مجموعۂ کلام دفتر ماتم کی بیس جلدیں" مشمولہ ماہنامہ نیا دور لکھنؤ مارچ ۱۹۷۹ء (ص ۱۰ نیز ص ۱۶) ملاحظہ ہو۔ کاظم علی خاں

[۲] ر۔ک: (الف) حیات دبیر جلد اوّل: سید افضل حسین ثابت لکھنوی۔ سیوک الیٹم پریس، لاہور، ۱۹۱۳ء ص ص ۸۵/۸۶ (ڈاکٹر اکبر حیدری کی کتاب تحقیقی مطالعہ، اردو پبلشرز لکھنؤ ستمبر ۱۹۷۴ء (ص ۳۰۴) میں حیات دبیر کا سنہ اشاعت ۱۹۱۲ء درج ملتا ہے جو درست نہیں۔ کاظم علی خاں)

(ب) فکر بلیغ: مؤلفہ شاذ عظیم آبادی۔ مرتبہ رفیق احمد ارشاد۔ نسیم بک ڈپو۔ لکھنؤ۔ اگست ۱۹۷۴ء ص ۱۶۶۔

(ج) سبع مثانی: مرتبہ سید سرفراز حسین خبیر لکھنوی۔ ممتاز بک ایجنسی۔ لکھنؤ ۱۳۴۹ ہجری (تعارفی تحریر از ثابت لکھنوی) ص ۲۳۔

(۵) مرزا دبیر۔ سوانح و کلام۔ تحقیقی مقالہ۔ رائے پی ایچ۔ ڈی: ڈاکٹر مظفر حسن ملک [۱ (قلمی نسخہ) مملوکہ کتب خانہ سید مسعود حسن ادیب۔ لکھنؤ] اوراق ۵۵ تا ۵۹

۴ محمد کٹرا ابو تراب خاں، لکھنؤ کا ذکر مرزا رجب علی بیگ سرور نے اپنی مشہور کتاب فسانۂ عجائب (تالیف ۱۲۴۰ ہجری مطابق ۱۸۲۴ء) میں کیا ہے جو اس محلے کی قدامت پر دال ہے (ر۔ک۔ فسانۂ عجائب: رجب علی بیگ سرور، مرتبہ اطہر پرویز، سنگم پبلشرز، الہ آباد جون ۱۹۶۹ء ص ۱۰۸)۔

۵ ر۔ک۔ تاریخ آصفی: ترجمہ و ترتیب ڈاکٹر ثروت علی ادارۂ صبح ادب، دہلی ۱۹۶۸ء ص ۲۶ (فٹ نوٹ نمبر ۲) راقم خانِ علامہ نواب تفضل حسین خاں کے خانوادے کا ایک رکن ہے اور خانِ علامہ کے خاندان کو ملنے والی پنشن کے تحت حکومت سے کچھ ماہانہ رقم پاتا ہے۔

۶ دفتر ماتم جلد ۲: مرزا سلامت علی دبیر: مطبع دبدبۂ احمدی، لکھنؤ ۱۸۹۷ء ص ۲۴۸۔

۷ بحوالۂ واقعات انیس: مؤلفہ مہدی حسن احسن لکھنوی۔ اصح المطابع۔ لکھنؤ۔ طبع اول رسعاشاعت ندارد) ص ۲۸

۸ ر۔ک۔ حیات دبیر جلد اول: سید افضل حسین ثابت لکھنوی۔ سیوک اسٹیم پریس۔ لاہور ۱۹۱۳ء ص ۱۰۰ نیز ص ۱۰۲۔

۹ حیات دبیر جلد اول: ثابت لکھنوی۔ لاہور ۱۹۱۳ء (باب ۴) ص ۹۱۔

۱۰ بحوالۂ فارسی کتاب شمس الضحیٰ: مصنفہ مولوی صفدر حسین مطبع اثنا عشری (لکھنؤ ۱۲۹۸ ہجری) ص ص ۱۹۵/۱۹۴ ملحوظ رہے کہ یہ فارسی کتاب اب کمیاب ہے۔ راقم الحروف نے اس کا ایک بوسیدہ نسخہ مرزا دبیر کے حقیقی پرپوتے جناب مرزا محمد صادق صاحب صادق لکھنوی کے پاس دیکھا ہے میں اس خط کے لئے موصوف کا شکر گزار ہوں۔ ——— کاظم علی خاں۔

۱۱ ر۔ک۔ اردو مرثیے کا ارتقاء: ڈاکٹر مسیح الزماں کتاب نگر۔ لکھنؤ ۱۹۶۸ء۔ ص ۲۴۹

مضمون نگار کا پتہ:
کاظم علی خاں (ریسرچ اسکالر)
۱۰۱۔ وکٹوریا اسٹریٹ۔ لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۰۳

نامِ حسینؑ

"ح" نام میں ہے حق کی حمایت کے لئے
اور "سین" ہے سائل سے سخاوت کے لئے
ہیں نامِ حسینؑ میں بھی کیا خوب حروف
ی "نون" ہے تاریخ شہادت کے لئے

مدحِ امام حسینؑ

محتاجوں کو اغنیاء نے زر بخشا ہے
درماندوں کے آرام کو گھر بخشا ہے
احمدؐ کے نواسے کی سخاوت دیکھو
دشمن کو رہِ دوست میں سر بخشا ہے

ڈاکٹر سید نیر مسعود

مرزا دبیر کے مرثیے پر میر ضمیر کی اصلاحیں

والد مرحوم پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب صاحب کے ذخیرۂ مراثی میں شکستہ کاغذ پر لکھے ہوئے آٹھ صفحے ہیں جن پر مرحوم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی مندرجۂ ذیل یادداشت ہے:

"مرثیۂ دبیر

جب خانۂ زنداں میں سکینہ نے قضا کی

اس مرثیے پر بہ کثرت اصلاحیں دی گئی ہیں۔ ظن غالب ہے کہ یہ مرثیہ مرزا دبیر کا لکھا ہوا اور اصلاحیں میر ضمیر کے قلم سے ہیں۔

مرثیہ دوسرے صفحے سے شروع ہو کر آٹھویں صفحے تک چلا گیا ہے۔ اس کے آخری بند پہلے صفحے پر ہیں۔ اصلاح کے ساتھ ساتھ بندوں کی ترتیب میں بہت تبدیلیاں کر دی گئی ہیں۔

سید مسعود حسن رضوی"

یہ مرثیہ [illegible] مکمل ہے اور ان [illegible] کے نمبر ۷۲، ۷۴، اور ۷۵ بھی پڑے ہیں۔ مرثیہ سیاہ روشنائی سے لکھا ہوا ہے۔ اصلاحیں بھی سیاہ روشنائی سے ہیں۔ لیکن مرثیے کا عنوان "مرثیۂ دبیر سلمہ اللہ تعالیٰ در ذکر وفات سکینہؑ" سرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ بندوں پر نمبر باریک قلم اور سیاہ روشنائی سے ڈالے گئے ہیں مگر بعض بندوں پر سرخ روشنائی سے بھی نمبر پڑے ہیں اور بعض پر سرخ روشنائی سے دو نمبر پڑے ہیں مثلاً ۳۷ یا ۳۹ یا ۷۵۔ بظاہر یہ نمبر بندوں کی مجوزہ ترتیب کی نشان دہی کرتے ہیں۔

متن میں املا کی بعض غلطیاں بھی ہیں۔ مثلاً "عطرت" بجائے "عترت"، "ترم" بجائے "برہم"، "ثنا" بجائے "ثنا"، "تغعیر" بجائے "تغییر" اور "خوخو خطر" بجائے "خوف و خطر"۔ اور ان غلطیوں کی اصلاح نہیں کی گئی ہے۔

اس مرثیے کو بہ خط مرزا دبیر اور ان اصلاحوں کو ضمیر کے قلم سے ضمیر کی دی ہوئی اصلاحیں سمجھنے کا کوئی

لہ استاد مرزا دبیر

حتمی قرینہ موجود نہیں لیکن جیسا کہ ادیب مرحوم نے لکھا ہے ظنِ غالب یہی ہے کہ یہ مرثیہ مرزا دبیر کا لکھا ہوا اور اصلاحیں میر ضمیر کے قلم سے ہیں۔

مرثیے کے عنوان میں "دبیر سلمہ اللہ تعالیٰ"[1] کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ عنوان یقیناً مرزا دبیر نے خود نہیں لکھا، اور چونکہ بعض بندوں کے تبدیل شدہ نمبروں کی طرح یہ عنوان بھی سُرخ روشنائی سے لکھا گیا ہے اس لئے اس کا بھی یہ خطِ ضمیر ہونا قرینِ قیاس ہے۔

ذیل میں اس مرثیے کے متفرق بند پیش کئے جاتے ہیں جن میں اصلاح کی گئی ہے۔

نیر مسعود

"مرثیہ دبیر سلمہ اللہ تعالیٰ در ذکرِ وفاتِ سکینہؑ"

جب خانۂ زنداں میں سکینہؑ نے قضا کی
یعنی سرِ شبیرؑ پہ جاں اُس نے فدا کی
روکر کہا بانو نے کہ فریاد خدا کی
(بے جان ہوئی بیٹی امام دوسرا کی) اصلاح: "افسوس نشانی مٹی شاہِ شہدا کی"
مقتل میں تو اکبرؑ سے اور اصغرؑ سے چھٹی میں
زنداں میں اس لاڈلی دختر سے چھٹی میں

اس وقت نظر آتی ہے دنیا مجھے ویراں
اب موت جو آجائے تو نکلے مرا ارماں
ہیں رن میں حسینؑ اکبرؑ و اصغرؑ کے نگہباں
(یہاں قبرِ سکینہؑ کا نہ پہلو رہے سنساں) اصلاح: "سب لوگ کہیں بیٹی پہ مادر ہوئی قرباں"
فرزند تو ہیں شاہِ مدینہؐ کے برابر
بانو کی (نہیں) قبرِ سکینہؑ کے برابر اصلاح: "بنے"

حاکم نے ہمیں قید کیا ہے سرِ بازار
جو چاہو سو کہہ لو ہمیں سب کچھ ہے سزاوار

---

[1] "سلمہ اللہ تعالیٰ" کے الفاظ سے یہ یقین نہ کر لینا چاہیئے کہ ان کا لکھنے والا عمر میں مرزا دبیر سے بڑا ہوگا۔ یہ الفاظ چھوٹوں کے لئے اب مخصوص ہو گئے ہیں، پہلے اپنے سے بڑوں کو بھی "سلمہ اللہ تعالیٰ" لکھا جاتا تھا۔ (نیر مسعود)

تم ہو گئے گنہ گار (کہو گے جسا گنہگار
(قرآن میں ہمیں حق نے کیا) عترت اطہار
احوال پہ سادات کے (؟) نہ کرو تم
ہم سے نہ ڈرو قہر الٰہی سے ڈرو تم

اصلاح : "جو سمجھو گے"
اصلاح : "کونین پہ روشن ہے کہ ہیں"

ہر چند کہ ہوں ایک ردا کے لئے محتاج
پر سر پہ مرے آیۂ تطہیر کا ہے تاج
یہ خاک نشینی ہے ہمارے لئے معراج
(ہم حشر کے مختار ہیں محتاج ہیں) گو آج
قرآن میں دیکھو کہ زباں ہے وہ خدا کی
ہر آیہ میں اُس کی ہے ثنا آلِ عبا کی

اصلاح : "مختار ہیں ہم حشر کے ناچار ہیں..."

پھر شمر نے بازوے سکینہ کو جو پکڑا
(ماں بچیوں کو بے کس نے عجب یاس سے دیکھا
سب قیدیوں میں ایک قیامت ہوئی برپا
سجاد کے قدموں پہ مچل کر گری دُکھیا
یوں لپٹی تھی بھائی سے وہ اس خوف و خطر میں
اک ہاتھ تو گردن میں تھا اک ہاتھ کمر میں

اصلاح : "کُنبے کی طرف اُس نے"

جس طرح کہے تو تجھے سب لوگ سلا دیں
تو نازوں کی پالی ہے تا ناز اُٹھا دیں
(منظور ہے تو فرش ہم آنکھوں کا بچھا دیں)
وہ کہتی تھی میں سوؤں جو بابا مرے آ دیں
اب خوف نہیں مجھ کو خیالِ شبِ دیں ہے
سب کچھ ہے مگر سینۂ شبیرؑ نہیں ہے

اصلاح : "لوری دیں کہانی کہیں کاندھے سے لگا دیں"

کوئی نہ زرا رات کو بنت شہ ذی جاہ
گزری جو وہ شب صبح نمودار ہوئی آہ
بھجوا دیا زندان میں حاکم نے سب شاہ

(جس) سر کے لئے چشم سکینہ تھی سر راہ
لیں پہلے بلائیں سر شاہ شہدا کی
(سینے پہ تو سر رکھ دیا اور جان فدا کی)

اصلاح : "اُس"

اصلاح : "بے ساختہ بابا کہا اور جان فدا کی"

یہ (واقعہ) دیکھا حرم شاہ نے جس دم
(عاشورہ) کے دن سے بھی زیادہ کیا ماتم
سر پیٹ کے فرماتی تھی (بانو یہ بہ صد غم)
کیا خوب ملا زخم جگر کا مرے مرہم
مقتل میں تو اکبر سے اور اصغر سے چھٹی ہیں
زنداں میں اس لاڈلی دختر سے چھٹی ہیں

اصلاح : "حادثہ"
اصلاح : "عاشور"
اصلاح : "یہ بانوئے پُرغم"
(یہی بیت پہلے بند کی بھی ہے)

پھر بولی سکینہ کی وہ میت سے لپٹ کر
(اے بے کس و مظلوم پدر، عاشق مادر)
(تم مر گئیں داری یہ خیال آیا نہ دل پر)
بانو تو ہے محتاج کفن دیوے گی کیوں کر
پوچھے یہ کوئی درد اسیروں کے جگر سے
ہم رو نہیں سکتے ہیں تمھیں شرم کے ڈر سے

اصلاح : "اے بانوئے دلگیر ... مردے کے اُٹھانے میں ہے اب (کون سی) تاخیر ... تدبیر ... تو کھلا ہے ... دروازے پہ چھوٹا سا دھرا ہے"

عابد سے ابھی کہتی تھی یہ بانوئے دلگیر
ناگاہ کہا فضہ نے اے بانوئے شبیر
مردے کے اُٹھانے میں ہے اب (کون سی) تاخیر
رونا تو ہے تا عمر کرو دفن کی تدبیر
تیار جو (بابا) در زنداں تو کھلا ہے
تابوت بھی دروازے پہ چھوٹا سا دھرا ہے

اصلاح : "کس لئے"
اصلاح : "زنداں کا دروازہ بھی وا ہے"

یہ سنتے ہی (چلنے کو اُٹھا عابد دلگیر)
گردن سے ہوا طوق جدا پاؤں سے زنجیر
صندوق میں مردے کو رکھا بادل تغیر
(تابوت کو لے کر جو) چلی عترت شبیر

اصلاح : "اُٹھنے جو لگے عابد"
اصلاح : "اور لے کے جنازے کو . . . ."

صدمہ ہوا اس طرح کا بانوے حزیں پر
تابوت کے پیچھے گری غش کھا کے زمیں پر[1]

---

[1] مرزا دبیر کے مراثی کی جو مطبوعہ جلدیں میری دسترس میں ہیں اُن میں یہ مرثیہ موجود نہیں ہے۔ ضرورت اس کی تھی کہ اُن اصلاحوں کا مرثیے کی مطبوعہ صورت سے مقابلہ کیا جاتا۔ میں نے جناب کاظم علی خاں صاحب سے گزارش کی ہے کہ اگر اُن کو یہ مرثیہ مطبوعہ مل جائے تو براہِ مہربانی دونوں کا مقابلہ فرمائیں۔ (نیر مسعود)

نوحہ (بزبانِ جناب سکینہؑ) ـــــ دبیر اعلی اللہ مقامہ

کرتی تھی سکینہ یہ بیاں لاشۂ شہ پر، پیارے مرے بابا
بعد آپ کے کیا کیا نہ ستم ہو گئے مجھ پہ پیارے مرے بابا
صدقے گئی بابا میں عجب ظلم ہوئے ہیں بیٹی پہ تمھاری
اب دکھ تو مرا سُن لو ذرا از پئے حیدر پیارے مرے بابا
تم جیتے جو ہوتے تو طمانچے نہ میں کھاتی اور قید نہ ہوتی
تم ہوتے سلامت تو نہ چھنتے مرے گوہر پیارے مرے بابا
اس ننھی سی گردن میں رسن باندھی تھی بابا بے رحموں نے انہیں
باندھا تھا مرے ہاتھوں کو بھی شمر نے کس کر پیارے مرے بابا
اُس روز سے دُر کھینچے مرے کان سے بابا جو کان ہیں زخمی
سر ننگے پھرایا مجھے بازاروں میں در در پیارے مرے بابا
رستے میں اگر دیکھ کے میں روتی تھی بابا سر نیزے پہ تیرا
ہر جا پہ گھڑکتا تھا مجھے شمر ستمگر پیارے مرے بابا
بن باپ کا ہے مجھ کو کیا شمر لعیں نے اس چھوٹے سے سن میں
اللہ نہ بخشے اُسے تا عرصۂ محشر پیارے مرے بابا
اس طرح سے بے آس ہو فرزندوں سے اپنے یہ شمر جفا کار
جس طرح سے بے آس ہوئی تم سے یہ مضطر پیارے مرے بابا
کہلائیں اسی طرح سے بن باپ کے بچے اس شمر لعیں کے
جس طرح مجھے کہتے ہیں بن باپ کی دختر پیارے مرے بابا

کچھ دبیر کے تعلق سے

از کالیداس گپتا رضا

خواہرزادۂ غالب مرزا عباس بیگ معتقد دبیر

مرزا عباس بیگ کے بھتیجے نواب آغا مرزا بیگ (کارنامہ سروری ص ۵۱) کا بیان ہے کہ مرزا عباس بیگ ابھی پنجاب ہی میں تھے کہ انھوں نے برخلاف اپنے اہل خاندان کے اپنا مذہب تبدیل کرلیا یعنی وہ سنی سے شیعہ ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ ایک شب اصول نے خواب دیکھا کہ ایک چھینکے میں ایک سر بریدہ رکھا ہوا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ تم اہل بیت سے محبت رکھو۔ سالہائے دراز کے بعد جب وہ پنجاب سے لکھنؤ آئے تو دبیر سے ملاقات ہوئی انھیں دیکھ کر مرزا کو فوراً یاد آگیا کہ وہ سر بریدہ جو خواب میں انھوں نے چھینکے میں رکھا دیکھا تھا ہم شکل دبیر تھا اس کے بعد تمام عمر مرزا کٹر شیعہ رہے۔

سید افضل حسین ثابت (حیات دبیر ص ۳۸۹-۳۹۰) نے مرزا عباس بیگ کی دبیر سے گہری عقیدت کا ذکر کیا ہے بلکہ انھیں دبیر کا معتقد خاص لکھا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ وہ دبیر کے روبرو غالب کے اشعار پڑھا کرتے تھے اور دبیر جب کوئی داد دیتے تھے اور کہ غالب اپنے خطوط بنام عباس بیگ میں دبیر کو سلام لکھا کرتے تھے اور ایک نہ ایک پھڑکتا ہوا فقرہ بطور پیام ضرور تحریر فرماتے تھے۔

دلگیر کی شاگردی

اودھ اخبار لکھنؤ نے ۱۰ مارچ ۱۸۷۵ء کو مرزا دبیر کے انتقال کی خبر شائع کی اور لکھا کہ منگل کی آخر شب یعنی ۲۱ محرم ۱۲۹۲ھ کو یہ حادثہ واقع ہوا۔ پھر ۱۴ مارچ ۱۸۷۵ء کے پرچے میں دبیر کی سوانح عمری بھی اختصار کے ساتھ شائع کی جو اس طرح شروع ہوتی ہے:

"جناب مرزا سلامت علی دبیر فن مرثیہ گوئی میں بے مثل اور لاجواب تھے تمام ہندوستان میں آفتاب تھے سوا اس کے عابد شب زندہ دار تھے اور حاتم روزگار پندرہ سولہ برس کا سن تھا۔ شوق مافی الاسلام اور مرثیہ گوئی کا ہوا اور اصلاح سلام وغیرہ پر میاں دلگیر شاعر بے نظیر سے لی۔ بعد ازاں مرثیہ گوئی وغیرہ میں نام عالی پیدا کیا اور سب مشتاقین معزز ین کو اپنا شیدا کیا۔ میاں دلگیر صاحب ایسا شاگرد رشید و حمید پاکر خوشی سے (ص ۸۳) پھولے نہ سماتے تھے سوا ان کے اور کسی کو دل لگا کر نہ بتاتے تھے۔"

گارساں دتاسی جہاں میر ضمیر کو دبیر کا استاد تسلیم کرتے ہیں وہاں "پنجابی" کے ۱۰ مارچ کے پرچہ سے یہ اقتباس بھی درج کرتے ہیں۔ (مقالات گارساں دتاسی حصہ دوم ص ۲۰۰)

"مرزا دبیر مرثیہ گوئی کے فن میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے اور ان کے تقوے کا یہ حال تھا کہ ساری رات عبادت میں گزار دیتے تھے سخاوت میں اپنے وقت کے حاتم تھے کم عمری

---

۱ ۱۸۵۰ء کے اس پار ۲ ۱۸۵۰ء یا اس کے بعد ۳ تاریخ صحافت اردو۔ جلد دوم کا پہلا حصہ ص ۸۴

ملا دگیر کی تلقین پر سلام کہنے لگے تھے لیکن
ان کا جوہر مرثیے کی صنف میں آکر کھلا۔

تقریباً ۳۰ سال بعد افضل حسین ثابت حیات دبیر ص۲۷ پر تحریر فرماتے ہیں:۔

"فن شعر میں وہ (دبیر) میر مظفر حسین ضمیر مغفور کے شاگرد تھے مگر تمام اساتذہ کو نیکی سے یاد کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ سید حسین صاحب لطافت مرحوم (خلف الصدق امانت مغفور) نے مرزا (دبیر) صاحب سے بر سبیل تذکرہ پوچھا کہ کیا آپ کو دگیر مرحوم سے بھی تلمذ تھا فرمایا اگر تلمذ ہوتا تو میرا فخر تھا لیکن جھوٹ بولنا گناہ ہے مجھے یہ شرف نہیں حاصل ہوا"

حیات دبیر کے ص۶۱-۶۲ پر درج ہے:۔

"یہ بھی نانا مرحوم بیان فرماتے تھے کہ مرزا صاحب سے منشی دگیر مرحوم کو بہت محبت تھی اور وہ بہت قدر و منزلت فرماتے تھے۔ ایک مجلس میں ..... میر صاحب (میر علی مراد آبادی سوز خوان) نے سوز میں منشی دگیر مرحوم کا ایک مرثیہ پڑھا سامعین میں مرزا صاحب بھی تھے۔ شام کو حسب معمول مرزا صاحب کے مکان پر مجمع ہوا۔ ایک صاحب حاضرین میں سے بولے کہ میر علی صاحب نے آج جو مرثیہ پڑھا بے مثل تھا۔ مرزا صاحب نے بھی تعریف کی .... وہ صاحب بولے ..... کہ اب جب تک میر علی صاحب اس کو نہ تقسیم کریں جناب منشی دگیر کسی کو نہ دیں گے .....
اور میرا دل اس مرثیہ کو چاہتا ہے۔ مرزا صاحب نے فرمایا.... اگر کسی کی قوت حافظہ اچھی ہو تو وہ ایک دو زیادہ سے زیادہ تین مرتبہ غور سے سنکر یاد کر سکتا ہے..... اچھا ذرا آپ لکھئے تو سہی۔ اب جو وہ لکھنے بیٹھے تو مرزا صاحب نے ایک ایک بند کر کے وہ سب بند لکھوا دیئے۔ افضل نے مرثیہ لیکر بجائے شکریہ ادا کرنے کے مرزا صاحب سے کہا حضت (حضرت) لوگ کہا کرتے ہیں کہ منشی دگیر اور آپ مل کر مرثیہ کہا کرتے ہیں مرزا صاحب نے فرمایا استغفر اللہ۔ جھوٹے ہیں جو یہ کہتے ہیں بھلا جناب دبیر ایسے مشاق کو مجھ سے مدد لینے کی کیا ضرورت ہے۔ ذرا مرثیہ مجھے دیجئے انھوں نے مرثیہ دے دیا مرزا صاحب نے وضو کے لوٹے میں جو پاس رکھا ہوا تھا اس مرثیہ کو ڈبو دیا..... (اور کہا) مجھے یہ منظور نہیں کہ میں ان (دگیر) کا دل دکھاؤں اور ایک کامل فن کی تضحیک کا باعث ہوں"

[illegible] ہے کہ دبیر جناب ضمیر مرحوم [illegible] اور [illegible] دبیر کے روابط بہت زیادہ تھے اور آخر دم تک رہے۔ عین ممکن ہے کہ دگیر کی زندگی تک دبیر نے کم و بیش ان دونوں اساتذہ سے اصلاح لی ہو اور دگیر کے انتقال کے بعد صرف ضمیر سے (ضمیر دگیر سے آٹھ سال بعد مرے) مشورۂ سخن کرتے رہے ہوں ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ ایک مشہور مقامی اخبار اتنی اہم بات کو غلط لکھ دیتا افضل حسین ثابت[1] (مؤلف حیات دبیر) کی اوپر بیان کی ہوئی دونوں روایتیں بعد کی اختراعیں معلوم ہوتی ہیں جن سے کم از کم یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں دبیر کے تلمذ دگیر کی افواہ عام تھی۔

---

[1] ڈاکٹر مسیح الزماں اپنی مشہور کتاب "اردو مرثیہ کا ارتقاء" (ص ۲۴۶ و ۲۴۷) میں افضل حسین ثابت کی تحقیق کو ناقص قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں "ہمارا مطلب صرف یہ ہے کہ ثابت ایسے غیر محتاط لکھنے والے کی رائے پر بھروسہ کرنا مناسب نہیں"

ضمیمہ سید حسن لطافت کے دیوان "ریاض لطافت" مطبوعہ شوکت جعفری پریس کے صفحہ ۳۶۳-۳۶۴ پر دبیر کی وفات کا قطعہ تاریخ ہے جو نو اشعار پر مشتمل ہے آخری شعر یہ ہے ؎

ہاں الم سے سر اٹھا کر لکھ دے تاریخ وفات
باغ بلبل ہے ہندستاں لطافت ہے دبیر

اسی کا چھٹا شعر یہ ہے ؎

ہر طرح اللہ نے ان کو کیا تھا اہل دل
تھے رجوع قلب سے شاگرد دلگیر و ضمیر

لطافت کے اس شعر کی موجودگی میں افضل حسین ثابت (حیات دبیر صفحہ ۲۷) کی لطافت کی زبانی بیان کی ہوئی حکایت کہ دبیر نے کہا کہ اگر مجھے دلگیر سے تلمذ ہوتا تو میرا فخر تھا لیکن جھوٹ بولنا گناہ ہے مجھے یہ شرف نہیں حاصل ہوا۔ دلدست نہیں معلوم ہوتی ——

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ افضل حسین ثابت دبیر کو دلگیر کی شاگردی سے بری کر اتنے میں اس قدر کوشاں کیوں ہیں۔

لوح و قلم

غم لوح و قلم گوشہ ذبیحاہ کا ہے
فرمان ازل سے یہی اللہ کا ہے
جب سے کہ لکھا نام حسینؑ مظلوم
نقشہ قلم و دوات میں آہ کا ہے

سیاہ لباس کعبہ

ہر چند ہزار رنگ عالم بدلے
ممکن نہیں تاثیر محرم بدلے
باقی ہے ابھی دعوئ خون شبیر
کعبہ کیوں کر لباس ماتم بدلے

(مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہ)

ادارۂ یادگار دبیر

جناب مرزا رضا حسین صاحب (سابق اے ڈی ایم) جنرل سکریٹری، ادارۂ یادگار دبیر لکھنؤ

دنیائے ادب میں میر ببر علی انیس اور مرزا سلامت علی دبیر زندۂ جاوید ہیں اور تا قیامت زندۂ جاوید رہیں گے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ان دونوں مسلم الثبوت عظیم المرتبت شاعروں نے اپنے گراں قدر اور لاجواب مرثیوں سے اردو ادب کو مالا مال کر دیا اور اپنی منفرد اور ممتاز شاعری سے "بگڑا شاعر، مرثیہ گو" کی پرانی کہاوت کو باطل ثابت کر کے دکھا دیا۔ ان کا کلام آج تک مثل آفتاب و ماہتاب اردو ادب کی دنیا کو منور کیے ہوئے ہے۔ یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ فن اور فکر کی رفعت میں ان کے قبل اور ان کے بعد کا کوئی مرثیہ گو ان کا مماثل نہ ہو سکا۔ زبان کی پاکیزگی۔ نیز فکر و فن کے کمال سے انھوں نے نہ صرف ایک نئے طرز کی تخلیق ہی نہیں کی بلکہ شاعری میں وہ عظیم انقلابی کارنامہ انجام دیا جس کی اردو ادب کی تاریخ میں بلا شک و شبہہ کوئی مثال نہیں ملتی۔ جو جواہر پارے وہ چھوڑ گئے ہیں وہ اردو ادب پر یقیناً ایک ناقابلِ فراموش احسان ہے۔

یہ کوئی نئی بات نہیں کہ دو عظیم ہمعصر شخصیتوں کا جب مقابلہ کیا جائے تو کچھ حضرات ایک کو، کچھ دوسرے کو اور کچھ دونوں کو پسند کریں۔ صرف شعرا ہی کے نہیں اس قسم کے مقابلے ذاکروں۔ عالموں اور دیگر صاحبانِ علم و فن کے ہر دور میں ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ لیکن جب بعض شدت پسند حضرات ان ادبی مقابلوں کو ذاتی بنا دیتے ہیں اور مخالفانہ انداز اختیار کر لیتے ہیں تو ان میں تلخی پیدا ہو جاتی ہے جو انصاف پسند اور غیر جانبدار نقد کے لیے تکلیف دہ ہوتی ہے۔

"انیسیوں" اور "دبیریوں" کی ادبی نوک جھونک کے متعلق ملک کے ممتاز ادیب اور عالم مفتی محمد رضا صاحب انصاری ذنگی علی ۱۴ مارچ ۶۵ء کے "قومی آواز" میں تحریر فرماتے ہیں ——

"اردو مرثیہ گوئی کے دو ہی امام مانے گئے ہیں۔ میر انیس اور مرزا دبیر۔ دونوں بزرگ ہمعصر تھے اور وفات کے لحاظ سے ہم عہد بھی اور جیسا کہ ہوا کرتا ہے۔ دونوں کے قدر دانوں نے مرحوموں کی زندگی میں بھی اور ان کے بعد بھی باہمی برتری اور فوقیت ثابت کرنے کے لیے ادبی نزاعیں کھڑی کیں۔ ادبی نزاع جیسا کہ سب جانتے ہیں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ حقائق پر مبنی ہو وہ عموماً ایسے مقام پر پہنچ کر گھومتا کرتی ہے جہاں دونوں فریق اپنے کو جیتا ہوا سمجھتے ہیں اور ایک غیر جانبدار آدمی کسی فریق کی سوفیصدی تائید کرنے سے قاصر نظر آتا ہے۔ یہی حال "انیسیوں" اور "دبیریوں" کی ادبی نزاع کا نظر آتا ہے۔۔۔"

اس مختصر مضمون میں میری غرض نہ انیس و دبیر کا موازنہ ہے اور نہ ان پر کوئی مقالہ سپرد قلم کرنے کا ارادہ ہے۔ میں بھی ان لوگوں میں سے ہوں جو دونوں کی شاعرانہ عظمت کے قائل ہیں اور میں ان دونوں عظیم اور محترم شاعروں کو اس کا مستحق سمجھتا ہوں کہ ان کی بلند پایہ یادگار قائم کی جائے صرف نمائش کے لیے نہیں بلکہ دنیا کو ان کے ادبی معجزوں سے روشناس کرایا جائے۔ یہی ان کی سب سے اچھی یادگار اور اردو ادب کی ایک بیش بہا خدمت ہو سکتی ہے۔

بعید نہیں کہ بعض حضرات کو اب تک اس بات کا علم نہ ہو کہ ان دونوں عظیم شاعروں کی قبریں کہاں ہیں۔ ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میر انیس مرحوم اور ان کے خاندان کے دیگر ممتاز و معروف مرثیہ گو شعرا مثلاً نفیس۔ رئیس۔ سلیس۔ مونس۔ جلیس۔ قدیر۔ نیر۔ ساقی۔ ذکی۔ عارف۔ فائق وغیرہ کی قبور انیس مرحوم کے مکان سکونت کے قریب ایک بغیا میں واقع ہیں۔ یہ بغیا سبزی منڈی چوک لکھنؤ کے عقب میں

واقع ہے۔ اس محلہ کا نام چوبداری محلہ اور گلی کا نام کوچۂ میر انیس ہے۔ دبیر مرحوم کا مکان مسکونہ کوچۂ مرزا دبیر نخاس لکھنؤ میں واقع ہے۔ اس مکان کا ایک حصہ اب سروک شہنشاہ بلڈنگ کے بالکل قریب وکٹوریہ اسٹریٹ پر واقع ہے اور ان کی اہلی خواب گاہ اسی مکان کے ایک شکستہ کمرہ میں ہے جس میں اولاد، رفیع اور خاندان دبیر کے دیگر مرحومین مدفون ہیں۔

اس موقع پر یکلخت وقت مجھے پروفیسر سید مسعود حسن صاحب مرحوم یاد آتے ہیں جو مجھ پر اس وقت سے شفقت فرماتے تھے جب وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں لکچرر مقرر ہو چکے تھے اور میں زیر تعلیم تھا۔ دور ملازمت میں جب وہ کبھی یونیورسٹی کے کام سے کسی ایسے مقام پر تشریف لے جاتے جہاں میں تعینات تھا تو مرحوم نے ازراہ شفقت و محبت میرے ہی یہاں قیام فرما کر میری عزت افزائی فرمائی۔ مجھے ان کی پروقار اور وضعدار شخصیت کسی طرح نہیں بھولتی۔ جب میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر لکھنؤ آیا تو مرحوم نے مجھ سے اور ملک کے ممتاز افسانہ نگار سید علی عباس صاحب حسینی مرحوم سے وعدہ لیا کہ "یادگار انیس کمیٹی" کے قیام اور اس کے اغراض و مقاصد کو عملی جامہ پہنانے میں ہم دونوں ان کا پورا پورا ساتھ دیں گے۔ چنانچہ ہم نے ایسا ہی اور کئی سال تک ہم تینوں نے متحد ہو کر انیس کی یادگار قائم کرنے کے لیے دن رات کام کیا اور اب حکومت کی مالی امداد کی وجہ سے یادگار انیس کمیٹی کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

[illegible] اتنی استعداد اور قابلیت تو نہیں ہے کہ میں دبیر کے شاعرانہ فن پر تبصرہ کروں۔ لیکن دبیر کے متعلق شمس العلماء مولانا سید امام امداد صاحب اثر کی مندرجہ ذیل رائے سے میں بہت متاثر ہوا۔ "مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہ فی الجنۃ کا درجہ حوصلہ انسانی کو پست کر دینے والا نظر آتا ہے۔ آپ تمام تر صفات ملکوتی سے متصف اور مقاربین خاصان خدا سے تھے اولیائے خدا کی خوبیاں موہب العطایا نے حضرت کو بخشی تھیں۔ ان کی [illegible] اور ایثار [illegible] آفاق ہے۔ علم و فضل کے ساتھ توفیق عبادت بہت کچھ خدائے پاک نے عطا فرمائی تھی۔ اخلاق محمدی کا آپ پورا نمونہ تھے۔ جود و سخا، بذل عطا میں اپنا جواب آپ تھے۔ طبیعت بھی شریف اور غیور پائی تھی۔ منکسر مزاجی، خاکساری اور اور فروتنی میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ خوش مزاجی اور خوش اخلاقی آپ پر ختم تھی۔ ہرگز کبھی کسی کی غیبت نہیں کی۔ تازیست کسی سے ترش رو ہو کر نہ بولے۔ رفتار۔ گفتار سب یکتائے وقت تھے۔ بالمختصر آپکی خوبیاں حضرات اہلبیت کی خوبیوں کا پرتو تھیں حقیقت یہ ہے کہ جن حضرات کے آپ مدام تھے ان کے تفضلات آپکے شامل حال تھے۔"

امداد امام صاحب کی یہ رائے پڑھ کر میں نے اپنے دل میں سوچا کہ "افسوس ایسے فرشتہ خصلت انسان کے مرنے کے بعد دنیا نے اس کی قدر نہ کی۔ اس کی قبر کا نشان تک مٹ گیا۔ جس چھوٹے سے ہال میں قبر ہے اس کی چھت گر گئی۔ دیواریں منہدم ہو گئی ہیں۔ ہر طرف بلبے اور کھمبری اینٹوں کی پہاڑیاں نظر آ رہی ہیں۔" ان حالات سے متاثر ہو کر ۱۷ جنوری ۱۹۶۵ء میں نے ادارۂ یادگار دبیر قائم کیا جس کے صدر بابو مہابیر پرشاد صاحب شری واستو، نائب صدر مرزا محمد صادق صاحب عرف بابو صاحب فرزند مرزا محمد طاہر مرحوم رفیع۔ پروپیگنڈا سکریٹری، مرزا کاظم علی خاں صاحب لکچرر شیعہ کالج تھے اور میں جنرل سکریٹری تھا۔ اسوقت سید سرفراز حسین صاحب خبیر بھی حیات تھے جن کو اس ادارہ کے قیام سے بہت خوشی ہوئی تھی۔ لیکن افسوس ان کی عمر نے وفا نہ کی۔

انیس کی یادگار کے قیام کے لیے زیادہ تر روپیہ مرکزی حکومت حکومت جموں و کشمیر اور حکومت اتر پردیش سے حاصل ہوا۔ لیکن دبیر کی یادگار کے قیام کے لیے حکومت سے اس لیے کوئی امداد حاصل نہ ہو سکی کہ میں ۲-۳ سال تک سخت علیل رہا اور دہلی وغیرہ نہ جا سکا گو کہ اس کام کے لیے علالت کی حالت میں بھی میں نے بڑی بڑی شخصیتوں سے خط و کتابت کی لیکن ڈاکٹروں نے آنتوں میں کینسر کا شبہ ظاہر کیا اور میرے لیے بستر سے اٹھنا بھی مشکل ہو گیا۔ بیماری سے قبل یوپی کے ایک وزیر صاحب نے تقریباً بیس دفعہ دورہ کیا۔ لیکن کیا کچھ بھی نہیں۔ دو دفعہ

مہابیر پرشاد صاحب کو بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اس پر محنت کر کے چھوٹی چھوٹی چندہ کی رقموں سے کل تقریباً چوبیس سو روپیہ جمع ہوا تھا جس میں تقریباً آٹھ سو روپیہ رجسٹریشن، دستور العمل، اپیلوں، لیٹر ہیڈ، لفافوں کی طباعت، خط و کتابت، بیرس کی کتابت، متفرق اخراجات اور دبیر کے ایک غیر مطبوعہ مرثیہ (آمد خزاں کی گلشن خیر الوراپہ ہے) کی طباعت اور ۲۶ اور ۲۷ جون ۱۹۶۵ء کو افضل محل وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ میں شاندار طریقہ پر یوم دبیر منانے میں صرف ہوئے۔

باقی سولہ سو روپیے میں ایک ماہ تک دن دن بھر بیٹھ کر میں نے اس ہال کی چھت بنوادی جس میں دبیر مرحوم کی قبر ہے۔ فرش مرنگ اور سیمنٹ کا پختہ کرادیا۔ دبیر مرحوم کی قبر پر سنگ مرمر لگوادیا۔ دیواروں کی مرمت کرا کے ان پر پلاسٹر ہو گیا۔ لکھوری اینٹوں اور ملبہ کی پہاڑیوں کو صحن میں بچھوا کر کٹائی کرا کے صحن کو ہموار کرادیا۔ اندر جانے کے لیے جو دروازہ تھا وہ اتنا چھوٹا تھا کہ جھک کے جانا پڑتا تھا۔ اس کو کشادہ کرا کے سیڑھیاں بنوادیں۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں خود خریدنے جاتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر مرزا صادق حسین صاحب عرف بابو صاحب کا پورا تعاون حاصل نہ ہوتا تو اتنا کام ہونا بھی مشکل تھا۔

اس کے بعد میں ایک سال تک سے زیادہ پھر علیل رہا اور اب مجھ میں اتنی سکت نہیں ہے کہ میں خدمت کو انجام دے سکوں۔ جس میں بہت پیچیدگیاں اور مراحل ہیں اور پورا اسکیم کے لیے ڈیڑھ دو لاکھ روپیہ درکار ہے۔ کسی کی توجہ اس طرف پاتا نہیں۔

اتر پردیش کے گورنر عزت مآب اکبر علی خاں صاحب کی توجہ بھی میں نے دبیر کی یادگار کے قیام کے متعلق مبذول کرائی تھی جس میں اپنی پیرانہ حالی اور خرابی صحت کا بھی تذکرہ کیا تھا۔ جواباً موصوف نے تحریر فرمایا کہ جب آپ کی صحت اب اس قابل نہیں ہے کہ آپ اس خدمت کو انجام دے سکیں تو اب اس کام کو نوجوانوں کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہیے۔ موصوف کا مشورہ بالکل درست ہے اور مجھے بھی اس سے پورا اتفاق ہے۔

گل ہو نہ چراغ عمر جلتے جلتے
ہو جائے نہ چھاؤں دھوپ ڈھلتے ڈھلتے
چلنا ہے تو چل جلد زیارت کو دبیر
آ جائے نہ موت راہ چلتے چلتے

گر اس پہ غبار غم سر دوش بیٹھے
اغلب ہے ابھی فلک زمیں پر بیٹھے
حقا کہ گراں ہے سخن قتل حسین
اس ذکر میں آواز نہ کیونکر بیٹھے

الوداع

تصنیف کردہ مرزا سلامت علی دبیر لکھنوی
از جناب ڈاکٹر سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی پی ایچ ڈی (علیگ) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

واقعات کربلا کا یوں تو ہر منظر درد انگیز ہے مگر رسم "الوداع" کی ادائیگی بھی بڑی دل ہلا دینے والی ہے۔ کسی کو وداع کرتے وقت بہ تقاضائے بشریت انسان کے دل پر رنج وغم کی فضا طاری ہو جاتی ہے اور اگر وداع کے وقت جدا کی منزل طویل ہوتی ہے تو طرفین کو رنج وغم زیادہ ہوتا ہے جس کے سبب آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے ہیں اور انسان رونے لگتا ہے اور یہ انسان کی طبعی فطرت ہے۔ وداع سے متعلق عام واقعات کو دیکھتے ہوئے کربلا کے واقعات میں وداع کے مناظر نہایت اندوہناک محسوس ہوتے ہیں۔ جہاں بھائی جدائی سے بیٹیاں باپ سے اور باپ بیٹے بھائی بہن سے دوست دوست سے اور شوہر زوجہ سے وقت وداع ہمیشہ کے لیے جدا ہوتے ہیں بلکہ موت کی طرف قدم بڑھاتے ہیں۔ واقعات کربلا میں وداع کے ایسے ایسے دردناک مناظر سامنے آتے ہیں کہ انسان کا دل تڑپ جاتا ہے اور ان کے تصورات سے روح لرز جاتی ہے۔

مرثیہ گو حضرات نے "الوداع" کو بھی موضوع بنایا ہے اور اس موضوع پر نہایت بیکی نظمیں لکھی ہیں جو ایام عزا میں بنظر حصول ثواب پڑھی جاتی ہیں۔ الوداع عموماً عشرہ عزا کے اختتام پر صبح عاشورہ اور صبح چہلم پڑھی جاتی ہے یا امام باڑہ سے کسی شہید کے تابوت کی رخصت کے وقت پڑھی جاتی ہے جس سے رنج وغم کی فضا میں شدت پیدا ہو جاتی ہے اور حاضرین کی رقت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

میرے وطن جلالی ضلع علی گڑھ میں دو موقعوں پر "الوداع" پابندی کے ساتھ باحزن وملال پڑھی جاتی ہے ایک صبح عاشورہ اور دوسرے صبح چہلم امام باڑوں میں تعزیہ یا ضریح کے روبرو پڑھی جاتی ہے۔ چند ذاکرین مقررہ و معینہ دردناک انداز میں الوداع پڑھتے ہیں اور الوداع پڑھنے کی یہ رسم قدیم سے جاری ہے۔ صبح کا سہانا وقت اور اس وقت دردانگیز لہجہ میں الوداع کا پڑھنا قلوب حاضرین پر ایسا اثر انداز ہوتا ہے کہ بے ساختہ رقت طاری اور آنسو آنکھوں سے جاری ہو جاتے ہیں۔ یہ مشاہدہ ہے کہ بعد الوداع امام باڑوں کی رونق کم ہو جاتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ سید الشہداء حضرت امام حسینؑ کی سواری معہ دیگر شہدائے کربلا کی سواری کے آئی تھی جو رخصت ہو گئی۔

جلالی۔ شمالی ہند میں سادات ہمدانی کی آباد کردہ ایک قدیم بستی ہے یہ بستی عزاداری کے لیے قدیم سے مشہور ہے۔ سادات جلالی کا تعلق نوابان اودھ اور اودھ کے مراکز فیض آباد اور قدیم لکھنؤ سے رہا ہے۔ نواب شجاع الدولہ بہادر نے ۱۷۷۴ء میں عشرہ محرم کی عزاداری جلالی میں کی آپ معہ لشکر وارد جلالی ہوئے۔ نواب فرخ آباد نواب مظفر جنگ بنگش بھی آپ کے ہمراہ تھے اور یہ زمانہ عشرہ محرم جلالی میں شیعہ ہوئے جیسا کہ فرخ آباد کی تاریخوں

سے واضح ہے۔ نواب آصف الدولہ بہادر نے موضع مبارکپور (ضلع ایٹہ) بہ رسم سید خیرات علی معہ فرزندان وقف و معاف علی الدوام کہ جس سے امام باڑہ سید خیرات علی واقع حصار جلالی کے مصارف تاحال تکمیل پاتے ہیں۔ سادات جلالی نے عزاداری کے فروغ کے سلسلہ میں مرکز اودھ لکھنؤ سے بہت استفادہ کیا ہے۔ سادات جلالی نے میر انیس و مرزا دبیر اور آپ کے ممتاز شاگردان کے منتخب مراثی اور دیگر کلام حاصل فرمایا اور اسے ایام عزاء میں رواج دیا۔ لکھنوی طرز پر عالیشان امام باڑے تعمیر کرائے اور اعلیٰ پیمانہ پر عزاداری کو رواج دیا۔ مرزا دبیر علیہ الرحمہ کا جو کلام جلالی میں رائج ہے اس میں "الوداع چہلم" نمایاں حیثیت رکھتی ہے اس لیے کہ پابندی کے ساتھ قدیم سے تاحال اس کا صبح چہلم جلالی کے امام باڑوں میں جاری ہے۔

جلالی میں صبح عاشورہ جو الوداع قدیم سے پڑھی جاتی ہے اس کے مصنف جناب کاتب علیہ الرحمہ ہیں جن کا تاریخی تعارف حاصل نہ ہو سکا۔ جناب کاتب نے یہ الوداع ۱۱۵۹ھ میں تصنیف فرمائی تھی جیسا کہ اس الوداع کے مقطع سے واضح ہے ملاحظہ ہو ؎

یکہزار و یکصد و پنجاہ و نہ ہجری کے سال
ہو چکے ہیں جب کہ کاتب نے کہا ہے الوداع

اس الوداع کا مطلع حسب ذیل ہے ؎

جب حسینؑ رن کو چلے رو رو کہا ہے الوداع
سب حرم کے تئیں بلا کر یوں کہا ہے الوداع

جناب کاتب نے اس الوداع میں سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کا روز عاشورہ اپنی بہن حضرت زینبؑ اور اپنی پیاری بیٹی حضرت سکینہ علیہا السلام اور دیگر حضرات اہلحرم علیہم السلام سے وداع ہونا اور سب کو صبر و رضاء کے ساتھ تسلی و تشفی دینا نہایت غم انگیز انداز میں نظم فرمایا ہے کہ صبح عاشورہ جس کو سن کر حاضرین بے تاب بیقرار ہو جاتے ہیں۔ اور یہ رسم عزاء ایک ایسا طریق توسل ہے جو موجب ثواب دارین ہے۔

تاریخ عزاداری کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ شمالی ہند میں اولاً عشرہ محرم کی عزاداری جاری ہوئی تھی زبان اودھ نے عزاداری کو لکھنؤ میں فروغ دیا اور چہلم تک بڑھایا تو دیگر مقامات پر بھی عشرۂ چہلم میں عزاداری جاری ہوئی۔ عشرہ محرم میں چونکہ الوداع کا رواج عام تھا اور یہ ایک مقبول عام رسم عزاء تھی لہذا جب مرزا دبیر نے عروج پایا تو آپ نے عشرۂ چہلم کے لیے بھی ایک الوداع تصنیف فرمائی جو لکھنؤ اور دیگر مقامات عزاء پر جاری ہوئی اور سادات جلالی نے بھی لکھنؤ سے اس الوداع کو حاصل فرمایا اور صبح چہلم اپنے عزاخانوں میں اس الوداع کو جاری کیا اور پھر ایسی مقبول ہوئی کہ جلالی میں تاحال اس کا رواج پابندی کے ساتھ جاری ہے۔

مرزا دبیر علیہ الرحمہ نے الوداع چہلم میں سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کے ۱۰ محرم کا روز چہلم شہداء کربلا کے مزاروں سے وداع ہونا اور مزاروں کو رخصت کرنا نہایت میلی طریقے پر نظم فرمایا ہے خصوصاً اس موقع پر حضرت زینب علیہا السلام کے بین بڑے غم انگیز انداز میں بیان فرمائے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک بے مثل الوداع ہے جو بیحد مقبول ہوئی ہے

مرزا دبیر کی تصنیف کردہ الوداع چہلم ذیل میں ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔

اربعین کے سوگوارو الوداع
شاہدین کے دوستدارو الوداع
خاتمہ بالخیر چہلم کا ہوا
الوداع اے اشکبارو الوداع
کہہ رہے ہیں مرقدوں پر اہلبیت
فاطمہ زہرا کے پیارو الوداع

دشت سونا پاس بستی بھی نہیں
بے دیاروں کے مزار الوداع
کربلا کے چاند کو سونپا تمہیں
عرش اعظم کے ستارو الوداع
اکبر و اصغر علیؑ کی ضامنی
نوجوانوں خیر خوارو! الوداع
کہتی تھی زینبؑ یہ قبر شاہ سے
تم بھی زینبؑ کو پکارو الوداع
قبر سے آواز ہوتی تھی بلند
لو بہن زینب سدھارو الوداع
بخیہ و مرہم نہ زخموں کا ہوا
مرتضیٰ کے رشتہ دارو الوداع
گھر کہیں کنبہ کہیں قبریں کہیں
اے غریبو بے دیارو الوداع

قبر پر بیٹوں کی زینبؑ نے کہا
ماں وطن جاتی ہے پیارو الوداع
تو بھی اپنا پیٹ کر سر کہہ دبیر
فاطمہؑ کے گلعذارو! الوداع

الحاج جناب سید وصی الحسن صاحب ایڈوکیٹ جلالوی (ساکن حال آنا ڈ) جلالی میں الوداع کی مقبولیت کے پیش نظر جناب کاتب علیہ الرحمہ کی الوداع محرم اور جناب دبیر علیہ الرحمہ کی الوداع چہلم بنظر ثواب عرصہ ہوا شائع فرما چکے ہیں اور حال میں آپ کے برادر محترم فخر قوم الحاج خان بہادر سید محمد عباس صاحب جلالوی نے الوداع اور مہندی کے سلام بھی امامیہ مشن لکھنؤ سے شائع کرا کے تقسیم فرمائے ہیں پروردگار عالم ان بزرگوں کو اس مقبول و متبرک کلام کے تحفظ میں سعی کے لیے ثواب دارین سے نوازے۔

آمین

قطعۂ تاریخ وفات دبیر

آپ کے شاگرد منیر شکوہ آبادی نے آپ کے انتقال پر قطعۂ تاریخ کہا۔

آہ ز دست جہاں جانب باغ نعیم
با دل شادماں گرفت راہ جناب دبیر
مرثیہ گوئی از او دولت معراج یافت
بود دریں مملکت شاہ جناب دبیر
سال وفاتش چنیں گفت منیر حزیں
ذاکر آل نبیؐ آہ جناب دبیر

(۱۲۹۲ھ)

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری

مرزا سلامت علی دبیر

(ایک تحقیقی اضافہ)

مرزا سلامت علی دبیر تخلص، دہلی میں محلہ بلی ماران متصل لال ڈگی میں ۱۱ر جمادی الاول ۱۲۱۸ھ ہجری مطابق ۲۹ر اگست ۱۸۰۳ء کو پیدا ہوئے۔ "بخت دبیر" ان کی تاریخ ہے جس سے ۱۲۱۸ برآمد ہوتے ہیں۔ دبیر کے تفصیلی حالات کے لئے راقم الحروف کی کتاب "شاعر اعظم مرزا سلامت علی دبیر" مطبوعہ اردو پبلشرز لکھنؤ ملاحظہ ہو۔

مرزا دبیر اردو کے بہت بڑے شاعر ہیں معاصرین انھیں ایک خوش فکر، بلند خیال اور مسلم الثبوت استاد تسلیم کرتے تھے۔ مرزا رجب علی بیگ سرور انھیں باکمال مرثیہ گو سمجھتے تھے[1] مرزا غالب کی رائے میں وہ مرثیہ کے فن میں سب سے سبقت لے گئے تھے[2] مرزا دبیر فصاحت بیان اور پرگوئی کے سبب مشہور تھے۔ نجات عظیم آبادی ۱۲۵۹ ہجری مطابق ۱۸۴۳ء میں لکھنؤ کی ایک سیاحت پر آئے تھے۔ انھوں نے قیام لکھنؤ میں مرزا دبیر کی مجلسیں کئی مرتبہ سنیں۔ وہ اپنی قلمی و غیر مطبوعہ کتاب سفرنامہ میں ان کی مرثیہ گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:[3]

"بتاریخ بست و پنجم رفتن راقم بالاخانہ میر باقر و استماع نمودن مرثیہ از زبان مرزا دبیر صاحب در حال شہدائے کربلا کہ در ۱۲۵۸ ہجری شربت شہادت چشیدند امام باڑہ ... با کمال تکلفات از جھاڑ و فانوس رنگارنگ و دیوارگیر معائنہ نمودہ۔ یکپاس روز براہ جناب مرزائے دبیر بہ منبر رفتہ مرثیہ طولانی بکمال بلاغت و متانت در حال شہدائے کربلا کہ در ۱۲۵۸ ہجری بماہ ذی الحجہ از جور و جفائے بعد ایشان درین ایام اتفاق افتادہ۔ چنانچہ ذکر آن در بعضے تاریخہا نیز بقلم آمدہ خواند۔ حضار مجلس را کہ از ہزار افزون بودند بگریہ در آوردند۔ الحق کہ شاعر در فصاحت بیان و پرگوئی و خوش خوانی نظیر ندارد۔"[4]

نجات عظیم آبادی ایک اور جگہ مرزا دبیر کے حلیہ کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ:

"بتاریخ بست و ہشتم روز پنجشنبہ

باز چون نادرستی طبع نیم و پاس روز بر آمده
بمجرد تشریف آوردن نواب مرزا صاحب
بشوق سماعت مرثیہ از زبان مرزا دبیر
صاحب بمکان امام باڑہ محمد مرزا صاحب
کہ رئیس میراث صاحب جاگیر و اہل ذیقعدہ
بنا رفتہ مگر تا آں زمان مجلس تمام شدہ بود
مرزا دبیر صاحب از منبر فرود آمدہ بودند
و بعد فراغ از تقسیم شربت نواب مرزا صاحب
... تمنائے این غریب الدیار بعید الوطن
پیش وحید زمن یگانۂ وقت در شعر و سخن
— جناب مرزا دبیر کہ جثہ منحنی و
قامت میانہ و سبزہ رنگ مائل بہ سیاہی
دارند، ردائے مناسب و سرخ رنگ
بر دوش و زیر منبر نشستہ بودند رفتہ ذکر
ایشان را قلم بادشاہی عرض داشتند و راقم
را قریب طلبیدہ بملاقات در پیش خانۂ
مرزا کریم بیگ مستفید گردانیدہ" [۵۵]

مرزا دبیر اپنے اُستاد میر ضمیر (متوفی ۱۲۷۲ ہجری مطابق ۱۸۵۵ء) سے منحرف ہو گئے تھے۔ اس کی تصدیق سعادت یار خاں ناصر[۵۶] اور مولوی محمد حسین آزاد سے بھی ہوتی ہے[۵۷]۔ نجات عظیم آبادی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے کہتے ہیں کہ ایک دن رہ گیا راجہ کی مجلس میں مرزا دبیر کے گھر مجلس سننے گئے تھے۔ انھوں نے اپنا نیا مرثیہ تحت اللفظ میں پڑھا۔ مجلس میں منیر شکوہ آبادی نے بھی اپنا مرثیہ پڑھا جس طرح دبیر اپنے اُستاد سے منحرف ہو گئے تھے اُسی طرح ایک دن منیر بھی اپنے اُستاد (مرزا دبیر) سے انحراف کریں گے۔ مثل مشہور ہے چاہ کن را چاہ در پیش۔ اس بات کی کوئی شہادت نہیں ملتی ہے کہ منیر مرزا دبیر سے کبھی بگڑ گئے تھے۔

سید احمد حسن فراقی اپنے وقت میں بہت بڑے انشا پرداز اور صاحب دیوان تھے۔ فارسی کے وہ یگانۂ روزگار ادیب تھے۔ انشا پردازی میں "انشائے فراقی" اُن کی عدیم النظیر تصنیف ہے۔ وہ مرزا دبیر کے بڑے عقیدت مند، ذی اور مداحوں میں تھے اور اُن کے کمال سے اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ ذی الحجہ ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۸ء میں اپنے وطن میرٹھ سے سفر کی صعوبتیں اُٹھا کر مرزا کی ملاقات کے لئے لکھنؤ گئے۔ مرزا اُس زمانے میں عظیم آباد گئے تھے۔ فراقی صاحب بغیر ملاقات کے بے نیل مرام واپس لوٹے۔ اس ناکامی سے اُنھیں بے حد افسوس ہوا۔ اُنھوں نے ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۶۹-۷۰ء میں مرزا دبیر کو دو خط لکھے۔ ان میں اُن کی شاعری کو بہت سراہا گیا۔ وہ مرزا کا بے حد احترام کرتے تھے اور انھیں "سرخیل صاحب کمالان" "صدر بزم انجمن" "جادۂ مقالان معجز آیات" "مہمات" "یگانۂ عناصر و جہات" کہتے تھے[۵۹]۔ اُن کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ دلی میں مرزا دبیر کی مرثیہ گوئی کی دھوم مچی تھی اور بعض اوقات اس چرچے کی نوبت بحث و مناظرہ تک پہنچتی تھی۔ چنانچہ ایک خط میں مرزا دبیر کو لکھتے ہیں:۔

"سلامیکہ مشکبار زبان و عبیر
ببرائے صبا از رہے بر دبیر
از آنجا کہ صیت کمال و شہرت اخلاق
آں گزیں اعصار را دوار لب تالب گیتی فرا
بیدہ است۔ رہائے فصاحت آں شہباز قلۂ
مجد و اعتلا بر تمامی روئے زمین سایہ افگندہ
پیوستہ آرزوئے لقائے شریف می بردم ہفت
ہشت سال در دہلی با جمعی پریشان بداندیشان
... وصف حال اینانست ندیدہ اخفیت
ز ارجحیت خدام بر جملہ شعرائے ہند تحسین
و تعارف و لطائف کہ در طے مراقی او راج یافتہ

بمباحثہ و مناظرہ می رفت ... دارا یرادات
شان نوعی جواب دادہ می آمد کہ موجب
حیرت و استعجاب ہمگناں می گردید" [۱۰]

سعادت خاں ناصر لکھنوی بھی مرزا دبیر کی تعریف میں رطب اللساں ہیں۔ کہتے ہیں کہ :-

"عطارد نظیر میاں دبیر، جودت اس کی طبع کی تقریر سے باہر اور تحریر سے زیادہ، طبیعت اس کی مضمون کے پیدا کرنے پر آمادہ، مرثیہ گوئی میں گوئے سبقت ہمگناں سے لے گیا ہے اور زمین سلام کو اس کی فکر بلند نے آسمان کیا۔ مرثیہ لاجواب، ہر بند اس کا انتخاب۔ ایک ہم کیا ہزار زبان سے اس کا اشتہار، جو شہرت اس نے پیدا کی ہے بیان اس کا خیلے دشوار ہے۔ ... خوش تقریر طرۂ دستار میر ضمیر ہے۔" [۱۱]

اردو کے نامور محقق جناب مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی ثم پاکستانی جو مرزا غالب کے دوست ذوالفقار الدولہ حسین میرزا کے خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ ان کے کتب خانے میں مرزا دبیر کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مرثیوں کے علاوہ کچھ فارسی خطوط بھی محفوظ ہیں۔ ان میں سے ایک خط مولانا سید محمد عنایت حسین تخلص متین سامانی سہارنپوری کے نام تحریر فرمایا ہے۔ مرزا دبیر متین سہارنپوری کو بہت مانتے تھے۔ فاضل لکھنوی نے یہ خط ماہ نو کراچی کے دبیر نمبر مطبوعہ ۱۹۷۵ء میں شائع کیا ہے۔ ذیل میں اس کی نقل پیش کی جاتی ہے :-

"ضیاء المشرقین، کہف الثقلین، فراز نامۂ چتر دین مبین، فرزند ارجمند شمع شرع متین، دام مجدکم۔

بعد سلام مسیکہ از اقدامش چمن اسلام در انتظام داز ارقامش گلشن کلام نضارت انضمام است۔ گزارش آنکہ ترا ذریعہ انامل تقدیس شمائل را اگر حرز بازو سے مفاخرت دانم بجا و چون صحیفہ ادعائے عادت خواہم بود۔ خاطر ان دل بہ تن ... عقیدت فدائے زہائے ارادت محو ادج ترقی ... اشتیاق ... تمنا ... است ... عزم سفر ... تقدیم ... عیادت معذور ... خدمت ... برکت ... عمر ... اگر حیات مستعار باقی است بعد معاودت استفادۂ صحبت سراسر افادت می کنم بشافی حقیقی صحت کامل و شفائے عاجل کرامت دخول حیات عنایت فرماید۔ والسلام۔"

لفاظ پر مرزا دبیر کی تحریر یہ درج ہے :-

"بعونہ و عنایتہ۔ بنظر رفعت اثر عرش معراج، پیغمبر فصاحت، طیر رابد، نور کلیم بلاغت، شمس اصابع تقدس منابع، ضیاء المشرقین کہف الثقلین فراز نامۂ چتر دین مبین، فرزند ارجمند شمع شرع متین جناب کرامت انتساب حضرت مولوی سید عنایت علی صاحب حسینی دام مجدہ فائز باد۔

دائمی بقا مشتاق لقا

دبیر عفی عنہ

"شمس الضحیٰ" میر صفدر حسین کی ایک نایاب تصنیف ہے۔ جو مرزا دبیر کے حالات زندگی پر پہلی مستند کتاب قرار دی گئی ہے۔ یہ کتاب ۱۲۹۵ھ میں شائع ہوئی۔ اس میں ص ۱۶۱ پر مرزا دبیر کے نام میر ضمیر کا ایک خط بھی درج ہے جس کی نقل ذیل میں پیش کی جاتی ہے :-

"مکتوب اُستاد الشعراء جناب میر مظفر حسین صاحب قبلہ متخلص بہ ضمیر بنام مرزا دبیر"

مرزا دبیر صاحب۔ بُرہان من اعتضاد من اعتماد من سلمہ اللہ تعالیٰ۔ بعد اشتیاق دیدار فرحت آثار واضح و لائح باد کہ از پنج روز ورم کلہ تا بہ ذقن و حرارت تب و شدائد اوجاع بحدے دادم کہ قابل تحریر نیست عند الملاقات مشاہدہ خواہند نمود۔ چونکہ تاریخ بست و سوم مقرر کردہ آں عزیز باتمیز دست دراز تخالف بخواہد شد۔ بہماں وقت تحصیل ثواب نمایند و یوم الجمعہ در عدم ملاقات تا مغہا خوردم۔ سلامی علیکم و تحیتی لدیکم۔

راقم ضمیر عفی عنہ۔"

مرزا دبیر کا انتقال ۹ مارچ ۱۸۷۵ء کو ہوا۔ اُن کے انتقال کے بارے میں اودھ اخبار لکھنؤ میں جو خبریں اور مضامین شایع ہوئے تھے۔ وہ مرزا صاحب کی زندگی اور مرثیہ گوئی پر اچھی خاصی روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ اخبار اب نایاب ہے۔ راقم کو اس کی ایک فائل ۱۸۶۳ء سے ۱۸۷۵ء تک لکھنؤ میں دستیاب ہوئی تھی اس لئے ذیل میں مرزا دبیر سے متعلق بعض اہم اقتباسات درج کئے جاتے ہیں۔

اودھ اخبار مورخہ ۱۰ مارچ ۱۸۷۵ء مطابق یکم صفر ۱۲۹۲ھ

"جناب مرزا دبیر کی وفات

ہیہات۔ ہیہات۔ ہیہات۔ ہیہات۔ صد ہزار حیف کہ اقلیم سخن لٹ گئی۔ آفتاب کمال غروب ہو گیا۔ مرثیہ گوئی کا خاتمہ بالخیر ہوا۔ یعنی افصح الفصحا، ابلغ البلغا، سحبان زماں، طوطی ہندوستان، شاعر بے نظیر جناب مرزا دبیر نے وقف اندوہ انیس ہو کر شمع ساں اپنے جسم ناتواں کو گھلا دیا۔ اور آخر کار چند روز بے آب و دانہ رہ کر امراض ورم کبد وغیرہ میں اس عندلیب معانی نے گلزار اقدس کا رستہ لیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اس واقعہ حسرت ناک سے تمام لکھنؤ میں کہرام مچا ہے۔ ہر گروہ کی جان پر وہ سخت صدمہ ہے کہ جس کا بیان قلم اندوہ رقم سے نہیں ہو سکتا۔ واضح ہو کہ منگل کی اخیر شب کو یعنی ۲۹ محرم کو یہ حادثہ واقع ہوا۔ تمام عمائد و امرا اور ہزارہا اشخاص لکھنؤ کے اس خبر وحشت اثر کو سن کر جوق جوق جناب مغفور کے مکان پر چلے آتے ہیں روتے ہیں، پیٹتے ہیں، چلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے۔ تجہیز و تکفین کی کیفیت آئندہ رقم ہوگی۔ ایسے شہنشاہ سخنوری کے اُٹھ جانے سے کسی کو بھی اس وقت تاب تحریر اور طاقت تقریر نہیں ہے۔ ہائے ہائے کیسا شخص مر گیا۔"

اودھ اخبار لکھنؤ۔ مورخہ ۱۴ مارچ ۱۸۷۵ء مطابق ۵ صفر ۱۲۹۲ھ

"مختصر سوانح عمری حضرت دبیر مغفور

"جناب مرزا سلامت علی صاحب المتخلص بہ دبیر فن مرثیہ گوئی میں بے مثل اور لاجواب تھے۔ ہندوستان میں آفتاب تھے۔ سوا اس کے عابد شب زندہ دار تھے اور خاتم روزگار تھے۔ پندرہ سولہ برس کا سن تھا کہ شوق مانوق سلام اور مرثیہ گوئی کا ہوا اور اصلاح دینے

وغیرہ پر میاں دلگیر شاعر بے نظیر سے ہی بعد ازاں
مرثیہ گوئی وغیرہ میں نام عالی پیدا
کیا۔ میاں دلگیر صاحب ایسا شاگرد پا کر خوشی
سے پھولے نہیں سماتے تھے۔ جو ان کے اور
کسی کو دل لگا کر نہ بتاتے تھے۔ رفتہ رفتہ ایسا
نام پیدا کیا کہ سرکاروں میں پہنچے۔ نواب اصغر علی
خاں حضرت اشہاں علیین مکان ابن الدماجد
نواب ممتاز الدولہ بہادر کے ملازم ہوئے
اور وہی وجہ اور قدامت ہے کہ نواب ممتاز الدولہ
بہادر آج تک مانتے اور اپنا ملازم قدیم
جانتے تھے۔ بوجہ قدامت و مذاحی جناب
سید الشہداء علیہ الف التحیات تعظیم
فرماتے تھے اور اپنے برابر بٹھاتے تھے اور
بھی سرکاروں میں ان کی عظمت و رفعت
ہونے لگی اور مہاراجا میرزا رام اور کنور
بشن دشکوہ ان کو بہ دل و جان مانتے
تھے۔ بادشاہان رفیع المکان منیع الشان
اودھ نے ان کی نہایت قدردانی کی نصیر الدین
حیدر بادشاہ سے تا حضرت واجد علی شاہ
بادشاہ سب نے مہربانی کی۔ چنانچہ جب
بارہ سو اکانوے ہجری میں مرزا صاحب
کلکتہ تشریف لے گئے۔ واجد علی شاہ
بادشاہ کی خدمت میں عرضداشت بھیجی
اور یہ شعر بادشاہ نے دستخط فرمایا ؎

گریہ سرد چشم من بیائی
بر قلب نہم کہ کیمیائی

جب مرزا صاحب پہنچے جس مکان میں تھے
اس کے دوسرے درجہ تک حضرت واجد علی
شاہ آئے اور پیشوائی کر کے لے گئے اور
اس قدر تعظیم و تکریم فرمائی کہ جیسے کوئی
برابر والے کی عزت اور توقیر کرتا ہے
اور اپنے مرثیہ میں شاہزادہ نے بہت
سے بند ان کی تعریف اور توصیف میں
پڑھے۔ چنانچہ مرثیہ ارشاد عقدت
سے یہ ہے ؎

"جس پھیپھڑے سے عاشق فطرت دبیر ہوں"

اس وقت مرزا صاحب منظور [illegible]
کھڑے ہو کر یہ مرثیہ پڑھا ؎

"تعظیم کلام کو دبیر اٹھا ہے"

شاہزادہ نے فرمایا۔ آپ بیٹھ جائیں اور
بعد فاتحہ داری بے شمار عزت افزائی
بیس پانچ سو روپے بطریق عوض عطا
فرمائے اور مثل سالانہ گزشتہ اس کی
عظیم آباد سے مرزا صاحب نے عرضی بھیجی
چنانچہ پانچ سو روپے جناب مرزا صاحب
مغفور کو بذریعہ خط دیئے۔ بہتر سال کا
سن تھا۔ طاقت جواب دے چکی تھی۔ اس سال
عظیم آباد میں تشریف لے گئے اور نو سن
تاریخ ان مقیمین و سامعین بہت گئے تھے
مرثیہ طولانی بہت زور و شور سے پڑھا
اسی وقت سے اختلاج قلب شروع ہوا
ریل پر اپنے گھر آئے۔ دس دن تک
نہایت علیل رہے۔ ۲۹ محرم کو رفیق
افزائے دار البقا ہوئے۔ گروہ مومنین
و مسلمین خواص و عوام جنازہ کے ہمراہ تھا۔
گریہ و بکا سے سب کا حال تباہ تھا۔ جمعرات
کو بتاریخ دوم صفر سوم بجے نواب ممتاز الدولہ
بہادر نے شریک سوم ہو کر عزت افزائی

فرمائی۔ جناب مرزا اوج صاحب پسر مرزا صاحب نے قریب دس بارہ رباعیوں کے حسب حال اپنے اور ذات پدر بزرگوار پڑھیں جن کا سماعت کرنا اہل مجلس کو دشوار تھا۔ اور ہر ایک بشر گریہ و زاری سے بیقرار تھا۔ کہرام پڑ گیا۔ عجائب مضامین عالی تھے۔ گویا مرزا دبیر مرحوم پڑھ رہے تھے۔ تمام شہر کو اُن کی مرثیہ گوئی میں جو شبہہ تھا دفع اور رفع ہو گیا۔ ہر شخص اُن کے پڑھنے کی تعریف کرنے والا اور مداح تھا اور ہر صغیر و کبیر کی زبان صادق بیان پر یہ کلمۂ حق جاری تھا کہ الولد سرٌّ لابیہ۔ مرزا صاحب کو یاد کر کے ہر شخص رونے لگا۔ کہرام پڑ گیا۔ رقت سے حشر برپا ہوا۔ نواب مہتاز الدولہ بہادر نے مرزا محمد جعفر صاحب متخلص بہ اوج کو گلے لگایا اور کل طلب فرمایا ہے یقین صادق ہے کہ خلعت عطا فرمائیں گے۔ مگر مضامین رباعیات سے پایا جاتا ہے کہ یہ مرزا صاحب مغفور کا نام روشن کریں گے کہ اچھوں کے اچھے ہوتے ہیں اور جناب مرزا صاحب کچھ فقط لکھنؤ میں نامور نہ تھے۔ حیدرآباد، عظیم آباد، سندھ بلکہ تمام ہندوستان میں خصوصاً کربلائے معلی تک مشہور تھے۔ اُن کے نام نامی کو گویا عالمگیر کہنا چاہیئے۔ خاک اس گردش دوراں پر کہ اس کی گردش سے ایسا کامل پردۂ خاک میں مل جائے۔ مگر سوائے صبر کے کیا چارہ ہے۔ مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے۔ اب خدا سے یہی دعا ہے کہ خدا مرزا اوج کو سلامت رکھے کہ تسکین بخش دلہائے رنجور ہیں۔ یادگار جناب مرحوم و مغفور ہیں۔ آئندہ جو سُنا جائے گا لکھا جائے گا۔ ان دنوں لکھنؤ میں ایک نامی گرامی شاعر منور علی خاں خنداں تشریف لائے ہوئے ہیں۔ ذوق کے شاگرد رشید اور متوطن گنگوہ کے ہیں۔ آپ ہی کی وجہ سے ایک صحبت خاص مشاعرہ کی جناب منشی مظفر علی خاں بہادر کے صاحبزادوں کے اہتمام سے دریں دلا منعقد ہوئی تھی۔ ایک دلسوخت آپ کا مطبع اودھ اخبار میں چھپا ہے اور دیوان عنقریب چھپے گا۔ چونکہ اس عرصے میں مرزا دبیر نے انتقال فرمایا پس حضرت خنداں نے ایک نہایت عمدہ تاریخ قطعہ لکھ کر بھجوایا جس کو ہم درج اخبار کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے۔

"داغ الم دبیر ۱۲۹۲ھ"

دبیر سخنور چو ں رفت از جہاں
سخن شد سیہ پوش ماتم تمام
سر پائے خود را فرا باختند
فصاحت بلاغت طلاقت تمام

اودھ اخبار مورخہ ۱۷ مارچ ۱۸۷۵ء مطابق ۸ صفر روز چہارشنبہ ۱۲۹۲ ہجری کے شمارے میں درج ذیل عبارت شائع کی گئی ہے:۔

"۔۔۔ مارچ میں مختصر سوانح عمری حضرت دبیر صاحب مغفور کی لکھی گئی تھی اس میں ایک غلطی ہو گئی ہے کہ بجائے ضمیر کے مرزا صاحب کو شاگرد میاں دلگیر کا لکھا ہے اور کچھ حال اور باقی رہ گیا تھا۔ وہ یہ ہے کہ مرزا صاحب کو ایک بڑا توصل سرکار ملکہ زمانیہ اور نواب سلطانی عالیہ دختر نواب ملکہ زمانیہ سے بھی تھا۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں روپے

کا سلوک انھیں دوسرکاروں نے کیا تھا اور آج تک نواب ممتاز الدولہ بہادر سلوک فرماتے ہیں۔ جب مرزا صاحب کے انتقال کا وقت آیا۔ پانچ بجے صبح کو نماز صبح پڑھی اور حال ابتر ہونے لگا۔ اُس وقت میاں اوج نے کہ فرزند مرزا صاحب کے ہیں کہ پوچھا کہ "مجھ کو کس کے سپرد کیا؟" فرمایا "تمھیں خدا کو سونپا" اور انتقال کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ازبسکہ بروز سوم حالت طبیعت داری میاں اوج صاحب کا بخوبی سب کو دریافت ہوگیا کہ اکثر رباعیات تصنیف فرما کر پڑھیں۔ اب وہ رباعیاں بھی واسطے ملاحظہ ناظرین سخن فہم کے درج اخبار کرتے ہیں" (کل رباعیاں ۱۰) ذیل میں چند رباعیاں درج کی جاتی ہیں :-

ناکام کو کامیاب کردیتا ہے
وہ غیب سے فتحیاب کردیتا ہے
کافی ہے اُسی کی مہربانی اے اوج
جو ذرّے کو آفتاب کردیتا ہے

... ...

رو رو کے بجا ہے دیں اگر دم اپنا
تھا سلخ کو غرّۂ محرم اپنا
اُن کا ماتم تو کیا کریں گے اے اوج
ہاں آج سے ہم کریں گے ماتم اپنا

... ...

افسوس بلیغ نکتہ پرور نہ رہا
وہ قدر شناس اہلِ جوہر نہ رہا
روشن ہے کلام کی بقا سے اے اوج
آئینہ رہا مگر سکندر نہ رہا

... ...

شعلہ سینے سے ہر زماں اُٹھتا ہے
نالۂ خونبار خوں فشاں اُٹھتا ہے
اے آتشِ غم بس اب کیجیے کچھ ٹھنڈک
مجلس بے چین ہے دھواں اُٹھتا ہے

... ...

اخبار کی اس اشاعت میں جو تاریخی قطعات مختلف شاعروں کے شائع ہوئے ہیں اُن میں سے بعضوں کے چند اشعار درج کئے جاتے ہیں :-

(۱) عبد العلی آسی (۱۷ شعر)
پُرسیدم از دبیرِ فلک حال رحلتش
پیوستہ آں بہ رحمت حق گفت سالِ نو
۱۲۹۲ ہجری

(۲) ہدایت اللہ خاں ہدا (۱۴ شعر)
سالِ تاریخش چو جستم از فلک آمد ندا
سدرہ بے رُوح القدس ہیند منبر بے دبیر
۱۲۹۲ ہجری

(۳) منشی محمد مرزا جان صاحب محمود (۹ شعر)
فلک کے یاد رہیں گے ہمیں یہ جور و ستم
کہ ایک رنج سے ہے رنج دوسرا توام
لکھی فلک کی شکایت میں اس طرح تاریخ
غمِ انیس میں ہے ہے "زیادہ دبیر کا غم"
۱۲۹۱ھ ۱۲۹۲ ہجری

(۴) سید حسن لطافت (۱۲ شعر)
روزِ شنبہ تھا اور سلخ محرم وقت صبح
ماتم شہ میں ہوئے یہ ماہ غم کے ساتھ اخیر
ہر طرح اللہ نے اُن کو کیا تھا اہل دل
تھے رجوع قلب سے شاگرد دلگیر و فقیر
ہاں الم سے سر اُٹھا تاریخ لکھدی تجربہ
باغ بے بلبل ہے ہندوستاں لطافت بے دبیر
۱۲۹۲ھ

(۵) منشی سید باقر علی حیرت (۴ شعر)

در بزم لب لعل چو بکشود دبیر
جز مدحت شہ زباں نہ فرمود دبیر
حقا خضر سخنوری بود بدہر
میدان ز سیع مدح پیمود دبیر
ایں مصرع زباں شمع خواند بہ بزم
مصباح شبستان علی بود دبیر
۱۲۹۲ ہجری

(۶) منشی محمد فدا علی فارغ

انیسویں کو ماہ محرم کی چرخ نے
کیا لکھنؤ میں فتنۂ ماتم بپا کیا
یعنی کہ نقش ہستی مرزا دبیر کو
حرف غلط کی طرح سے یکسر مٹا دیا
فارغ نے پوچھا دل سے کہ ہے کوئی اس کا مثل
تو اس نے یہ جواب اسے برمحل دیا
حق تو یہ ہے کہ آپ ہی اپنا تھا وہ نظیر
ہاں منہ بھی مذمت کا کسی نے نہیں کیا
لیکن ہمارا قول یہی ہے کہ بالیقیں
طے ہو گیا دبیر محقق پہ مرثیہ
۱۲۹۲ھ

مشہور ہو تو مصرع تاریخ یوں بھی ہے
طے ہو چکا دبیر محقق پہ مرثیہ
۱۲۹۲ھ

اسی اشاعت میں ذیل کی تاریخیں بھی درج ہیں:۔

(۱) "دبیر عطار منش حیف شد" = ۱۲۹۲ھ
(۲) خواند آسان دبیر سطر اجل = ۱۲۹۲ھ
(۳) ہے ہے دبیر مرثیہ گو مر گئے = ۱۲۹۲ھ
(۴) پورا کیا دبیر نے دادی مرثیہ = ۱۲۹۲ھ
(۵) ذاکر سرمدیں بودہ دبیر = ۱۲۹۲ھ
(۶) روح ملک مرثیہ بودہ دبیر = ۱۲۹۲ھ

اودھ اخبار میں مرزا دبیر کے چہلم کا حال ذیل کے الفاظ میں درج تھے:۔

"تاریخ ۲۳ صفر کو مرزا دبیر کا چہلم ہوا مجلس میں صدہا رئیس اور شاہزادے اور امیر و امرا جمع تھے۔ مرزا ادیب نے اول رباعیات و تصنیف پڑھیں۔ تمام محفل میں وجد کا عالم تھا۔ بعدہٗ قطعۂ تاریخ وفات پڑھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ بعینہٖ مرزا صاحب پڑھ رہے ہیں۔ اس کے بعد حضرت امام زین العابدین کے دربار میں تشریف لے جانے اور حاکم کے انصاف نہ کرنے کا حال پڑھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ بعینہٖ مرزا صاحب پڑھ رہے ہیں۔ اس وقت گویا قیامت برپا ہو گئی تھی۔ آخرش مرثیہ نہ پڑھ سکے ؎

خاک بر سر کن صبا در ماتم سلطان غم
حیف شد برباد اقلیم بلاغت بے دبیر
نیست آں نسم الندر دیباچۂ معنی و لفظ
ہست اکنوں ابتر اجزائے طلاقت بے دبیر
بنگر اندر بوستاں بر سرو نخل ماتم است
در چمن نرگس سراپا چشم حیرت بے دبیر
غیر ممکن طالب دیدار در شام و سحر
اندریں فرقت سرا یک لحظہ راحت بے دبیر
نے دل مہجور را آرام بے وصل حبیب
نے مذاق زندگانی را حلاوت بے دبیر
مصرع تاریخ فوتش منشی گردوں نوشت
آسماں بے بہرہ و بیہم فصاحت بے دبیر"

مؤرخہ ۹ فروری ۱۸۷۵ء کے اودھ اخبار میں کسی نامعلوم شخص کا ایک طویل مراسلہ شائع ہوا ہے جس میں مرزا دبیر کے معرکہ آرا قطعۂ تاریخ وفات میر انیس کے اس مصرعہ پر ع

طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

اعتراضات کئے گئے۔ دبیر یوں کی طرف سے ان اعتراضات

کے جواب بھی اخبار کی اسی اشاعت میں چھپے ہیں۔ اخبار کے صفحہ ۱۸۹ میں مادۂ تاریخ کی صحت کے بارے میں مرزا دبیر کا ایک رقعہ بھی شائع ہوا ہے۔ اس خط کا حوالہ راقم کی نظر سے اور کہیں نہیں گزرا۔ اور غالباً مرزا دبیر کے آخری مکتوبات میں ہے۔ خط فارسی میں ہے اور ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"رقعہ"

سال تاریخش بزبر و بینہ مرقوم شد
طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

در مصرع تاریخ ارباب اشغال کثیرہ فرصت ملاحظۂ قواعد تاریخ و معمائی ندارند۔ شاید تکمیل اعداد کرنی الحقیقت کامل است گمان تنقیص می نمایند۔ لہٰذا جہت رفع توہم اعداد و حروف مرقوم می شود در زبر و بینات۔

طور	سینا	بے منبر	کلیم اللہ	و بے انیس
۸۶	۹۰	۵		۳

آحاد	عشرات	مأت	آحاد	عشرات	زبر
۴۰۶	۴۰	۴	۵	۳	

در کتب مؤرخان مستند مصنف را تحریر ساختہ کہ اختیار است خواہ بلفظی زبر و بینہ بگیر خواہ بلفظی فقط بینہ بگیر و جواز است و قطعۂ ثانیہ انشاء اللہ تیاری شود قدم رنجہ فرمائید تا التماس ضروری بمعائنہ نمودہ شود۔

والسلام

درمی بقا مشتاق لقا دبیر عفی عنہ"

مرزا دبیر کی تائید میں مرزا حاکم علی مہر اپنے "رسالہ در ثبوت صحت تاریخ" صفحہ ۳ میں لکھتے ہیں کہ

"دبیر نے جو تاریخ صاحب بیان سلیس و طبع نفیس جناب میر ببر علی صاحب انیس کے انتقال کی باقاعدہ زبر و بینہ کمال جدت کے ساتھ فرمائی۔ اس کی سمجھ میں نابلدان کوچۂ تحقیق کو اتنی پریشانی ہوئی کہ آخر سمجھانے کی نوبت آئی۔ سید بادشاہ علی صاحب متخلص بہ لقا ابن میر وزیر علی صاحب صبا اسکنہ اللہ فی الجنۃ المأویٰ نے خوش مزاجی مغفور نے اس کی کیفیت واقعی ناواقفوں کے ذہنوں پر جاری کرنے کا طریقہ سوال و جواب کا ایجاد کیا اور افہام و تفہیم نکات و غوامض سے طبیعت مستزدین کو شاد کیا۔"

مہر کی عبارت بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورۂ بالا ۹ فروری ۱۸۷۶ء کے اودھ اخبار کی اشاعت میں دبیر کی حمایت میں جو بحث چھڑ گئی تھی اور جس میں مضمون نگار نے اپنا نام نہیں دیا تھا اس کے محرک مرزا دبیر کے خویش میر بادشاہ علی لقا لکھنوی ہیں۔

مجموعۂ مراثی دبیر

اردو کے محسن عظیم جناب منشی نولکشور آنجہانی کی فیاضی، روادداری اور علم دوستی کا کیا کہنا۔ انھوں نے مرزا دبیر کے انتقال کے چند ہی مہینوں کے بعد مراثی دبیر کی دو جلدیں مطبع اودھ اخبار لکھنؤ سے شائع کیں پہلی جلد دسمبر ۱۸۷۵ء مطابق ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ اور دوسری جلد اپریل ۱۸۷۶ء مطابق ماہ ربیع الاول ۱۲۹۳ ہجری میں چھپی۔ دونوں جلدوں کے آخر میں "خاتمۃ الطبع" کے عنوان سے غلام محمد خاں ایڈیٹر اودھ اخبار کی تقریظ درج ہے جو ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔ اس تقریظ سے مرزا دبیر کے بارے میں بعض نئی معلومات فراہم ہوتی ہیں:

"زمانہ کو ہمیشہ اس بات کی حسرت رہی کہ میر انیس اور مرزا دبیر کا کلام یکجا نہ دیکھیں۔ طبع ہوتا تو درکنار یوں بھی کسی کو نہ ملتا تھا پس یہ آرزو کیوں کر حاصل ہو سکتی اس واسطے کہ ہزاروں روپیہ کے صرف کرنے پر بھی ایسی امید کا بر آنا محال تھا۔ یہ دونوں شاعر جو مرثیہ گوئی میں بے نظیر تھے ان کا ایک ایک مرثیہ گنجینۂ گوہر شاہوار تھا۔ لطف یہ ہے کہ باوصف اس بات کے یہ ثانی شاعر ہمیشہ اپنے

کلام کو پوشیدہ کرتے رہے۔ تاہم تمام جہاں میں یہ شہرت پائی کہ شاید اپنے زمانے میں انوری اور خاقانی کو بھی نصیب نہ ہوئی ہوگی۔ اللہ اللہ یہ متاخرین کے افتخار اُس زمانے میں گزرے جن کا مثل نہ پیدا ہوا نہ ہوگا۔ مرزا دبیر کی فصاحت و بلاغت اور سخن سنجی کا بیان کرنا ایسا ہے جیسا کوئی سحبان وائل کا ذکر کرے اور پھر کہے کہ وہ کس کا شاگرد تھا اور کیسا فصیح اللسان گزرا۔ گویا ایک فعل عبث ہے۔ مگر ہاں یادگار زمانہ کے لئے اتنا لکھ دینا کافی ہوگا کہ حضرت مرزا دبیر علاوہ مرثیہ گوئی اردو کے علم و فضل میں بھی پایگاہ عالی رکھتے تھے اور بہت بڑے متقی اور عابد و پرہیزگار تھے۔ مخیر ایسے بڑے کہ مدت العمر میں لاکھوں روپیہ پیدا کیا مگر روپیہ کو خذف ریزہ سے بدتر سمجھا۔ ایسے شخص کو اگر اپنے وقت کا حاتم کہئے تو سزاوار تھا۔ اکثر اوقات جب کچھ روپیہ پاس نہ ہوتا تھا تو نقد کلام یا گھر کے برتن تک سائل کی نذر کرتے تھے۔

یہ ایک مشہور بات ہے کہ ایک سائل کو حضرت دبیر نے اپنا مرثیہ عطا کیا۔ وہ حیدرآباد لے گیا اور وہاں ایک ہزار روپے کو بیچ دیا۔ خلاصہ یہ کہ کبھی سوال سائل کا رد نہ کرتے تھے۔ ہمیشہ توکل پر گزران تھی۔ اکثر شاگرد آپ کے از راہ دل سوزی کبھی کبھی گستاخ ہو کر اگر عرض بھی کرتے کہ آپ اولاد کا حق تو رکھا کیجئے تو فرماتے کہ بھئی خدا مالک ہے۔ غرضیکہ ایک ہی مخیر و متوکل تھے۔

اس برگزیدہ شاعر نے ۷۲ برس کے سن میں بعارضہ اختلاج و امراض کبد وغیرہ محرم الحرام کی ۲۹ تاریخ منگل کے دن وفات پائی تھی چونکہ کلام فصاحت نظام اس بلبل ہندوستان کا ایک زمانہ مشتاق تھا۔ اس واسطے جناب مالک مطبع اودھ اخبار نے چاہا کہ جس طرح ہو سکے اُس کو طبع کیجئے۔ چنانچہ جناب مرزا محمد جعفر صاحب ادیب نبیرہ حضرت دبیر مرحوم سے استدعا کی۔ مرزا صاحب موصوف نے جس قدر مسودے تمام مرثیوں کے بہم پہنچے سب عنایت کئے۔ پھر کیا دیر تھی۔ فی الفور مجموعہ مرثیہ مرزا دبیر طبع ہونا شروع ہوا۔ چونکہ یہ مرثیے مرزا ادیب صاحب کے عنایت کئے ہوئے ہیں۔ اس واسطے یقین ہے کہ صحیح اور بلا تصرف ہوں گے۔ اس میں کلام نہیں کہ مرزا ادیب صاحب نے اس خصوص میں نہایت فیاض چشمی سے کام لیا اور حفظ وصیت کیا کیوں کہ کوئی کلام بدون طبع ہونے کے کامل طور پر محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس کلام معجز نظام کی کیا تعریف ہو سکے۔ انصاف یہ ہے کہ اگر شاعری پیغمبری ہوتی اور اُس کا اردو زبان کی فصاحت پر انحصار و دارومدار ہوتا تو مرزا دبیر ہی کا حق تھا۔ ایسے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ بفضلہ اب یہ مجموعہ مطبع نول کشور مقام لکھنؤ ماہ دسمبر ۱۸۷۵ء میں چھپ کر شائع ہوا۔

مطبع اودھ اخبار کی یہ دونوں جلدیں اب نایاب ہیں اور عنقا کا حکم رکھتی ہیں۔ ان جلدوں کے بعد دو جلدیں مطبع نولکشور لکھنؤ سے چھپیں۔ یہ بھی نایاب ہیں۔ علاوہ اس مجموعہ مراثی دبیر کے دفتر ماتم جلد اول کے نام دبیر کے مرثیے سنہ ۱۳۰۰ ہجری مطابق ۱۸۸۲ء اور دفتر ماتم جلد دوم سنہ ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۴ء میں باہتمام قاری یعقوب علی نصرت مطبع شوکت جعفری لکھنؤ سے شایع ہوئے۔ دبیر کے مرثیے دفتر ماتم کی بیس جلدوں میں چھپ گئے۔ سید سرفراز حسین خبیر لکھنوی شاگرد مرزا ادیب نے سبع مثانی مؤلف مہذب اللغات سید محمد میرزا نے شعار دبیر کے نام اور رام نرائن لال بینی ماڈھو نے انتخاب مراثی شایع کیا۔ حال ہی میں مکتبہ جامعہ دہلی سے بھی مرزا دبیر کے چند مرثیوں کا انتخاب چھپا۔ یہ بھی مرثیے دفتر ماتم کی جلدوں میں شامل ہیں۔ دفتر ماتم کی ۲۰ جلدیں نایاب ہیں۔

بقول سید افضل حسین ثابت لکھنوی مصنف حیات دبیر دفتر ماتم کی جلدوں میں درج ذیل مرثیے الحاقی شامل ہو گئے ہیں :-

نمبر شمار	مطلع	دفتر ماتم
(۱)	جو زائر حسین علیہ السلام ہو	جلد ۴ مرثیہ ص ۱۲
(۲)	شیر خدا کا شیر ہے آہوئے مصطفیٰ	" ۵ " ص ۱۳
(۳)	عباسؑ کو جو سبط نبی نے علم دیا	" ۷ " ص ۷
(۴)	شاہوں سے کم نہیں ہیں غلامان مصطفیٰ	" ۸ " ص ۱۱
(۵)	یاد غم حسین کی عزت عظیم ہے	" ۹ " ص ۲
(۶)	کیا ذات ذوالجلال غفور و رحیم ہے	" ۱۱ " ص ۳

ثابت لکھنوی مطبع اودھ اخبار لکھنؤ میں چھپے ہوئے مرثیوں میں ذیل کے مرثیے کو بھی الحاقی گردانتے ہیں۔

ع ہر آہ علم سے یہ عزا خانہ ہے کسی کا۔

لیکن راقم الحروف کو یہ مرثیہ جناب محمد رشید صاحب کے ذخیرۂ مراثی میں مرزا دبیر کے تخلص سے ملا ہے اور اس پر ۱۲۷۹ھ کی تاریخ بھی درج ہے۔ لہٰذا ثابت لکھنوی کا یہ کہنا درست نہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرثیہ دبیر کے بھائی نظیر کی تصنیف ہے۔

دفتر ماتم کی ۲۰ جلدوں میں پہلی جلد سے چودھویں جلد تک مراثی ہیں۔ ان کی تعداد ۳۶۸ ہے۔ تفصیل یہ ہے :-

نمبر شمار	تعداد مراثی
جلد ۱	۲۵
" ۲	۲۵
" ۳	۲۹
" ۴	۲۷
" ۵	۲۷
" ۶	۲۹
" ۷	۲۵
جلد ۸	۳۰
" ۹	۲۶
" ۱۰	۲۷
" ۱۱	۲۷
" ۱۲	۲۹
" ۱۳	[illegible]
" ۱۴	۲۹

میزان جلد ۱ تا جلد ۱۴ = ۳۶۸

جلد ۶ اور جلد ۱۲ میں مرثیہ

"اے مومنو کرو علی اکبر کی زیارت"

کی تکرار ہے۔ یہ اور الحاقی ۶ مرثیے جمع کر کے (۳۶۸ - ۷) دفتر ماتم کی پہلی ۱۴ جلدوں میں مرثیوں کی تعداد ۳۶۱ ہے۔

دفتر ماتم جلد ۱۵ میں چار مثنویاں ہیں۔ پہلی مثنوی کا نام "احسن القصص" ہے۔ اس میں چہاردہ معصومین علیہم السلام کے حالات ولادت و وفات کی معجزات بیان کیے گئے ہیں۔ دوسری مثنویاں بعنوان معراج نامہ ہے اور یہ ص ۱۹۳ سے شروع ہوتی ہے اور ص ۱۹۵ پر خاتمہ درج ذیل اشعار پر ہوتا ہے ؎

بحق رسولان عالی تبار
بحق امامان والا تبار
رہے جب تلک سیر باغ جہاں
رہے جب تلک آب قائم رواں
رہیں جب تلک روز و شب مہر و ماہ
رہے جب تلک چرخ انجم پناہ
بری رنج و غم سے رہیں مومنیں
فرحناک و شاداں رہیں اہل دیں

مثنوی "احسن القصص" کی ابتدا ذیل کے اشعار سے ہوتی ہے :-

جسے حق نے بخشی ہے قدرِ رفیع
وہ برحق یہ پہلا ہے ماہِ ربیع
خصوصاً کہ آج کا روز کیا روز ہے
کہ شاہد سے ہفتہ کو فیروز ہے
جھکے ہیں فلک کس کی تسلیم کو
کھڑی ہے زمیں کس کی تعظیم کو

دفتر ماتم جلد ۱۶ تا ۱۸

دفتر ماتم کی ان تینوں جلدوں میں الف سے لے کر یے تک ۳۰۳ مسلسل مراثی سلام ہیں۔ جلد ۱۶ میں ۱۰۰، جلد ۱۷ میں ۱۲۴ اور جلد ۱۸ میں ۹۸ سلام ہیں۔ ان میں سے کچھ سلام مرزا دبیر کے شاگردوں کے ہیں جن کا [illegible] سلام سے معلوم ہوتا ہے۔ مؤلف حیات دبیر [illegible] سلام ہیں۔

دفتر ماتم جلد ۱۹

اس جلد میں ۴۲ مخمس سلام ہیں۔ انہی میں وہ مخمس بھی ہے جو مفتی سید محمد عباس کاشی علیہ الرحمہ پر فارسی میں مصرع لگا کر دبیر نے مخمس کیا ہے۔ یہ پہلے شمس المرثیہ خوانین کے نام سے چھپ چکا تھا۔ مصرعے اکثر اچھے لگائے ہیں کہ پانچوں مصرعے ایک ہی شخص کے معلوم ہوتے ہیں۔ یہی حال کثیر مخمسوں کا ہے۔ اس مخمس کے بارے میں میر صدر حسین لکھتے ہیں:۔

"مخمس کاشی در مناقب جناب امیر مومنین ہفت بند نظم نمودہ مرزا دبیر ہیئتش را مخمس نمودہ و در ہر بند مصرع سر مصراع افزودہ۔ لاریب کہ آنجناب در فارسی از اردو و عربی در ہمہ زبان نظم فرماید۔"

دفتر ماتم جلد ۲۰

یہ مراثی دبیر کے دفتر ماتم کی آخری جلد ہے۔ اس میں ردیف وار رباعیاں، نوحے اور واقعات اور نظمیں اور مناجات و قطعات وغیرہ متفرق کلام ہے۔ جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔

دفتر ماتم میں کوئی قصیدہ مرزا دبیر کی تصنیف سے نہیں ہے۔ لیکن وہ قصیدے بھی کہتے تھے۔ مرزا اوج نے اپنی کتاب مقیاس الاشعار میں ان کا ایک قصیدہ بجواب قصیدۂ رشید الدین وطواط لکھا ہے۔

مرزا دبیر کے غیر مطبوعہ اور نایاب مرثیے

مرزا دبیر زود نویس اور بسیار گو تھے۔ ان کے مرثیوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی تھی۔ ان کی زندگی میں اور ان کے کارناموں پر جو کتاب سب سے پہلے لکھی گئی ہے وہ میر صفدر حسین کی شمس الضحیٰ ہے۔ کتاب کی تصنیف کے وقت مرزا دبیر کا سن پچاس سال سے اوپر تھا۔ اس وقت تک مرزا دبیر تقریباً ہزار مرثیوں کے مصنف تھے۔ چنانچہ میر صفدر حسین کہتے ہیں:۔

"قریب نہ ہزار مرثیہ در مصائب و مناقب آل عصمت است۔ یا در ذکر سعادت ذریہ جناب رسالت و از تعداد رباعیات و تضمینات و سلامیات می سب ہم معترف بعجز و تقصیر است۔"

مرزا دبیر کا بہت سا کلام دست برد زمانہ ہوا۔ راقم کی نظر سے ان کے جو مرثیے نظر سے گزرے ہیں۔ ان کی تعداد ۴۷۵ کے لگ بھگ ہے۔ جب کہ دفتر ماتم کی ۲۰ جلدوں میں ۳۶۱ مرثیے درج ہیں۔

راقم الحروف کو جناب سید محمد رشید صاحب کے ذخیرۂ مراثی میں دفتر ماتم کی ۲۰ جلدوں کے علاوہ ایسے بہت سے مطبوعہ مرثیے دریافت ہوئے ہیں جو دفتر ماتم میں درج نہیں ہیں۔ ان کے علاوہ موصوف کے کتب خانے

میں مرزا دبیر کے قلمی مراثی کی چھ ضخیم جلدیں محفوظ ہیں۔ اُن میں تقریباً ایک سو سے زیادہ مرثیے ہیں جو دبیر کی زندگی میں نقل کئے گئے ہیں۔ بہت سے مرثیے ۱۲۵۳ھ اور ۱۲۹۲ھ کے درمیان لکھے گئے ہیں اور اُن میں بہت سے مرثیے ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔ اُردو کے تمام مرثیہ گویوں میں مرزا دبیر ہی ایسے واحد شاعر ہیں جنھوں نے زیادہ مرثیے کہے ہیں۔ اُنھوں نے اُردو زبان کو اپنے کلام معجز نظام سے مالا مال کیا۔ کس قدر افسوس ناک اور دلخراش بات ہے کہ اتنے عظیم شاعر کی صد سالہ برسی بھی نہیں منائی گئی اور کسی ادارے نے آج تک ایک خصوصی شمارہ بھی شائع نہیں کیا۔

ذیل میں مرزا دبیر کے وہ غیر مطبوعہ اور نایاب مرثیے درج کئے جاتے ہیں جو راقم الحروف کو دریافت ہوئے ہیں۔ ان مرثیوں کے مطلعے حروف تہجی کے اعتبار سے لکھے جاتے ہیں۔

غیر مطبوعہ مراثی

نمبر شمار — مطلعے — کیفیت

(الف)

(۱) آتا ہے رن میں کون کہ ایماں کا زور ہے۔
(۲) آمد خزاں کی گلشن خیر الوریٰ پہ ہے
(۳) آمد ہے تاجدار ثریا جناب کی
(۴) آمد ہے خداوند شجاعان زمن کی
(۵) آیا خط مسلم جو امام مدنی کو
(۶) ارشاد مجھے یہ لوح و قلم سے
(۷) اصغرؑ کو جب کہ پیاس کی شدت سوا ہوئی
(۸) السرے شہ بیکس و بے یار کی آمد
(۹) اہل فلک علیؑ کو (اکرم خوردہ) کہتے ہیں
(۱۰) اے آسماں زمین عدم میں نہاں ہو آج
(۱۱) اے باغ طبع رنگ بہار سخن دکھا۔
(۱۲) اے خالق سبحاں تو مری عقل رسا کر
مکتوبہ ۱۲۶۲ ہجری
نام کاتب فضل علی کانپور
(۱۳) اے دشت قتل دامن صد کوہ طور ہو۔
(۱۴) اے کلک قلم سلک تلمذ ان سے جدا ہو
(۱۵) انگشتری عرش کا یا رب نگیں دکھا۔

(ب)

(۱۶) پامال جب کہ گلشن خیر الوریٰ ہوا۔
(۱۷) پیری میں اگر بخت جواں ہو تو مزا ہے

(ج)

(۱۸) جب تیغ انتقام ربنا خدا نے کی
(۱۹) جب داخلِ وطن حرم مصطفیٰؐ ہوئے
(۲۰) جب رن میں آستین چڑھائی حسینؑ نے
(۲۱) جب رن چکے شبیرؑ عزیز و رفقا کو
(۲۲) جب زیب دہ منزل اول ہوئے شبیرؑ
(۲۳) جب زہر سے شہید جناب رضا ہوئے
(۲۴) جب شام میں ہر ایک طرف یہ خبر آئی
(۲۵) جب قرب ہوا آمد شبیر و نشور کا
اس کا ایک مخطوطہ ۱۱ جمادی الاول ۱۲۴۸ھ کا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی کے پاس ہے۔
(۲۶) جب کوفے میں پابند بلا ہو گئے مسلم
مکتوبہ ۱۲۷۴ھ
(۲۷) جب محفل حاکم میں شہ دیں کا سر آیا
مکتوبہ ۱۴ ذی الحجہ ۱۲۴۴ھ

(د)

(۲۸) دریائے نور کا دُرِ یکتا حسینؑ ہے

(ذ)

(۲۹) ذرہ ہے آفتاب ذرِ بوتراب کا۔

اس معرکہ آرا مرثیہ پر مرزا دبیر اور میر ضمیر میں راجہ میر ارام کے اماموں میں نااتفاقی اور ناراضگی ہوئی تھی۔

(۳۰) ذی قعدہ میں وہ قاعدے نو ہو سخن میں

(۳۱) زنداں میں چہلم جو ہوا اہل حرم کو
مکتوبہ ۱۲۹۵ھ

(۳۲) زنجیر جہنم سے جب آزاد ہوا حر

(ش)

(۳۳) شاہ شہدا مطلع تسلیم و رضا ہے

(ص)

(۳۴) صبح عاشور ہوا گرم جو بازار قضا

(ف)

(۳۵) نرخ خدا ہے یا کہ کتاب خدا ہے یہ

(۳۶) فہرست پہ شبیر کے لشکر کی رقم ہے

(ق)

(۳۷) قبضہ ہے علقمہ کی ترائی پہ شیر کا
(مکتوبہ بحیات دبیر)

(ک)

(۳۸) کس کے گل حدوث میں خوشبو قدم کی ہے
مکتوبہ بحیات دبیر

(۳۹) کس گھر میں آج حشر بپا ہوگا صاحبو

(۴۰) کیوں چرخ میں گردوں کی طرح رن کی زمیں ہے

(گ)

(۴۱) گہوارہ میں درندۂ اثر در علی علی

(م)

(۴۲) مسافروں کی مدینے میں جب رسد آئی
مکتوبہ ۷ جمادی الثانی ۱۲۸۶ھ
بقلم مظہر علی

(۴۳) مومنو اشک بہاؤ کہ محرم آیا

(۴۴) مہر علم سرور اکرم ہوا طالع
بے نقط مرثیہ۔ خواجہ آتش نے اس کی بے حد تعریف کی تھی۔

(ہ)

(۴۵) ہر جلسے میں مشتاق یہی کہتے تھے رو رو

(۴۶) ہم ہیں وطن میں اور طبیعت سفر میں ہے

(۴۷) ہے مظہر العجائب معجز نما علی

(ی)

(۴۸) یہ ترجمۂ آئینۂ لولاک سنا ہے
مکتوبہ ۱۶ صفر ۱۲۷۴ھ
بقلم محمد مہدی علی خاں کربلائی

نایاب مراثی

(الف)

(۴۹) آمد گل مژدۂ حسن پر خزاں کی ہے

(۵۰) اے طبع رواں سیف قلم جلد علم کر

(۵۱) اے مومنو شبیر دو عالم کے شرف ہیں

(۵۲) اے مومنو کیا باعث ایجاد زمیں ہے

(ب)

(۵۳) باندھا ہوا عقد جو سلطان امم سے

(ج)

(۵۴) جب حرم قلعۂ شیریں کے برابر آئے۔
اثر لکھنوی نے اسے انیس کی مرثیہ نگاری میں شامل کیا۔

(۵۵) جب رن میں ابن شیر خدا حملہ ور ہوا

(۵۶) جب صبح شب قتل نمایاں ہوئی رن میں

(۵۷) جب رن میں تحمل شائخ امامت قلم ہوئی

(۵۸) جب صبح شب قتل نمایاں ہوئی رن میں

(۵۹) جب عابدِ مریض کو داغِ پدر ملا
(۶۰) جب عریضہ شہ کو عنفر انے بہ چشم تر لکھا
(۶۱) جب لالۂ شفق نے دکھائی بہار صبح

(س)

(۶۲) سبطینِ شہ قلعہ شکن آتے ہیں رن میں

(ع)

(۶۳) عاشورۂ حسین کا واقعہ شدید ہے
(۶۴) عباسؑ جب کہ جانبِ کوثر رواں ہوئے
(۶۵) عباس علی جوہرِ شمشیرِ وفا ہیں۔
(۶۶) عزیزو حادثۂ نو فلک دکھاتا ہے

(غ)

(۶۷) غل ہے کوفہ میں اسیرانِ حرم آتے ہیں

(ف)

(۶۸) فولادی غریب میں کسی کا مزار ہے

(ق)

(۶۹) کوفہ جو ہوا رشکِ چمن نصلِ چمن میں

(گ)

(۷۰) گلگونۂ رخسارِ فلک گرد ہے ان کی

(م)

(۷۱) ماتم کا مرتع ہے کہ خاموش ہے مجلس
(۷۲) مفتاحِ باغِ نصلِ سخن ہے دغا میری
(۷۳) مقتل ہے چمن نصلِ بہاری کی ہے آمد

(ن)

(۷۴) نہ کون و دو یوسف ہیں کہ خوبی میں ہیں یکتا

(ہ)

(۷۵) ہاں اے قلم مرتع ندرت تو دکھا دے
(۷۶) ہر سنگ بنا لعل، گہر مہر علی سے

غیر مطبوعہ

ابواب المصائب

مرزا دبیر نے مصائبِ کربلا پر نظم کے علاوہ نثر میں بھی اپنے زورِ قلم کا مظاہرہ کیا ہے۔ انھوں نے نثر میں ابواب المصائب کے نام سے ایک یادگار تصنیف چھوڑی ہے۔ یہ تصنیف بہت دراز ہے نایاب ہے اور صاحبِ حیاتِ دبیر کو بھی اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوا تھا۔ راقم الحروف کو اس کا ایک مکمل نسخہ جناب سید محمد رشید صاحب سے حاصل ہوا۔

ابواب المصائب رجب علی بیگ سرور (م ۱۲۸۴ھ) کے فسانۂ عجائب (سالِ تصنیف ۱۲۴۲ھ) کے بعد دبستانِ لکھنؤ کی دوسری نثری تصنیف ہے۔ یہ عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ (۱۲۴۳ھ — ۱۲۵۳ھ) میں لکھی گئی تھی۔ مرزا دبیر نے دیباچے میں بادشاہ کے کردار و اخلاق، سیرت اور عزاداری پر روشنی ڈالی ہے۔

مرزا دبیر نے "ابواب المصائب" میں حضرت یوسف کے واقعات پر کربلا کے مصائب بیان کئے ہیں۔ ابتدا کے دس صفحوں میں دیباچۂ مصنف ہے۔ دبیر سببِ تالیف کے سلسلے میں کہتے ہیں کہ:

"درین دلا بتائید غیبی اور بالہام لاریبی بنائے حقیر کثیر التقصیر اعنی دبیر کا یہ عزم بالجزم ہوا کہ ترجمۂ سورۂ یوسف کا مشتمل بمصائب جناب سید الشہداء علیہ التحیۃ والثناء بطریق سادہ اور بحسن بے اندازہ اور دئے تفاسیر معتبرہ اور احادیث معتمدہ کے تعزیہ داران جناب ابا عبداللہ الحسین علیہ السلام کے مطالعہ کے واسطے زبانِ اردوئے معلی میں کرے۔"

ابواب المصائب مرزا دبیر نے عالم شباب میں ۲۷ برس کے سن میں ایک ہفتہ میں ۱۲۴۵ھ میں تصنیف کی۔ سال تصنیف خود مصنف نے اشعار ذیل میں کہا ہے

اے زہے این کتاب حزن اثر
کہ مزین بنام آل عبا ست
در معانی و لفظ ہر در فش
محضر خون سید الشہدا ست
سطر سطرش بجلوہ تاثیر
بذ آدہ جناب خیر نسا دست
ہست عاری عبارت از اغراق
چوں الف ہست حرف حرف راست
در کتاب زمانہ این اوراق
یادگار دبیر بے سر و پا ست
چوں بلطف ائمہ گشت تمام
اے ہمیں لطف خضر منزل ما ست
غور کردم بسال تالیفش
کہ ز آئین فرقۂ شعرا ست
ناگہاں فوج فوج آمدہ عقل
از چپ و راست داد مژدہ است
گفت با من کہ سال تاریخش
مصحف طاق چشم اہل عزا ست
۱۲۴۵ھ

مرزا دبیر کی شہرت دور دور تک اُن کے زمانے میں پھیلی تھی۔ چنانچہ بقول صاحب شمس الضحیٰ ان کے مراثی :-

"اکثر سوز خواناں در مجلس و ذاکرین بر سر منابر می خواندند ہزارہا مومنین فیض اجتماع یافتہ ... و دیگر امصار و بلدان ملک وسیع الفضائے ہندوستان و قصبات و قریات تا منتہائے کلکتہ و بمبئی و سورت و لاہور و ملتان و دکن و سندھ و کابل و کشمیر و لندن بلکہ در مکہ معظمہ و مدینہ منورہ و جنۃ البقیع و در نجف اشرف و در کربلائے معلی و در روضۂ خاص در روضۂ خیر الناس حضرت عباس و خیمہ گاہ و در مجالس و در کاظمین شریفین و سامرہ و در خراسان کہ اہل ہند مجالس تعزیت منعقد می سازند مراثی نظم نمودہ آنجناب خوانندہ می شوند۔" [۱]

قدردانی کا یہ عالم تھا کہ خود بادشاہ وقت واجد علی شاہ ایک مرتبہ دھوپ کی تمازت سے بچنے کے لیے دوران مجلس ہاتھ میں چھتری لے کر مرزا دبیر پر سایہ فگن رہے۔ چنانچہ مذکور ہے :-

"روزے در مجلس بالائے منبر بحضور اعلیٰ حضرت بخواندن مرثیہ اتفاق افتاد۔ ناگاہ شامیانہ کہ بالائے منبر ہمچو ابر رحمت سایہ گستر بود از ہوا پراگندہ گشتہ یکسو شدہ و عکس آفتاب بر روئے آنجناب (مرزا دبیر) افتاد فی الفور ظل امذ چتر خود گرفتہ قریب منبر استادہ تا اختتام مرثیہ سایہ افگن ماند۔" [۲]

حواشی

[۱] فسانۂ عجائب ص ۱۵ مطبوعہ ۱۲۶۷ھ

[۲] سرور ریاض ص ۲۶ مطبوعہ ۱۸۶۰ء مطبع حیدری واقع آگرہ کٹرہ حاجی محمد حسین۔ مصنفہ محمد ریاض الدین امجد سندیلوی متخلص بہ ریاض

[۳] میر محمد باقر سوداگر۔ محمد علی شاہ بادشاہ اودھ کے

زمانے میں لکھنؤ کے مشہور و معزز تاجر تھے عزاداری دل و جان سے کرتے تھے اور ایام محرم میں ہزاروں روپے خرچ کرتے تھے۔ انھوں نے چوک لکھنؤ میں ایک خوبصورت اور عالیشان امام باڑہ ۱۲۵۳ھ ہجری مطابق ۱۸۳۷ء میں تعمیر کیا جو آج بھی اچھی حالت میں موجود ہے۔ اس میں میر ضمیر اور مرزا دبیر پڑھتے تھے۔ مرزا اوج نے اسی امامباڑے میں مرزا دبیر کے چہلم کے موقعہ پر مجلس پڑھی تھی۔ برق نے امامباڑہ کی تاریخ کہی ہے ؎

میر باقر در دریائے سخا و بحر عطا
سید و باقر و عالی نسب و ذی جاہی
تعزیہ خانہ بنا کرد چو برج خورشید
روشن از روزن پر نور بہ گردوں راہی
از چہ تشبیہ دہم عقل و خرد حیرانست
دیدۂ مہر فلک مثل نہ دیدہ گاہی
بسکہ از بہر زیارت ز فلک می آیند
می شود بند ز ارواح و ملک راہی
ہر کہ بیند بہ جہاں جن و بشر می گوید
نیست بالائے زمیں مثل چنانش گاہی
گفت تاریخ بنا روح امین فکرم
قبلۂ اہل جہاں مسند شاہنشاہی ۱۲۵۳ھ
(دیوان برق ص ۶۵۴ مطبوعہ ۱۸۵۳ء)

۴ سوانح لکھنؤ۔ مولفہ جناب سید مسعود حسن رضوی ادیب۔

۵ سوانح لکھنؤ

۶ خوش معرکۂ زیبا قلمی ورق ۱۶۴ ب۔ لکھنؤ یونیورسٹی۔

۷ آبحیات ص ۵۳۷

۸ سوانح لکھنؤ۔

۹ انشائے فرحانی ص ۳

۱۰ انشائے فرحانی ص

۱۱ تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا قلمی۔ سال تصنیف ۱۲۶۱ھ

۱۲ شمس الضحیٰ ص ۹۹ مطبوعہ ۱۲۹۸ ہجری

۱۳ مرزا اوج (متوفی ۱۸ اپریل ۱۹۱۷ء) نے ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں علم عروض پر بڑی تقطیع میں ۳۳۶ صفحات میں ایک معرکۃ الآرا کتاب تصنیف کی۔ اس کا تاریخی نام "ارمغان" ہے جس سے ۱۲۹۲ کے اعداد نکلتے ہیں۔ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول میں عروض اور فن شعر سے متعلق بحث ہے۔ اس کتاب کے بارے میں داغ دہلوی لکھتے ہیں کہ "کسی یہ نہ سمجھو کہ آج عروض کا ماہر مرزا اوج سے بڑھ کر کوئی ہندوستان میں نہیں ہوا ہے۔ ان کی کتاب علم عروض میں مقیاس نام ان کی عروض دانی میں مکمل ہونے پر دلیل روشن ہے۔" (معراج الکلام ص ۱۴) اوج نے ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء میں علم عروض پر ایک رسالہ لکھا۔ منیر شکوہ آبادی نے اپنے کلیات ص ۵۰۶ میں اس عنوان کے تحت تاریخ لکھی ؎

"تاریخ تالیف رسالہ عروض مخدومی جناب مرزا محمد جعفر اوج خلف مرزا دبیر"

جناب اوج نے یکجا کئے اصول عروض
کہ جس کی مدح میں رطب اللساں ہیں اہل زباں
منیر نے کہی ہجری و عیسوی تاریخ
اصول نظم معلیٰ ہے خضر راہ جہاں
۱۲۸۲ ہجری ۱۸۶۵ء

۱۴ شمس الضحیٰ ص ۹۸

۱۵ جناب سید محمد رشید صاحب لکھنؤ کے زود دان رضوی کے چشم و چراغ ہیں۔ وہ علم و ادب کے قدردان جناب سید احمد بہری مدظلہ راجہ صاحب پیرپور کے

خالہ زادی بھائی ہیں۔ رشید صاحب کے پاس ذخیرۂ مراثی کا بیش بہا خزانہ ہے۔ راقم نے ان کے کتب خانے سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ موصوف کے پاس میر انیس اور دیگر مرثیہ گو شعرا کے غیر مطبوعہ مرثیے بھی وافر تعداد میں محفوظ ہیں۔
(اکبر حیدری)

[۱۷] یہ دبیر کے وہ مطبوعہ مراثی ہیں جو دفتر ماتم کی جلدوں میں درج نہیں ہیں۔
[۱۸] شمس الضحیٰ ص ۱۰۶ [۱۹] شمس الضحیٰ ص ۱۶۶

نوحہ بزبان حضرت زینبؑ

(مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہ)

جب شمر نے تن سے سر شبیر اتارا ۔ وا حسرت و دردا
زینب نے در خیمہ سے رو کر یہ پکارا وا حسرت و دردا

دنیا سے اٹھالے مجھے اے خالق داور از بہر پیمبر
بن بھائی کے جینا نہیں اب مجھ کو گوارا وا حسرت و دردا

منھ کر کے سوئے لاشۂ شہ پھر یہ پکاری وہ بیکس و نالاں
کچھ بین کروں آکے جو ہو حکم تمھارا وا حسرت و دردا

جب کچھ نہ صدا آئی تو با حالت مضطر میدان میں جاکر
لاشے کی بلائیں لیں یہ رو رو کے پکارا وا حسرت و دردا

بھیا ترے صدقے مجھے آواز سنا دے میں ترے تصدق
اب اٹھ کے گلے مجھ کو لگا لے تو خدارا وا حسرت و دردا

بھیا مجھے پردیس میں در در نہ پھراؤ پاس اپنے بلاؤ
اعدا کی نہیں ٹھوکریں کھانی ہیں گوارا وا حسرت و دردا

بھیا مرے آنسو تو ذرا پونچھ لے اٹھ کر میں روتی ہوں کب سے
کھول آنکھوں کو اور دیکھ ذرا حال ہمارا وا حسرت و دردا

سید کہوں بیکس کہوں بے گھر کہوں تم کو کیا کہہ کے میں روؤں
اللہ کا پیارا کہوں یا نانا کا پیارا وا حسرت و دردا

یا روضۂ احمدؐ کا مجاور کہوں بھائی یا حاجی و زائر
یا آنکھوں کی حیدرؑ کا کہوں تم کو میں تارا وا حسرت و دردا

یہ بین کئے اور ہوئی غش لاش پہ جاکر زینبؑ جگر افگار
اس غش میں بھی کہتی تھی مرے بھائی کو مارا وا حسرت و دردا

حاجت نہیں کچھ طول طلاقت کی دبیرؔ اب اس مجلس غم میں
گھر فاطمہؑ کا دسویں کو ویراں ہوا سارا وا حسرت و دردا

مرزا دبیر کا شاعرانہ منصب

جناب پروفیسر ظاہر حسین صاحب شاد
"مرزا ہاؤس" علی مرزا روڈ، مظفر پور، بہار

شبلی کی کتاب "موازنہ انیس و دبیر" کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے مگر جہاں میر انیس کے شاعرانہ اوصاف کی طرف اس کی وجہ سے لوگ متوجہ ہوئے وہاں اس کی وجہ سے انیس کے ایک بلند پایہ ہمعصر شاعر مرزا دبیر کا کلام بے توجہی کا شکار ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ ادبی تنقید کی دنیا میں موازنہ و مقابلہ کا طرز مطالعہ نامناسب ہے ہر شاعر کا اپنا اپنا امتیاز ہوتا ہے۔ مخصوص اوصاف ہوتے ہیں اور سب کی الگ الگ انفرادیت ہوتی ہے، ایک کے لب و لہجہ کی خصوصیات، شاعرانہ آہنگ کے انداز اور تخلیقی مزاج کی ندرتوں کو کسی دوسرے شاعر کے کلام میں تلاش کرنا غیر مستحسن ہے۔ ضروری نہیں کہ تمام شاعروں میں ایک ہی طرح کے اوصاف مل جائیں اور اگر ایسا ہوا تو ادبی دنیا شاعرانہ ندرتوں اور فکر و احساس کی رنگا رنگی سے محروم ہو جائے گی۔ طرز کا فرق، آہنگ کا فرق، لب و لہجہ کا فرق، لفظیاتی شعور کا فرق اور احساس و جذبہ کا فرق شعر و ادب کی دنیا میں تنوعات کو جنم دیتے ہیں اور اسکی وجہ سے فکر و فن کے نئے آفاق روشن ہوتے ہیں اور تخلیقی شعور ارتقائی منزلوں کو طے کر جاتا ہے۔

اردو شاعری کی تاریخ میں مرثیہ نگاری کی روایت بہت قدیم ہے اس صنف شاعری کی بدنصیبی یہ ہے کہ شروع میں شاعروں نے اس کے صنفی امتیاز کو روشن کرنے اور صنفی اوصاف کو نمایاں کرنے کے سلسلے میں انہماک و ارتکاز کے ساتھ تخلیقی کاوشیں نہیں کیں۔ یہ ادبی سعادت میر انیس اور مرزا دبیر کے حصہ کو حاصل ہوئی۔ ان دونوں باکمال شاعروں نے مرثیہ نگاری کی صنف کو رزمیہ شاعری کا بہترین نمونہ پیش کیا۔ میں حکیم الدین احمد کے اس خیال سے متفق نہیں ہوں کہ واقعۂ کربلا کی بنیاد پر اعلیٰ رزمیہ شاعری نہیں کی جا سکتی۔ کلیم صاحب لکھتے ہیں۔

> "اگر سارے واقعۂ کربلا کو مسلسل مربوط پیرایہ میں بیان کیا جاتا تو بھی مرثیہ اعلیٰ رزمیہ شاعری کی تمثیل نہ ہوتا۔ رزمیہ شاعری میں قصہ پیچیدہ ہوتا ہے، اس کی ابتدا ترقی اور انتہا ہوتی ہے اور ان حصوں میں مناسبت اور مطابقت ضروری ہے۔"
>
> (اردو شاعری پر ایک نظر ص ۳۶۳)

سوال یہ ہے کہ ہومر کی "الیڈ" اور فردوسی کے "شاہنامہ" کے واقعاتی اور تاریخی پس منظر میں اگر اتنا دم خم ہے کہ وہ اعلیٰ رزمیہ شاعری کی تخلیق کا سبب بن سکیں تو کیا واقعات کربلا میں اتنی توانائی نہیں کہ ان کی بنیاد پر اعلیٰ رزمیہ شاعری کی جا سکے۔ کلیم صاحب اپنے اعتراض کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ رزمیہ شاعری میں قصہ پیچیدہ ہوتا ہے۔ کیا واقعات کربلا میں پیچیدگی نہیں ہے؟ ان کی دوسری دلیل یہ ہے کہ رزمیہ شاعری کے حصے میں ابتدا، ترقی، اور انتہا ہوتی ہے۔ کیا واقعات کربلا ان مرحلوں سے دوچار نہیں ہوتے؟ تیسری دلیل یہ ہے کہ قصے کے ان حصوں میں مناسبت اور مطابقت ہوتی ہے۔ کیا واقعات کربلا ابتدا سے اخیر تک

گہری مطابقت اور مناسبت نہیں رکھتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کربلا کے واقعات کا موضوع، بہترین رزمیہ شاعری کے لیے نہایت اہم اور وقیع موضوع ہے۔ یہ اور بات ہے کہ واقعات کے اس تاریخی پس منظر میں رزمیہ شاعری کا بہترین نمونہ پیش نہیں کیا جا سکا۔ کلیم الدین احمد کا یہ تنقیدی تاثر بھی ناقابلِ قبول ہے کہ مرثیہ میں صرف ماتم ہوتا ہے اور نغمہ و شیون۔ میں اس سلسلہ میں صرف یہ عرض کروں گا کہ جذبات نگاری، کردار نگاری اور فطرت نگاری کے سلسلہ میں مرثیہ نگاروں نے عام طور پر اور بالخصوص انیس و دبیر نے جن شاعرانہ اوصاف اور سخنورانہ کمالات کے مظاہرے کیے انھوں نے مثنوی نگاروں کے ان عناصر کو بھی ماند کر دیا، ان خصوصیات کو نظر انداز کر کے مرثیہ کو صرف نغمہ و شیون کا حامل قرار دینا حیرت ناک بات ہے۔ سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ اردو شاعری کی کسی صنف میں رزم نگاری اگر ہوئی ہے تو وہ صرف صنف مرثیہ ہے۔ کلیم صاحب مرثیہ کے ماتمی پہلو سے اس طرح متاثر ہوئے کہ رزمیہ پہلو کی وضاحت انھوں نے غیر ضروری سمجھی۔ ظاہر ہے کہ صنف سخن کی حیثیت سے مرثیہ کی تمام خوبیوں کو اگر پیش نظر رکھا جاتا تو موصوف تنقید نگار اتنی بے نیازی سے حرفِ جلاد فیصلہ صادر نہ فرماتے۔ دبیر کے مرثیوں میں تو بالعموم رزم نگاری کا میلان زیادہ واضح نظر آتا ہے۔ معرکوں کے زور و شور کو مرثیوں میں پیش کرنے کے لیے وہ خاصا اہتمام کرتے ہیں حضرت عباس کی شمشیر زنی اور تیغ آزمائی کی تصویر ملاحظہ ہو۔

ہر بار نئی چال، نیا طور، نیا ڈھنگ
اسواروں کو پیدل کیا، پیدل کیے چو رنگ
گہہ زین پہ گہہ باگ پہ اور گہہ بہ سر تنگ
گہہ تنگ پناگاہ لعینوں کا دل تنگ
بل کھاتی تھی گہہ اژدرِ خوں خوار کے مانند
اعدا کے گلے میں تھی کبھی ہار کے مانند

گہہ راست گہے چپ تھی گہے تحت گہے فوق
اعدا کے گلے میں کبھی ہیکل تھی کبھی طوق
گہہ مُردوں پہ گہہ زندوں پہ جاتی تھی بصد شوق
بجلی کی طرح کوندنے کا رونے کا ذوق
دریا میں کبھی گاہ بیابان میں چمکی
جا کر کبھی نیزوں کے نیستان میں چمکی

مغفر سے اگر چھو گئی گردن میں در آئی
گردن سے بڑھی سینۂ دشمن میں در آئی
سینہ کو کیا چاک تو جوشن میں در آئی
جوشن سے جو نکلی تو وہ توسن میں در آئی
توسن سے جو اتری تو نہ پھر دن میں کہیں تھی
واں تھی نہ جہاں گاؤ زمیں تھی نہ زمیں تھی

سیرت نگاری اور پیکر تراشی کے ساتھ صورت حال کی منظر کشی میں بھی دبیر نے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے وہ جس موقع کو پیش کرنا چاہتے ہیں اس کی اس احتیاط و اہتمام سے پیش کش ہوتی ہے کہ قاری و سامع کے سامنے مکمل تصویر آجاتی ہے۔ لفظوں کی بندش تراش خراش اور مصرعوں کے دروبست میں انکی قادر الکلامی کا جوہر چمکتا نظر آتا ہے۔ حضرت امام حسین کے مظلوم قافلہ کی مقدس شان ذیل کے اشعار میں ملاحظہ ہو جس کے ایک ایک مصرعہ سے عزم و استقلال اور پاکیزہ جلال کے عنصر جھلکتے نظر آتے ہیں۔

پرچم ہے کس علم کا شعاعِ آفتاب کی
پانی ہے کس پھریرے سے ہمت سحاب کی
یہ شان ہے نشانِ رسالتمآب کی
چوب علم کلید ہے جنت کے باب کی
نقشہ علم کے پنجہ میں اللہ کا ملا
بندوں کو اس نشان سے نشانِ خدا ملا

صبح جہاد شاہ ثریا جناب ہے
فوجِ حسین بن کے ظفر ہمرکاب ہے

مشرق سے وال علم، علم آفتاب ہے
یاں نور کا نشانِ علم بوتراب ہے
روشن علم سے آئینہ مشرقین ہے
مشرق میں شمس، عکس نشانِ حسین ہے
دامن ہے کبریا کا سراپردۂ جلال
ماہی مراتب اس سے ہوشاہوں کا پائمال
بکھرا ہوا ہے شیر پھریرے کا بے جدال
شیرِ فلک کو دیکھ کے ہوتا ہے لال لال
تسخیر غرب و مشرق اسے کیا مجال ہے
پنجہ ہے آفتاب تو ناخن ہلال ہے

مضامین کی بلندی، دقت پسندی اور معنی آفرینی میں دبیر اپنی مثال آپ ہیں۔ تشبیہات و استعارات کی تلاش اور استعمال میں بھی دبیر کا رنگ بیان اور حسن کلام زیادہ نکھرا ہوا ہے۔ دبیر کی قوت تخیل مضمون آفرینی اور خیال بندی کے سلسلے میں زبان و بیان کی مدتوں اور جدتوں کو برتنے کا خاص اہتمام کرتی ہے۔ مرصع زبان اور بیان کی آرائش ان کے آہنگ میں ایک دلفریب شوکت پیدا کرتی ہے۔ تخیل کی رنگینی، اور بلندی اور مناظر فطرت کی مصورانہ عکاسی کے مرحلوں میں خاص طور پر اپنا جوہر دکھلاتی ہے۔ منظر صبح کی ترجمانی کا انداز دیکھئے۔

جب سرنگوں ہوا علم کہکشانِ شب
خورشید کے نشان نے سایا نشانِ شب
تیرِ شہاب سے ہوئی خالی کمانِ شب
تابی نہ پھر شعاعِ قمر نے سنانِ شب
آئی جو صبح زیورِ جنگی سنوار کے
شب نے سپر ستاروں کی رکھدی اتار کے
شمشیرِ مشرقی جو چڑھی چرخ پر شتاب
پھر تیغِ مغربی نے دکھائی ذرا آب و تاب
تھا بسکہ گرم خنجرِ مینائے آفتاب
باقی رہا نہ چشمۂ نیلوفری میں آب
محتاج ماہتاب ہوا آب و تاب کا
باغِ جہاں میں پھول کھلا آفتاب کا

چونکہ رزم گاہ کربلا کی صبح کا منظر ہے اسلئے یہاں بھی ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن سے رزمیہ ماحول کی تشکیل ہو سکے، علم، کمان، تیر، کمان، سنان، زیور جنگی، سپر، شمشیر، تیغ، خنجر وغیرہ، [illegible] دبیر کی اس صبح [illegible] ارکہ صبح [illegible] کر دیتے ہیں۔ [illegible] کے لیے شمشیر مشرقی اور چاند کے لیے تیغ مغربی کا استعمال دبیر کی قوت تخیلہ کی اختراعی صلاحیت کو نمایاں کرتا ہے۔ علم کہکشاں، تیر شہاب، ستاروں کی سپر وغیرہ لفظی ترکیبوں سے دبیر کے جدت پسند لفظیاتی شعور کی وضاحت ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں شبلی نے بھی دبیر کی عظمت فن کا اعتراف کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"خیال آفرینی، دقت پسندی، جدت استعارات اختراع تشبیہات، شاعرانہ استدلال شدت مبالغہ میں ان کا جواب نہیں لیکن اس زور کو وہ سنبھال نہیں سکتے۔ اس وجہ سے کہیں خامی پیدا ہو جاتی ہے۔ کہیں تعقید اور ثقالت ہو جاتا ہے۔ تشبیہات میں پھبتیاں بن جاتی ہیں اور کہیں محض لفظی بازی رہ جاتی ہیں۔ ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ [illegible] ان کا کلام فصاحت و بلاغت کے معیار پر پورا اترتا ہے، نہایت [illegible] جاتا ہے۔"
(موازنہ ص ۲۰۶)

ظاہر ہے کہ کسی شاعر کے کلام میں دونوں تا آخر ایک ہی طرح کی بلندی اور فنی خوبصورتی کا پایا جانا محال ہے۔ میر و غالب جیسے اصحاب طرز شاعروں کے یہاں بھی "پستش بغایت پست" اور "بلندش بغایت بلند" کی کیفیت نظر آتی ہے۔

انیس کے مرثیے بھی تو قید و اخلاق کے عیب سے یکسر پاک نہیں ہیں۔ دبیر کے یہاں بھی ایسی کمزوریاں ہیں مگر فصاحت و بلاغت کی کسوٹی پر ان کے بیشتر مرثیوں کے مختلف حصے اپنے حسن و اثرات کے اعتبار سے بلند مرتبہ دکھائی دیتے ہیں۔ منظر "صبح" ہی کی ایک اور کیفیت دیکھئے ؎

گلگونۂ شفق جو ملا حور صبح نے
اسپند مشک شب کو کیا نور صبح نے
گرمی دکھائی روشنیٔ طور صبح نے
ٹھنڈے چراغ کر دیئے کافور صبح نے
لیلائے شب کی رات کو دولت جو لٹ گئی
افشاں جبیں سے مہر درخشاں کی چھٹ گئی

پیدا ہوا سپیدۂ طلعت نشان صبح
سلطانِ صبح نے کیا قصد اذان صبح
باندھا عمامہ نور کا پیشانیٔ صبح
چرخ چہار میں یہ گیا خطبہ خوان صبح
مذہب کے سوئے قبلۂ امید ہو گئے
سرگرم سجدہ عیسیٰ و خورشید ہو گئے

بقول شبلی "مرزا صاحب کی قوت تخیل نہایت زبردست ہے"، دبیر اپنی اس زبردست قوت تخیل سے بھرپور معرفت بھی لیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے اسلوب میں ایک امتیازی بلند آہنگی پیدا ہو گئی ہے اور نئی لفظیات کا تخلیقی شعور نمایاں ہوا ہے۔ اور اسی لیے مرثیوں کی معنوی فضا میں تہہ داری کا عنصر ملتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ دبیر کے مرثیوں میں لفظیاتی شعور کی کارفرمائی ایک مستقل موضوع مطالعہ ہے۔ دبیر نے الفاظ و بیان کے جو نئے نئے گل بوٹے کھلائے ہیں، خیالات کی بلندی اور مضامین کی جدت کے لیے اظہار کی جو نئی شاہراہیں ایجاد کی ہیں، مرثیہ نگاری کے میدان میں ان کی حیثیت اضافوں کی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مرثیوں کو شروع میں مذہبی احساسات و جذبات کی تسکین کے لیے مخصوص صنف کلام تصور کیا جاتا تھا اور ایسے ہی مواقع پر ان کی ضرورت محسوس ہوا کرتی تھی جن باکمال شاعروں نے مرثیہ کو ایک مستقل اور منفرد صنف سخن کے طور پر دنیائے شاعری سے روشناس کرایا، ان میں مرزا دبیر نہایت اہم اور ممتاز مقام رکھتے ہیں، مرثیہ نگاری کی ارتقائی تاریخ کے مطالعہ کے دوران میں آج بھی انیس کے ساتھ بے اختیار ہماری نگاہیں مرزا دبیر پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ دبیر نے مرثیہ نگاری کے مختلف لوازم و مضامین کے برتنے میں تخلیقی سطح پر جو شاعرانہ اہتمام کئے انھیں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ خیال کی ندرتوں اور اسلوب کی خوب صورت توانائی سے مل کر ان کی انفرادیت سنورتی ہے۔ یہی ان کے شاعرانہ کمال کا امتیاز ہے۔

حضرت علی اکبرؑ کے گھوڑے کی تعریف

وہ رخش تھا یا ابلق ایام کا اقبال
نکھ سکھ سے درست اور جواں بخت و جواں سال
جادو کی تری آنکھ فقط معجزہ کی چال
خورشید کے سم برق کی دم سنبلہ کی یال
قوت کی طبیعت تھی دلیری کا جگر تھا
سرعت کا بدن فہم کا دل عقل کا سر تھا

(دبیر)

مرزا دبیر

(جناب میر احمد علی صاحب ادیب حیدرآبادی)

مرثیے کے لغوی معنی ہیں مُردے کے اوصاف اس طرح بیان کرنا جس سے سننے والے کا دل بھر آئے۔ ہماری زبان میں لفظ مرثیہ اصطلاحاً اُس نظم کے لیے استعمال ہوتا ہے جو حضرت امام حسینؑ یا آپ کے ہم سفر ساتھیوں کی شہادت پر اظہار ملال کے لیے کہی گئی ہو۔ علم ادب کی تاریخ میں عام اصناف سخن کی طرح مرثیہ بھی ہمیں چند ادوار پر منقسم نظر آتا ہے پہلے دور میں اس کی کوئی خاص ہیئت متعین نہ تھی اور گیارھویں صدی ہجری کے نصف آخر تک مرثیہ نگاری بالکل محدود رہی البتہ دوسرے دور میں اس کی ادبی حیثیت قائم ہوئی جس کا سہرا مرزا محمد رفیع سودا کے سر رہا۔ سودا سے پہلے عموماً مثلث، مربع اور مخمس بند والے مرثیے کہے جاتے تھے سودا نے مسدس بند کے مرثیے کہے جن میں عربوں کا کردار ہندوستانی معاشرت کے پس منظر میں پیش کیا گیا۔ تیسرے دور کے چار مرثیہ گو شاعر قابل ذکر ہیں ایک تو میر حسن کے فرزند میر مستحسن خلیق دوسرے میر مظفر حسین ضمیر تیسرے دلگیر اور چوتھے فصیح۔ ان میں خلیق و ضمیر نے کافی شہرت پائی۔ چوتھے دور میں خلیق و ضمیر کے بعد میر انیس و مرزا دبیر فلک مرثیہ گوئی کے آفتاب و ماہتاب ثابت ہوئے ان دونوں بزرگ شاعروں نے اپنے فن کو کچھ اس طرح بام عروج پر پہنچایا کہ اردو ادب کی تاریخ میں تلاش بسیار کے باوجود ان کا کوئی ہم پلہ شاعر نظر نہیں آتا۔ میر انیس تو خاندانی مرثیہ گو تھے مگر مرزا دبیر کا معاملہ جداگانہ تھا۔ شاہ دہلی کے میر منشی لالہ رفیع کے پوتے مرزا غلام حسین کے نور نظر مرزا سلامت علی ۱۱ر جمادی الاول ۱۲۱۸ھ م ۲۹ر اگست ۱۸۰۳ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ جب یہ سات سال کی عمر کو پہنچے تو دلی اجڑنا شروع ہوئی تھی اور شرفائے شہر کو اپنی آبرو کی حفاظت کی خاطر ترک وطن پر مجبور ہو جانا پڑا۔ اسی افراتفری میں مرزا غلام حسین بھی مع اپنے کمسن بچوں کے راہی لکھنؤ ہوئے۔ ان کا ہفت سالہ لڑکا لکھنؤ میں جب گیارہ سال کا ہو چکا تو باپ نے اسے میر ضمیر کا شاگرد کرا دیا۔ استاد نے اپنے مخلص پر اس ہونہار شاگرد کا تخلص دبیر تجویز کیا۔ مرزا سلامت علی دبیر نے فارسی عربی میں نہ صرف اچھی خاصی استعداد پیدا کر لی بلکہ معقولی و نقلی علوم متداولہ پر حاوی ہو کے اپنے زمانے کے ایک جید عالم اور ذاتی کردار کی حد تک فرشتہ خصلت انسان سمجھے جانے لگے ان کی روز افزوں شہرت و نیک نامی اس قدر عام ہوئی کہ شاہ نصیر الدین حیدر کے عہد میں شاہزادے اور شاہزادیاں بھی ان کے شاگردوں کے زمرے میں داخل ہو گئیں بلکہ زنانیہ ان کی بڑی قدرداں تھیں سارے لکھنؤ میں ان کی مسلم الثبوت استادی کا لوہا مانا جاتا تھا۔ جب امجد علی شاہ کا دور آیا تو میر انیس فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہوئے اس طرح مرثیہ گوئی کے میدان میں انیس و دبیر ایک دوسرے کے مقابل نبرد آزما ہوئے اور نتیجتاً مرزا صاحب نے اپنے حاقتور حریف کا سامنا کرنے کے لیے محنت شاقہ سے مرثیے کہنا شروع کیے جس کی بدولت ان کے شاعرانہ جوہر کھلتے گئے اور فضل و کمال کی شہرت بڑھتی گئی چنانچہ ان کے تلمذ سے معزول تاجدار اودھ واجد علی شاہ نے اپنا یہ تاثر نظم کیا۔

بچپن سے ان کے دامنِ سخن کا اسیر ہوں
میں مسحفی سے عاشقِ نظمِ دبیر ہوں

نیز مطالعہ سے مرزا صاحب کی بیماری سے فرصت پا گیا تھا جس کا واجد علی شاہ نے کلکتہ میں کامیاب طریقے پر علاج کرایا سنہ ۱۲۹۰ھ میں مرزا دبیر کے ہونہار سالی بیٹے مرزا ہادی حسین عطارد کا انتقال ہو گیا۔ صفر سنہ ۱۲۹۲ھ میں ان کے بڑے بھائی مرزا نظیر چل بسے اور اسی سال ماہ شوال میں میر انیس بھی دنیا سے منہ موڑ گئے مرزا صاحب [illegible] تاب نہ لا سکے آخر کار بیمار ہو گئے مرض بڑھتا گیا اور ۳ محرم سنہ ۱۲۹۲ھ ۶ مارچ ۱۸۷۵ء کو [illegible] وفات پائی اور اپنے ہی مکان میں دفن ہوئے

مرزا صاحب کی شاعری

جس زمانے میں شیخ امام بخش ناسخ نے اصلاحِ زبان کی مہم چلائی، انھیں دنوں مرزا دبیر اپنی مرثیہ گوئی کو اس طرح وسعت دینے لگے کہ رزم و بزم کے علاوہ تفسیرِ قرآن، حدیث نبوی، تاریخی روایات علم فقہ، علم کلام اور اخلاقیات جیسے موضوعات نظم کر کے صنفِ مرثیہ میں تنوع پیدا کیا۔ اہل الرائے حضرات مرزا صاحب کے فضل و کمال کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں۔ یادگارِ انیس کے مؤلف میر انیس کے بارے میں لکھتے ہیں۔ انھوں نے طرزِ مرثیہ گوئی میں کوئی خاص جدت نہیں کی بلکہ [illegible] دبیر کے محاسنِ کلام کا ایک مرقع بنایا اور اس پر میر خلیق کی محاورہ بندی اور میر حسن کی داستان نگاری کا رنگ روغن چڑھا کے طلسمات کا عالم دکھایا۔ اسی طرح علامہ شبلی نے مرزا دبیر کے تعلق سے لکھا ہے کہ "جہاں ان کا کلام فصاحت و بلاغت کے معیار پر پورا اترجاتا ہے نہایت بلند مرتبہ ہو جاتا ہے"

مولوی محمد حسین آزاد نے مرزا صاحب کی پیرگوئی کے سلسلے میں ان کے نقرئیں [illegible] جو قصہ بنایا ہے وہ مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے صحیح اندازہ یہ ہے کہ وہ ایک ہزار مرثیوں کا ذخیرہ چھوڑ گئے۔ اسی ذخیرے میں ایک طویل مرثیہ ایسا بھی ملتا ہے جس میں شروع سے آخر تک کوئی فقط دار حرف استعمال نہیں ہوا۔ مرزا صاحب کے اکثر مرثیے جہاں دقت پسندی سنوے خیال، جدتِ استعارہ، اختراعِ تشبیہ اور منطقی استدلال سے بھرے پڑے ہیں وہاں بعض مرثیوں میں انھوں نے سادہ بیانی کا بھی اعجاز دکھایا ہے وہ اپنا ایک مرثیہ اس طرح شروع کرتے ہیں

ہم ہیں وطن میں اور طبیعت سفر میں ہے
یا آتی فکر و مضموں نظر میں ہے
دریا میں زہن ہے تو کبھی دشت و در میں ہے
در سخن کی چاہ مگر خشک و تر میں ہے
تاثیر دو اثر سے سخن بہرہ مند ہے
ہر دم زباں کو ذکرِ الٰہی پسند ہے

غرض مرزا صاحب کی زبان پر شکوہ اور انداز بیان باوقار ہے۔ خیالات پر زور ہیں سوز و گداز کے اظہار کا خاص پیرایہ ہے مضمون آفرینی اور جدت طرازی کے سبب سے ان کے بیان کئے ہوئے استعارات و تشبیہات کو سمجھنے کے لیے دماغ لڑانا پڑتا ہے۔ تقریباً سارا کلام ابتذال سے پاک ہے اخلاقی مضامین کی بہتات ہے صنعت و رعایت لفظی سے مکمل حد تک بچے ہیں المختصر مرزا صاحب اپنے خلف اکبر و جانشین مرزا اوج اور اپنے ڈیڑھ سو شاگردوں کو راہ پر لگا گئے۔ اب مذکورہ بالا مرثیے کے چند مسلسل بند بطور مشتے نمونہ از خروارے پیش کئے جاتے ہیں۔

فرماتے ہیں حسینؑ توقف کی جا نہیں
اس کوچ میں مقام کوئی عذر کا نہیں
بے درد و غم کے حق میں خدا کا مزا نہیں
اس راہ میں بقا ہی بقا ہے فنا نہیں
اہل ادب سنبھل کے یہاں پاؤں دھرتے ہیں
یہ راہ وہ ہے سر سے جسے قطع کرتے ہیں
یہ راہ انبیائے اولوالعزم کم چلے
لیکن خدا کے عاشقِ ثابت قدم چلے

اے حضرتِ امیرؑ چلے ایک ہم چلے
سجدے سے سر نہ سر کے جو تیغِ ستم چلے
گزرے سو گزرے ہوئے جو ہونا ہو ڈر نہیں
سودا خدا کے عشق کا ہے فکرِ سر نہیں
واللہ اعلم آئینگے اب یا نہ آئینگے
کس کو خبر ہے حد سے ہم آگے نہ جائینگے
موقع ہوا تو بی بی کو اپنی بلائینگے
بے کربلا کے رتبۂ عالی نہ پائینگے
مشتاق امتحان کا ربِ غفور ہے
عاشور کو وہاں مرا ہونا ضرور ہے
سبطِ رسولؐ نے جو لیا نام کربلا
چھائی بھرے محل پہ اداسی ہر ایک جا
فریاد اُمِّ سلمیٰ نے کی وا محمدا
منہ دیکھ کر حسینؑ کا حسرت سے یہ کہا
کیوں واری کربلا یہ وہی ارضِ پاک ہے
شیشے میں جس زمینِ مقدس کی خاک ہے
شہؑ نے بھری اک آہ کہ ہاں اماں جان
نانا سے اس زمیں کا سنا ہوئے گا بیاں
اماں یہ بے نشانوں کی قبروں کا ہے نشاں
صغرا پکاری ہائے نکل جاؤں میں کہاں
باتیں سفر کی رمز کنایہ میں ہوتی ہیں
بابا تو ضبط کرتے ہیں اور نانی روتی ہیں
جبراً کیا تھا آپ کی فرقت کو اختیار
پھر اب کلام پاس سے لونڈی ہے بے قرار
کیا جانیں پھر ملیں نہ ملیں شاہِ نامدار
اب میں ہوں اور بہنوں کے ناقوں کی ہودجا
چلنا گوارا کیجئے اس تلخ کام کا
صدقہ سکینہؑ بی بی کے کوچ اور مقام کا
بہنوں کو والدہ کو مبارک عماریاں
معراج سمجھوں گی میں بٹھا دو گے تم جہاں

تکیہ عصا بچھونا میں چھوڑ دوں گی سب بیاں
پھر اور کیا ہے کچھ نہیں مٹھی بھر استخواں
مشکل سفر کی کنبے پر آسان ہوئے گی
بیمار تعزیہ ستوں پہ قربان ہوئے گی
اس التجا نے شاہ کی حالت تباہ کی
آنکھوں کو ڈبڈبا کے حرم پر نگاہ کی
سب نے بیاں مریض سے تکلیف راہ کی
آخر کہا خوشی تمھیں لازم ہے شاہ کی
بہرِ خدا نہ چشم کو خوں ریز کیجئے
بی بی کو تپ ہے کوچ سے پرہیز کیجئے
صغرا پکاری ہائے مقدر دہائی ہے
دنیا میں کیا بھی کیا دکھی تپ آئی ہے
تپ ہے تو خیر تپ کی دوا ہے ٹھنڈائی ہے
ہے ہے مرے بخار کا درماں جدائی ہے
بیمار کی خبر نہیں ماں باپ لیتے ہیں
تپ آئی ہے تو بچوں کو چھوڑ دیتے ہیں
[illegible] کھاؤ
بیمار خود [illegible] سنوائے
للہ اس قصور کی تعزیر سے بچاؤ
حضرت کو دو قسم کہ نہ صغرا کو چھوڑ جاؤ
یہ جان لو جو گھر میں رہی میں تو مر گئی
اور اونٹ پر چڑھی تو وہیں تپ اتر گئی
اے لوگو بے حواس نہ ہو تپ کے آنے سے
تپ اس گھڑی تو آئی ہے بابا کے جانے سے
آنکھیں بھی دونوں لال ہیں آنسو بہانے سے
منہ زرد ہو گیا ہے فقط ہول کھانے سے
رومال سے جو ماتھے کو باندھا تو کیا ہوا
سر پیٹنے سے درد سر اس دم سوا ہوا
تپ کی حرارت اور قلق کا بخار اور
وہ تھرتھرانا اور ہے یہ اضطرار اور

مرزا دبیر مرحوم کا ایک نایاب مرثیہ

(جناب سید حسن صاحب زیدی سکندرپوری مقیم حال وارج نیون گراؤنڈ لکھنؤ)

یہ اتفاق کی بات ہے کہ انیسویں صدی کا جب نصف آخر [illegible] مسنتیں مائل بہ زوال تھیں اُس وقت اردو زبان نے اپنے وہ نامور ادیب اور شاعر پیدا کئے جن کے ادبی کارنامے اردو دنیا ہمیشہ فخر و مباہات کرتی رہے گی۔ میر انیس اور مرزا دبیر اسی زمانے میں اپنی پوری آب و تاب سے چمکے اور اپنی کاوشوں سے فن مرثیہ کو اتنی ترقی دی کہ ہمیشہ دنیا کے ادبی ذہنوں کو متاثر کرتی رہے گی۔

ایک طرف اردو ادب کو بہت سے شعرا اپنے قصائد غزلیات مثنویوں اور مسدسوں سے مالا مال کر رہے تھے تو دوسری طرف میر انیس اور مرزا دبیر نے فن مرثیہ کی طرف اپنی [illegible] پوری توجہ مرکوز کی۔ یہ صحیح ہے کہ میر خلیق اور میر تقی میر نے اس میدان میں طبع آزمائی کی تھی مگر یہ فن ابھی تک عوام تک نہ [illegible] تھا۔

اس مضمون میں مجھے مرزا دبیر کے ایک مرثیہ کا ذکر کرنا ہے جو نایاب ہے اور جس کی تلاش مجھے عرصہ سے تھی یہ میری خوش قسمتی [illegible] مجھے ایک عزیز کے گھر ضلع اعظم گڈھ کے موضع [illegible] میں ملا یہ پورا مرثیہ بہت خوش خط لکھا ہوا میرے پاس موجود ہے کچھ لوگوں نے ذکر کیا تھا کہ مرزا دبیر کا مرثیہ جو حضرت عباس علیہ السلام [illegible] کے حال میں کہا گیا تھا۔ ان میں مرزا صاحب نے اودھ [illegible] کیا ہے اور بڑی خوبی سے ان مراحل کو دکھایا ہے جو شاہزادوں کے [illegible] پر اپنے [illegible] ہوتے ہیں۔ اس مرثیہ کا مطلع [illegible] ہے

۱۔ جب اختر یعقوب پہ کی مہر خدا نے
یوسف کو دیا اوج شرف رب ہدا نے
دی مسند اقبال اُسے بخت رسا نے
پر کھول دیئے فرق ہمایوں پہ ہما نے
سجدے کے لیے خواب میں شمس و قمر آئے
محراب عبادت میں ستارے نظر آئے

۲۔ یعقوب کو یوسف بہ دم صبح بتائے
لوہم نے کئے برج ترقی کے نظارے
دیکھا ہے کہ شمس و قمر اور گیارہ ستارے
پیشانی روشن سے ہیں سجدے میں تمہارے
شاہی و نبوت مرے محبوب مبارک
یعقوب نے فرمایا بہت خوب مبارک

حضرت یعقوب علیہ السلام نے یوسف سے اس خواب کی تعبیر اس طرح بیان کی۔

وہ چاند جو دیکھا ہے میں ہوں اے مرے اختر
گیارہ جو ستارے ہیں وہ ہیں تیرے برادر
خورشید سے تعبیر جدا ہے تری مادر
ہم سب ترے محکوم تو ہے حاکم کشور
پر چاند کی نسبت سے ہے دل چاند پدر کا
یعنی کہ قمر کے لیے ہے داغ جگر کا

اب یہاں سے مرزا صاحب نے جس خوبی سے گریز اختیار کیا ہے وہ ملاحظہ ہو۔

یوسف کا یہ خواب اور وہ یعقوب کی تعبیر
موجود ہے قرآن میں نہیں حاجت تفسیر
اب خواب کروں رتبہ عباس کا تحریر
وہ یوسف یعقوب نجف بازوے شبیرؑ
وہ عصر رہ شیر وہ سقائے سکینہ
معشوق علی عاشق بابائے سکینہ

مرزا صاحب نے حضرت یوسف اور حضرت عباس کا تقابل کس طرح فرمایا ہے۔ زبان بھی ملاحظہ ہو۔

کنعانیوں کا بدر تھا گر یوسف کنعان
تو ماہ بنی ہاشم سب کہتے تھے انھیں یاں
واں چاہ من یوسف کو بلا چاہ فراوان
یاں نہر شہادت میں یہ گوہر ہوا غلطان
یوسف جو گرے چاہ میں پھر چاہ سے نکلے
تا حشر نہ شبیر کی یہ چاہ سے نکلے

جس طرح حضرت یوسف نے خواب دیکھا تھا اسی طرح حضرت عباس کی والدہ حضرت ام البنین نے ایک دن خواب دیکھا۔

کیا دیکھتی ہیں خواب میں عباس کی مادر
اک باغ میں پھرتا ہے وہ حیدر کا صفدر
اک دوش پہ طوبیٰ ہے اور اک دوش پہ کوثر
گویا کہ تر و خشک ہے قبضے میں برابر
حیرت زدہ نیرنگی دنیا سے ہیں عباس
چشمہ تو ہے کاندھے پہ مگر پیاسے ہیں عباس

پھر اس خواب پریشان کو حضرت ام البنین حضرت علی مرتضیٰؑ سے اس طرح بیان فرماتی ہیں۔

حیدر سے کہا صبح کو یہ خواب پریشان
سنتے ہی پریشان ہوا وہ جامع قرآن
لب تو متبسم ہوئے آنکھیں گہر افشاں
چلائی وہ مخدومہ کہ آقا ترے قرباں
وہ مجھ کو تسلی کہ گرفتار تعب ہوں
اے وارث یعقوب میں تعبیر طلب ہوں

حضرت علی مرتضیٰؑ نے جواب دیا کہ [illegible] خواب کی تعبیر دیں گے۔ حضرت امام حسینؑ [illegible] یوں خواب کی تعبیر بیان کی۔ یہاں بھی زبان کی [illegible]

خواب آپ کا صادق ہے مبارک کرے سبحان
فرماؤ تو کہہ دوں جو نظر آیا ہے ساماں
جس باغ میں عباسؑ کو دیکھا ہے تراماں
جنت کا وہ تختہ ہے شہیدوں کا گلستاں
ہر حلق سے واں خون کا فوارہ چھٹے گا
یہ باغ ہے جس میں کہ مرا باغ کٹے گا
کاندھے پہ جو طوبیٰ نظر آیا ہے وہ کیا ہے
وہ منصب جعفر علم فوج خدا ہے
عباس علمدار سپاہ شہدا ہے
مدت ہے علمداری کی کم نام بڑا ہے
کل دوپہر آن کے یہ جاہ و حشم ہے
پھر سر ہے نہ گردن ہے نہ شانہ نہ علم ہے
اک دوش پہ مشکے کا جو پایا ہے قرینہ
وہ مشک ہے اک پیاسی کی نام اس کا سکینہ
چھوڑے گی مرے ساتھ وہ بچپن میں مدینہ
پٹے گی مرے واسطے اپنا سر و سینہ
پانی نہ دیے تین شب و روز نہ ملے گا
چلائے گی جب وا عطشا عرش ہلے گا

اس تعبیر کو سن کر حضرت ام البنین ایسی بہادر عورت پر کیا اثر ہوا اس کا ردعمل بھی مرزا دبیر کی زبان میں ملاحظہ ہو۔

یہ سن کے کئے شکر کے سجدے کئی پیہم
اور دوڑ کے عباس کے قدموں پہ ہوئی خم
ماتھے کے عوض تلوؤں کے بوسے لیے اس دم
پھر جوڑ کے ہاتھوں کو کہا صدقے ترے ہم

مادر کا نہ یہ پیار بھلا دیکھو پیارے
جو کہتے ہیں یہ اس سے سوا دیکھو پیارے

یہاں سے دوسرا دور شروع ہوتا ہے حضرت عباس جوان ہوتے ہیں حضرت ام البنین حضرت علی علیہ السلام سے عرض کرتی ہیں کہ اب میرے شہزادے کی شادی ہونا چاہیئے تاکہ میں ان کا سہرا اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں۔ اس وقت لکھنؤ میں جو طور و طریقے تھے اور اس وقت کے زمانے میں جو رواج قائم تھا اس کا اندازہ اس بند سے ہوتا ہے۔

فرمایا علی نے تجھے دل سے ہے یہ منظور
زینب کے بیاہ کی اماں ہو اب تو ہوں مسرور
شاعر کو ہو دعوت کرو اس سے یہ مذکور
رقعہ لکھو لی جو زمانے کا ہے دستور
شاطین جو یہ خوش خبری پائیں گی اماں
سو باتیں ابھی شام سے آئیں گی اماں

آج کل اور اس زمانے میں لکھنؤ میں جو رقعہ نویسی کا طریقہ تھا اس کا ذکر بھی کس انداز سے مرزا دبیر نے کیا ہے۔

عباس کو کاغذ دیا مادر نے منگا کے
ہنس کر کہا شرماتے ہو کیوں آنکھیں چرا کے
قسمت سے یہ دن آیا ہے صدقے میں خدا کے
اک دن تھا کہ مکتب میں پڑھا کرتے تھے بابا کے
اب رسم نویسی کے سزاوار ہوئے تم
قابل ہوئے سائل ہوئے ہشیار ہوئے تم

کس انکساری کے ساتھ حضرت ام البنین رقعہ لکھوا رہی ہیں

یوں لکھو کہ اشراف مدینہ کو ہے معلوم
میں بندہ ہوں عباس غلام شہ مظلوم
بابا شہ مردان اسد خالق قیوم
اور والدہ ہے خادمہ زینب و کلثوم
لکھے کی مدینہ کی سکونت لکھو داری
اور کرب و بلا جائے شہادت لکھو داری

مندرجہ بالا رقع کے لکھے جانے کے بعد ایک دن حضرت ذکیہ کے والد بزرگوار حضرت علی مرتضیٰ کے پاس مسجد میں تشریف لائے اور شادی کی درخواست کی۔

اک روز تھے محراب عبادت میں یداللہ
آ کر یہ ذکیہ کے پدر نے کہا ناگاہ
عباس کو نوشاہ بنانا ہے جو پاشاہ
اس گوہر یکتا سے تجھے رشتے کی ہے چاہ
یہ بات فقط قدر بڑھانے کے لیے ہے
لونڈی مرے گھر ہاتھ دھلانے کیلئے ہے

حضرت علی علیہ السلام کس شان سے اپنے دلبند کی شادی رچانے جاتے ہیں ملاحظہ ہو۔

پیٹھ کو چلے بیاہنے حلال مہمات
بارہ رفقا ہفت پسر شاہ کے تھے ساتھ
ہاتھوں میں بھی تسبیح زبانوں پہ مناجات
اور نقل کی شیرینی طبق میں لیے سوغات
باچھیں کھلی جاتی تھیں پیمبر کے وصی کی
شادی تھی علمدار حسین ابن علیؑ کی

عورتوں کو دولہا اور باراتیوں کو دیکھنے کا اشتیاق جو ہماری سوسائٹی میں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے اس کا اظہار مرزا صاحب نے کس طرح کیا ہے۔

سب بیبیاں کرنے لگیں چھپ چھپ کے نظارا
بولی کوئی یہ دولہا ہے یا عرش کا تارا!
اک نے کہا کیا نام خدا چہرہ ہے پیارا
عباس تک پکاری کہ خوشا بخت ہمارا
کیوں بیبیو ایسے ہی خوش اسلوب تھے یوسف
داماد مرا خوب ہے یا خوب تھے یوسف!

بارات رخصت ہو رہی ہے اور جہیز کا سامان نکل رہا ہے۔ وہ بھی ملاحظہ ہو جہیز میں حضرت عباس کو کیا سامان ملے تھے!

دو موزے دو نعلین اور اک بردیانی
خود و زرہ مصری اور تیغ صفہانی
اسپ دور کا ہمسر ساز ہمدانی
مشکیزہ پر نور بھی اک بھرنے کو پانی
مدت میں یہ سامان یہاں جمع ہوا تھا
پر حیف کہ عاشور کو اک دم میں لٹا تھا

اب دولھن دولھا کے گھر تشریف لاتی ہیں۔ اس واقعہ کو مرزا دبیر نے جس جذباتی انداز سے بیان کیا ہے وہ بھی ان کی زباں دانی اور باریک بینی کا ایک جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

القصہ دولھن نے کیا گھر دولھا کا روشن
اور ساس کے پاس آئی جھکائے ہوئے گردن
مجرا جو کیا اس نے کہا بوڑھ سہاگن
زہرا کا ترے سر پہ سدا سایۂ دامن
شبیر کی آئی ہوئی عباس بہو آئے
آئی ہو جو تجھ پہ وہ تیری ساس آئے

اس کے بعد حضرت ام البنین اپنی بہو کو حضرت زینبؑ کے پاس کس شان سے لاتی ہیں۔

پھر تھام کے بازو وہ نظر کردۂ باری
لائی اسے زینب کے حضور اور یہ پکاری
آداب بجا لاؤ یہ زہرا کی ہے پیاری
میں ساس ہوں یہ مالک و مختار تمھاری
بانو کو دکھا کر کہا یہ فخر حرم ہے
گردان کے پھر بانوئے سلطان امم ہے

اب یہاں سے مرزا دبیر واقعہ کربلا کی طرف رخ کرتے ہیں اور اپنے کلام میں کس خوبی کے ساتھ موڑ پیدا کرتے ہیں۔

اس باغ کے جب پھولنے پھلنے کے دن آئے
اک دفعہ مدینے سے نکلنے کے دن آئے
اور گرمیوں میں دھوپ سے چلنے کے دن آئے
نیزوں کی طرف پاؤں سے چلنے کے دن آئے
کوفے کو عزیمت ہوئی شاہ دو جہاں کی
تقدیر وہاں لے چکی تھی خاک جہاں کی

کربلا میں پیاس کی شدت کی وجہ سے حضرت سکینہ جس طرح متاثر تھیں اس کا اظہار اس بند سے ہوتا ہے۔

پیاسی نے صدا دی کہ چچا میں ترے قربان
لے مشک ابھی نہر پہ جائیں ترے قربان
للہ مجھے پانی پلائیں ترے قربان
منھ چوم کے غازی نے کہا میں ترے قربان
پانی کے لیے تو نہ ہو عباس کے صدقے
عباس ترے صدقے تری پیاس کے صدقے

حضرت عباس پانی لینے کے لیے فوج اعدا کی طرف تشریف لے جاتے ہیں اس کو مرزا صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔

عکس ان کا پڑا مہر درخشاں کی جبیں پر
یا برق گری خرمن خورشید مبیں پر
چھائی یہ گھٹا نور کی افلاک بریں پر
بوندوں کے عوض تاروں کا مینہ برسا زمیں پر
یہ حرف لب شوکت و اجلال سے نکلا
خورشید دو دم مشرق اقبال سے نکلا

یا تازی غازی سے ظفر بولی سنبھل جا
اور اژدر نیزہ سے کہا سب کو نگل جا
دی ماہ نو شمشیر کو آواز اچھل جا
فقنے سے کہا تو کہیں اس وقت نکل جا
جبریل پکارے ترے قربان خوشا دے
ہاں بدر علی موکب بدر دکھا دے

حضرت عباس علیہ السلام غیظ میں آکر جنگ کر رہے ہیں اور کفار شام کا قلع قمع اس طرح کر رہے ہیں۔

جس سر پہ پڑی تیغ وہ سر تن پہ نہ ٹھہرا
تن زین پہ اور زین سے توسن پہ نہ ٹھہرا
توسن کا قدم دشت کے دامن پہ نہ ٹھہرا
اور شرع میں خون تیغ کی گردن پہ نہ ٹھہرا
قانون عدالت عمل تیغ نگہ تھا
جو منکر یکتائی حق تھا وہی دو تھا

پھر فتح یابی نصیب ہوتی ہے اور حضرت عباسؑ پورے تیاری و حلال کے ساتھ نہر میں مشکیزہ سکینہ کو بھرنے اترتے ہیں پھر

مشکیزہ جو انہر سے سقائے حرم نے
کاندھے پہ دھرا بازوئے سلطان امم نے
خیمہ کا کیا قصد جو اس ابر کرم نے
گھوڑوں پہ پرے باندھ لیے فوج ستم نے
غل تھا حمزہ اس مشک کے بھرنے کا نہ لے جاؤ
دریا کی تہ سے کاٹ کے لاشے کو بہاؤ

حضرت عباسؑ نے مشکیزہ بھرنے کی دھن اور خیمہ تک پہنچنے کی جدوجہد اس منظر کو مرزا صاحب نے [illegible]

[illegible] دریا سے شرار کا آنا
گھوڑے کو کبھی روکنا اور گاہ بڑھانا
جب تیر ستم کھایا تو رو کر یہ سنایا
یا رب تو کمر میرا مشکیزہ بچانا
اک اک قدم صدمہ تھا یہ جان حزیں پر
اب مشک چھری اور گرا پانی زمیں پر

[illegible] غضب کا [illegible] وار و اذیار
اعجاز [illegible] سلطان علمدار
جن آنکھوں سے مشکیزہ [illegible] علمدار
دو تیر لگے [illegible] آنکھوں پہ اکبار
[illegible] آنکھیں [illegible]
جاتی رہی بینائی و بال سبط نبی کی

آخر کار وہی ہوا جو ہونا تھا علمدار حسینؑ نے بڑی بے جگری اور بہادری کے ساتھ اپنی بیش بہا جان قربان کر دی اور اس طرف حضرت ام البنین کے خواب کی تعبیر مکمل ہو گئی جو انھوں نے حضرت علیؑ کے زمانے میں دیکھا تھا کس طرح حضرت امام حسینؑ اور حضرت زینبؑ نے حضرت عباسؑ کی آخری آواز کو سنا اسکو بھی مرزا صاحب بڑی کرب و بے چینی کے ساتھ بیان فرماتے ہیں۔

ناگاہ صدا آئی کہ آؤ مرے بھائی
آخر ہوا عباس اٹھاؤ مرے بھائی
سر کاٹتی ہے فوج بچاؤ مرے بھائی
لاشہ مرا قبلہ کو لٹاؤ مرے بھائی
جان آنکھوں میں ہے آنکھوں میں پیکان ہے بھائی
اور آپ کے دیدار کا ارمان ہے بھائی
زینبؑ نے کہا بھائی علمدار میں واری
کہ میں مدینہ میں یہ آواز تمھاری
منھ پیٹ کے حضرت یہ پکارے کئی بار
ہم شکل نبی دوڑو مگر ٹوٹی ہماری
بابا کے گریبان کو پھاڑو علی اکبر
سب بچوں کے دامان کو پھاڑو علی اکبر

اس مرثیہ کا آخری بند اس طرح ہے مرزا صاحب مومنین کو مخاطب کرتے ہیں۔

کیا بیٹھے ہو اے خاص غلامان علمدار
دیکھو کہ لرزتی ہے ضریح شہ ابرار
سر ننگے کھڑے پیٹتے ہیں حیدر کرار
ماتم کے لیے اٹھو قیامت کے ہیں آثار
سر پیٹو ضریح شہ ابرار کے آگے
اب روؤ علمدار کو سردار کے آگے

حضرات اس مرثیہ کے مخصوص بندوں کو میں نے قلم بند کیا ہے یہ مرثیہ بہت طولانی ہے اور اب تک غالباً طبع بھی نہیں

ہوا ہے۔ میرے خیال سے صرف مخصوص لوگوں کے پاس ہوگا۔ اس مرثیہ کی زبان باریک بین، بلند خیالی، فصاحت و بلاغت اپنی جگہ بے مثال ہے۔ پھر، جگہ جگہ مرزا دبیر نے عرب، عراق اور اودھ کے اس کلچر کو بھی حسن خوبی سے پیش کیا ہے جو اس زمانے میں ہمہ گیر طور پر مانا جاتا تھا۔ میر انیس کا میں دلدادہ ہوں اور ان کے مراثی برابر مجالس میں پڑھتا ہوں مگر اس کے ساتھ ساتھ مرزا دبیر کا درجہ بھی کسی طرح میری نظروں میں کم نہیں ہے۔ دونوں دنیائے مرثیہ کے آفتاب و ماہتاب تھے۔ دونوں شاعروں نے اردو ادب کے خزانہ کو اپنے بے شمار مرثیوں سے مالا مال کر دیا ہے۔ اس بات سے خوشی ہے کہ میر انیس کی یادگار قائم ہو چکی ہے اور اس سلسلہ میں یادگار انیس کمیٹی نے پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم کی رہنمائی میں بہت کچھ کام بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ [illegible] سرکار نے بھی ان کاموں میں کافی مدد کی ہے۔ [illegible] ہے مرزا دبیر کی یاد میں کوئی [illegible] سکی ان کے خاندان کے افراد [illegible] کوئی مدد ہم اب تک نہ کر سکے [illegible] کرنا اور اس کو ایک پروگرام کے ماتحت [illegible] کی پکار ہے۔ اس وقت جبکہ ہماری سرکار اردو اکیڈمی کے ذریعہ ان کاموں میں بڑی سہولت پیدا کر رہی ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ کچھ ارباب علم و دانش اس نیک کام پر کمر بند ہو لیں اور مرزا دبیر کی مستقل یادگار قائم کرنے کا [illegible] کر لیں تو انشاء اللہ آگے چل کر ہم اپنے نیک مقصد میں کامیاب و کامران ہوں گے۔

مرزا دبیر (مرحوم)

ہونے کو نہ اس جہان میں کیا کیا ہوگا
خالی نہ بد و نیک سے اصلا ہوگا
ظالم بھی ہوئے ہیں اور ہوں گے لیکن
شبیر سا مظلوم نہ پیدا ہوگا

اصغر کو جو مقتل میں لاتے تھے حسینؑ — مردے کو کلیجے سے لگاتے تھے حسینؑ
از بس کے زمین کربلا جلتی تھی — گہ رکھتے تھے لاش گہ اٹھاتے تھے حسینؑ

مرزا دبیر کمالاتِ فن کے آئینے میں

مولانا سید محمد جابر صاحب باقری جورا سی
(مدرسۃ الواعظین ۱۶، کیننگ اسٹریٹ، لکھنؤ ۳)

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخِ کہن کانپ رہا ہے
رتھ کا بدنِ زیرِ کفن کانپ رہا ہے
خود عرش خدا فرشِ زمن کانپ رہا ہے
شمشیر کی دیکھ کے حیدر کے پسر کو
فولاد لرزتا ہے میں سیسے ہوئے پر کو

خدائے سخن مرزا دبیر مرحوم کے اس بند میں جو شوکت
[illegible] موجود ہے اس کے
[illegible] ثابت نہیں [illegible] دبیر اس قبیل کی خصوصیات سے مالا
مال ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ دبیر کا بھی مخصوص انداز ہے
جدا انھوں نے اس اقلیم سخن گوئی کے جس میدان میں قدم رکھا جس
صنف میں طبع آزمائی فرمائی اس میں بازی لے گئے ان کے رنگا رنگ
کلام کے مختلف نمونے مکمل طور سے تو نہیں پیش کیے جا سکتے لیکن پھر
بھی چیدہ چیدہ کلام کا کچھ حصہ بطور نمونہ پیش ہے

درج ذیل بند میں امام کی تعریف کرنے کے ساتھ ساتھ
مختلف چیزوں کو بڑے اچھے اسلوب سے جمع کرتے ہیں اور واقعہ
تو یہ ہے کہ ہر مصرع میں کچھ چیزیں کم و بیش نہیں۔

نقاش و نقش کاتب و خط بانی و بنا
بود و نبود و ذات و صفت ہستی و فنا
آدم ملک، زمین فلک، گردش و کیمیا
دنیا و دیں، حدوث و قدم، بندہ و خدا
سب شاہد کمال شہ مشرقین حسین
جب تک خدا کا نام ہے مالک حسین حسین

اب ذرا مناسبات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بند ملاحظہ فرمائیے۔

باران و قطرہ باغ و گل و معدن و گہر
صحرا و ذرہ برج و نجوم آتش و شرر
طور و کلیم و آب بقا خضر نامور
ظلمات و نور و شہر و بیابان و خشک و تر
شاہد ہیں سب کہ صاحب اعجاز ہیں حسین
جاں آفریں کے عاشق جاں باز ہیں حسین

مختلف روشن و منور چیزوں کا رخ امام علیہ السلام سے
کس خوبی کے ساتھ موازنہ فرماتے ہیں۔

شمع و چراغ و آئینہ و صبح و آفتاب
باغ و بہار یاسمن و لالہ و گلاب
ناہید و بدر و مشتری و قطب و ماہتاب
آبِ حیات لالِ بدخشاں دُرِ خوش آب
یوسف اور ان کے سارے خریدار اک طرف
سب اک طرف یہ روئے ضیا بار اک طرف

امیر المومنین کی سخاوت کا موازنہ ابر نیساں سے کرتے ہوئے

رہ جاتا ہیں انگشت بدنداں ہو کر
حیدر کو کہا ابر سخنداں ہو کر
مانا کہ گہر بخش ہے نیساں بھی مگر
وہ دیتا ہے رو رو کے یہ خنداں ہو کر

مرزا دبیر مرحوم کے کلام پر بھرپور تبصرہ کر کے مضمون کو طول
نہیں دینا چاہتا اور پھر ایک بے بضاعت انسان مکمل طور سے

تبصرہ کر بھی نہیں سکتا صرف کلام کے نمونے پیش کر رہا ہوں۔ ناظرین کلام کی خوبیوں سے خود متعارف ہو سکتے ہیں۔ دستِ ذیل بند میں حضرت عباس کے چہرۂ مبارک کا آئینہ سے جس لطیف پیرائے میں مرزا مرحوم نے موازنہ فرمایا ہے اس کی داد نہیں دی جا سکتی۔

آئینہ کہا رخ کو تو کچھ بھی نہ خطا کی
صنعت وہ سکندر کی یہ صنعت ہے خدا کی
واں خاک سے صیقل یہاں قدرت نے جلا کی
طالع نے کس آئینہ کو خوبی یہ عطا کی
ہر آئینہ میں چہرۂ انساں نظر آیا
اس رخ میں جمالِ شہِ مرداں نظر آیا

ہند کا زبانی امام حسین علیہ السلام اور یزید کا تقابل کچھ اس طرح فرمایا ہے کہ ہر شعر لاجواب بن گیا ہے۔

وہ تخت نشیں دوزخِ اسفل کا مکیں ہے
یہ گوشہ نشیں ہمرِ نبوت کا مکیں ہے
وہ غول ہے یہ خضر ہے وہ شک یہ یقیں ہے
وہ سنگ زمیں، یہ گہرِ عرشِ بریں ہے
زنار ہے وہ گردنِ ارباب خطا کا
اور نام خدا سبحہ ہے یہ خاک شفا کا

وہ عار ہے یہ فخر ہے، وہ ننگ ہے یہ نام
شیطاں کا وہ وسواس، یہ رحمن کا الہام
وہ درد ہے تسکین وہ ایذا ہے یہ آرام
وہ دیر ہے یہ کعبہ وہ کفر ہے یہ اسلام
وہ جہل میں بو جہل یہ دانش میں نبی ہے
وہ بخل میں قارون، یہ بخشش میں علی ہے

پابندۂ معبود ہے، وہ بندۂ زر ہے
یہ نور کا شعلہ، وہ جہنم کا شرر ہے
وہ شب ہے یہ نیک، وہ عقرب یہ قمر ہے
وہ ناخنِ پا کفر کا، یہ دین کا سر ہے
یہ خیر وہ شر اللہ یہ نیکی وہ بدی ہے
وہ بت ہے بلا شک، یہ خلیل احد کا ہے

وہ نار ہے یہ فردوس، وہ زقوم ہے یہ طوبیٰ
وہ زخم ہے یہ مرہم، وہ مرض اور یہ مسیحا
وہ سحر ہے اعجاز، وہ فرعون ہے یہ موسیٰ
وہ قہر ہے یہ رحمت، وہ بخاست ہے یہ تقویٰ
ہر صحف معبود کی صحت یہ فقط ہے:
وہ حرف غلط لفظ غلط نسخہ غلط ہے

وہ زہر ہلاہل، یہ مجھے آب بقا ہے
وہ ہے مرض الموت، یہ تصویر شفا ہے
وہ رہزنِ اسلام ہے، یہ راہ نما ہے
وہ سایۂ آسیب ہے، یہ ظلِ خدا ہے
نخوت ہے اگر ملک پہ اس اہلِ جفا کو
مل جاتے ہیں یاں دونوں جہاں ایک گدا کو

ایک پختہ عقیدہ رکھنے والے عزادار کی حیثیت سے مراسم عزاداری کی افادیت کو ان کے مناسبات کا التزام رکھتے ہوئے پیش فرماتے ہیں۔

تابوت اٹھانے کا صلہ قبر کی راحت
[illegible] بنانے کی جزا [illegible] جنت
[illegible] کے [illegible] میں کوثر کی حکومت
[illegible] تعزیہ [illegible] کی بدولت
[illegible] سو کیا ہے
وہ سوق نہیں دائرۂ حفظِ خدا ہے

صنوبیاق الاعداد میں پنجتن علیہ السلام کی مدح کرتے ہوئے

ہر فرد کو خدا نے دیا خمسۂ حواس
تا حق پنجتن کے شناسا ہوں حق شناس
ناموں پہ ان کے پانچ نمازوں کا ہے اساس
جس کو کہ ان کا پاس ہے وہ ہے خدا کے پاس
پانچ انگلیوں سے ہم نے چنا ایک بات کو
بس پنجتن کے سامنے پھیلا دو ہاتھ کو

مرزا دبیر مرحوم نے صنعت مقلوب مستوی میں جو طبع آزمائی

فرمائی ہے اس کی مثال ذیل کے بیت میں ملتی ہے۔ بیت کے دوسرے مصرع کو الٹیئے تو وہی مصرع بن جاتا ہے۔

پرزے نہ کرو مصحفِ اسلام ہمارا
آرام ہمارا ہے یہ آرام ہمارا

صنعت مقلوب ہی میں آپ کا یہ بند بھی ہے جس میں ہر مصرع کے آخری لفظ کو الٹ کر دوسرے مصرع کی ابتدا اس معکوس نقطہ کو فرمائی ہے۔

رات ایسی سیہ بخوفِ لشکر سے ہوئی تار
رات ایک طرف ظلمت دوزخ تھی نگوں سار
راس آئی نہ یہ جنگ ہوئی جینے سے بے زار
کرنا اس میں یہ تھا تیغ کے ساتھی ہوئی یار
ہے صنعت مقلوب کل اول تو بجا ہے
آخر ولد القلب ہر اک اہل جفا ہے

دیگر صنعتوں کی طرح مرزا مرحوم نے صنعت منقوط اور غیر منقوط دونوں میں طبع آزمائی فرمائی ہے منقوط اس کرسی میں موجود ہے۔

جب بخت بن قیس نے زینت بخشی
زینب نے تشفی تب بہ تشفق بخشی
تیغیں جز تن، جبیں شق، جی بے چین
جنت بخشی نبی نے جنت بخشی

صنعت غیر منقوط یعنی صنعت ہمل میں آپ کا کلام دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ حضرت حر کے حملے کا نقشہ کھینچتے ہیں۔

حر حملہ ور ہوا کہ اسد حملہ ور ہوا
وہ حملہ ور ادھر ادھر اسلام ور ہوا
سرگرم معرکہ سر عدا اگر ہوا
وہ گل کھلا کر اور کم رسرہ ہوا
اہل حسد کو درس ادھر آہ آہ کا
حور و ملک کو درس ادھر واہ واہ کا

ثابت لکھنوی لکھتے ہیں کہ اس صنعت میں پورا ایک مرثیہ مرزا مرحوم کا ہے جو غیر منقوط ہے جس کا مطلع یہ ہے ع

مہر علم سرور اکرم ہوا طالع (حیات دبیر ص۱۹۵)

پروفیسر محمد حسین آزاد نے جس مقطع مرثیے کا حوالہ دیا ہے اس کا مطلع یہ لکھا ہے

ع ہم حاجتِ ہما مرادِ ہم رسا ہوا (آب حیات ص۵۳۷)

اگر ایک جانب مرزا دبیر مرحوم کو صنف شاعری کی مختلف صنعتوں پر عبور حاصل تھا تو دوسری جانب اک ماہر نفسیات کی حیثیت سے منظر کشی فرماتے ہیں۔ امام حسین علیہ السلام سوال آب کے لیے حضرت علی اصغر کو لے کر فوج اعدا کے سامنے آتے ہیں۔ بڑا سخت موقع ہے۔ سوال بھی کرنا ہے لیکن غیرت حمیت مانع ہے اس نازک موقع پر مرزا مرحوم نے بڑے اچھے انداز سے نبھایا ہے

پہنچے قریب فوج تو تھرا کے رہ گئے
چاہا کریں سوال تو شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے
چادر پسر کے چہرے سے سرکا کے رہ گئے
آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ بھکو لائے ہیں
اصغر تمہارے پاس غرض لے کے آئے ہیں

حصول آب کی ناکامی اور بیٹے کی مظلومیت و بے چارگی کا جو اثر باپ پر مرتب ہوتا ہے اسے بند کے آخری مصرع میں نفسیاتی انداز سے واضح فرمایا ہے۔

پھر ہونٹ بے زبان کے چوسے جھکا کے سر
رو کر کہا جو کہنا تھا وہ کہہ چکا پدر
باقی رہی نہ بات کوئی اے مرے پسر
سوکھی زبان تم بھی دکھا دو نکال کر
پھیری زباں جو ہونٹوں پہ اس نور عین نے
تھرا کے آسمان کو دیکھا حسین نے

ہند اور امام زین العابدین کے سوال و جواب میں بیمار کربلا کی بے چارگی و بے بسی کی جو تصویر کشی کی گئی ہے وہ بھی اک

ماہر نفسیات کا کلام ہے۔

بند نے پوچھا مرض کیا ہے کہا بے پدری
رو کے وہ بولی دوا کیا ہے کہا نوحہ گری
گھر جو دریافت کیا کہنے لگے در بدری
بولی لیتا ہے خبر کون کہا بے خبری
آہ کرنے کا سبب پوچھا تو شرمانے لگے
تازیانوں کے نشاں پشت پہ دکھلانے لگے

اس مختصر مضمون میں نہ تو مرزا دبیر مرحوم کے کلام پر سیر حاصل بحث کی جا سکتی ہے اور نہ کلام کے خصوصیات کو مکمل طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس میدان میں مرثیہ گوئی میں دبیر کا کیا درجہ تھا اس کے لیے یہی کافی ہے کہ مرزا غالب ایسا باکمال شاعر بھی مرزا دبیر کے مقابلے میں خود کو بے سرو سامان پاتا ہے۔ ایک مرتبہ غالب نے مرثیہ کہنا شروع کیا صرف تین بند کہے اور قلم ہاتھ سے رکھ دیا۔ یہ بند پڑھ کر مرزا غالب نے لوگوں سے کہا۔ واقعی یہ حق مرزا دبیر کا ہے دوسرا اس راہ میں قدم نہیں اٹھ سکتا (جلوۂ خضر ص۲۲۵)

مفتی محمد عباس مرحوم جو ایک زبردست عالم اور بے مثل ادیب تھے ایک موقع پر میر انیس اور مرزا دبیر کے متعلق فرماتے ہیں میر صاحب کا کلام فصیح و شیریں ہے، مرزا صاحب کا کلام دقیق و رنگین ہے۔ یہ ہر ایک کا ذائقہ مختلف ہے تو ایک کو دوسرے پر ترجیح کیسے دی جا سکتی ہے۔ (عشرۂ کاملہ کتاب سائل)

صاحب طبقات علامہ حامد حسین صاحب طاب ثراہ مرزا صاحب کی اس ٹیپ کو جو اسپ امام حسین کی شان میں ہے پڑھ کر کہتے تھے کہ یہ مضمون تو قدسی میں بھی نہیں دیکھا گیا ؎

طے ہر قدم پہ ایک جینے کی راہ ہے
رویت ہلال نعل کی اس پر گواہ ہے (رد النوازد)

مشہور عالم اہلسنت مولوی عبدالحی صاحب فرنگی محلی نے ایک موقع پر کلام انیس و دبیر سننے کے بعد فرمایا تھا کہ ایسے کامل شاعر ہندوستان میں تو کیا عرب و عجم میں بھی نہیں ملیں گے (حیات دبیر ص۲۰۰)

امیر مینائی اکثر فرمایا کرتے تھے: میں تمام شعرائے عجم پر دو ایرانی شاعروں کو ترجیح دیتا ہوں، فردوسی و جامی اور دبیر و انیس کو فردوسی و جامی پر بھی ترجیح دیتا ہوں (حیات دبیر ص۲۰۶)

مولانا شبلی نعمانی نے بھی مرزا دبیر کے کمال کا اعتراف کیا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں۔ بعض موقعوں پر مرزا دبیر صاحب نے جس بلاغت سے مضمون کو ادا کیا ہے میر انیس سے نہیں ہو سکا (موازنۂ انیس و دبیر ص۲۷۷)

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں: اس میں کچھ شک نہیں کہ مرزا صاحب کی قوت متخیلہ نہایت زبردست ہے وہ اتنے دور کے استعارات و تشبیہات ڈھونڈھ کر پیدا کرتے ہیں کہ وہاں تک ان کے حریفوں کا طائر وہم پرواز نہیں کر سکتا۔ (موازنہ ص۲۵۱)

پروفیسر محمد حسین آزاد نے مرزا دبیر پر بہت سنجیدہ تبصرہ فرمایا ہے لکھتے ہیں: خاندانی شاعر نہ تھے لڑکپن میں مرثیہ پڑھتے تھے اس شوق نے مشق کی سیڑھی سے مرثیہ گوئی کے عرش اکمال پر پہنچا دیا۔ میر ظفر حسین ضمیر کے شاگرد ہوئے اور جو کچھ استاد سے پایا اسے بہت بلند اور روشن کر کے دکھا دیا تمام عمر میں کسی اتفاقی سبب سے کوئی غزل یا شعر کہا ہو ورنہ مرثیہ گوئی کے فن کو لیا اور اس درجہ تک پہنچا دیا کہ جس سے آگے ترقی کا راستہ بند ہو گیا ابتدا سے اس شغل کو آخرت کا سامان سمجھا اور نیک نیتی سے اس کا ثمرہ لیا (آب حیات ص۵۳۷)

مرزا مرحوم ایک مقام پر خود فرماتے ہیں

سرکار سلاطین سے سروکار نہیں
جز مجلس مولا کوئی دربار نہیں
محتاج ہوں میں امام بے سر کا دبیر
سامان کیا کہ سر بھی درکار نہیں

بادشاہ اودھ واجد علی شاہ کو لوگ خدا اندکہ کرتے تھے۔ مرزا مرحوم نے ایک مرتبہ بادشاہ کے سامنے بند پڑھا

[illegible] رباعی پڑھی۔

نادان کیوں [illegible] کو کھو دہنہ کیوں
یا سلسلۂ [illegible] کو پابند کیوں
اک روز [illegible] کو [illegible] ہے دبیر
بندوں کو [illegible] خدا اندہ کیوں

آج اردو ادب میں مرثیہ کا جو مقام ہے وہ محتاج تعارف نہیں اور یہ کارنامہ ہے انیس و دبیر کا کہ زبان اردو کے ارباب حل و عقد باوجود نظریاتی اختلاف کے مرثیہ کو ایک اہم مقام دینے پر مجبور ہو گئے ورنہ مرثیوں کی وہی حیثیت ہوتی جو آج کل مدح معصومین میں کہے جانے والے قصائد کا حال ہے حالانکہ اکثر مقتدر شعرا کا مرجیہ کلام اردو کا سرمایہ ہے لیکن یہ کلام اردو ادب میں اس لیے جگہ حاصل نہیں کر سکا کہ اس میں مدح اہلبیت ہے

مرزا دبیر کے مرثیوں نے زبان و ادب کو اسطرح نکھارا کہ بقول مولوی امیر احمد صاحب۔ مرزا دبیر نے شوکت الفاظ اور مضمون آفرینی کے طلسمات سے اس زمین کو آسمان بنا دیا (یادگار انیس ص۱۱۳)

لیکن اس کے ساتھ مرثیے کی علت غائی کو پیش نظر رکھا اور اسے فراموش نہ کیا۔ آج ہم اگر ادب کے ساتھ مرزا دبیر کے فن پر کچھ روشنی ڈال رہے ہیں تو صرف اس لیے کہ وہ حقیقی مداح اہل بیت تھے۔ پروفیسر آزاد نے صحیح فرمایا ہے۔

"یہ بات درست ہے کہ مرزا دبیر کے پڑھنے میں وہ خوش ادائی نہ تھی لیکن حسن قبول اور فیض تاثیر خدا نے دیا تھا ان کا مرثیہ کوئی اور بھی پڑھتا تھا تو اکثر رونے رلانے میں کامیاب ہوتا تھا کہ یہی اس کام کی علت غائی ہے۔

(آب حیات ص۵۴۹)

غرض مرزا سلامت علی دبیر ایسا کامل الفن پیدا ہوا اب محال ہے ان کی جو جگہ ماضی میں خالی ہوئی تھی وہ اب بھی خالی اور مستقبل میں بھی اس جگہ کا پر ہونا تقریباً محال ہے۔

آسماں بے ماہ کامل سدرہ بے روح الامین
طور بے موسیٰ۔ ادب بے شمس۔ منبر بے دبیر

۱۲۹۳ھ سال وفات

آقا سے کہیں کرتے ہیں دوری بندے
شیعہ ہیں حسینؑ کے حضوری بندے
کیا خوب کھلے سیاہ پوشی کے رمز
اللہ کے سائے میں ہیں نوری بندے

ہے ماتم اہل بیت میں بیت اللہ
پوشش ہے سیاہ رنگ اسود ہے گواہ
زمزم نہ کہو کعبہ ہے گریاں دائم
بیجھو نہ ستون ہے کشش نالہ و آہ

مرزا دبیر مغفور کے مطبوعہ سلام

جناب دلشاد حسین صاحب زیدپوری

یوں تو کلام دبیر مرحوم کو بہت سے مطابع نے شایع کیا مگر جس درجہ شہرت "دفتر ماتم" کی بیس جلدوں کو ہے جن میں جلد ۱۱ نہایت جلد ۱۲ میں مراثی، جلد ۱۳ مثنوی احسن القصص جلد ۱۴، ۱۵ و ۱۶ میں سلام جلد ۱۷ تھے اور جلد ۲۰ رباعیوں پر مشتمل ہیں، جسے خود مرزا محمد جعفر اوج مرحوم نے اپنے کتب خانہ سے عبد الحسین مرحوم تاجر کتب کو طباعت کے لئے دیا تھا۔ مگر ان جلدوں کے سلسلے میں مرزا محمد طاہر رفیع مرحوم نے جو مرزا دبیر مرحوم کے پوتے اور مرزا اوج مرحوم کے بیٹے تھے "سبع شانی" مرتبۂ سرفراز حسین خبیر مرحوم میں ان مطبوعہ جلدوں میں بعض کلام کو اپنے دادا مرحوم کے اصل مخطوطوں کے مطابق نہیں پایا ہے۔

اب جبکہ یہ جلدیں بھی نایاب ہو رہی ہیں تو وہ اصل مخطوطے اور خود صاحب تصنیف کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کلام کہاں سے دستیاب ہوں جنھیں اعتماد کے ساتھ بالیقین مرزا دبیر مرحوم کا اصل کلام کہا جا سکے۔

سردست ان مطبوعہ بیس جلدوں میں جن میں جلد ۱۲ و ۱۳ اور ۱۴ محض سلاموں پر مشتمل ہیں۔ ان تینوں جلدوں میں دبیر مرحوم کے سلام کے ساتھ ساتھ موصوف کے شاگردوں کے بھی سلام شامل ہیں اور اسی لئے تینوں جلدوں میں فرہنگ بھی دی گئی ہے جس میں مرحوم کے شاگردوں کے نام اور تخلص بتائے گئے ہیں لہٰذا میں ان تینوں جلدوں میں سے ہر جلد میں جو سلام کی تعداد لکھی گئی ہے وہ علیحدہ علیحدہ مع فہرست پیش کر رہا ہوں۔ البتہ ایسے بھی دو چار سلام ان جلدوں میں ملے جو بغیر تخلص کے ہیں ان کے لیے اہل تحقیق کی مزید تصدیق ضروری ہے۔

مرزا صاحب کے سلاموں کی فہرست پیش کرنے کے قبل مجھ جیسے کم مایہ کے لئے اپنے اس مفروضے میں اضافہ سخن میں سے سلام پر کچھ روشنی ڈالنا یا سلام ہائے دبیر پر کچھ تحریر کرنا سخت دشوار ہے البتہ اس سلسلے میں اپنی مختصر معلومات ارباب نظر کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

جہاں تک میرا حقیر مطالعہ ہے اس کا ٹھیک سراغ نہیں ملتا کہ سلام کہنے کی ابتدا کہاں سے ہوئی اور وہ پہلا ہندستانی شاعر کون ہے جسے سلام گوئی کا موجد کہا جا سکے۔

البتہ اس مختصر تمہید کے بعد میرا خیال ہے کہ مرثیہ نگاروں نے مرثیہ کی طرز خوانندگی کا جز جس طرح مرثیہ کے ساتھ ساتھ رباعی کو قرار دیا۔ اسی طرح مرثیہ کے ساتھ سلام کی تصنیف مرثیہ نگاروں کو پسند آئی ہو اور اس طرح سلام کو عام رواج مرثیہ نگاروں کے سبب حاصل ہوا ہو اور یا پھر یوں عرض کروں کہ سلام کہنے کی ابتدا ہندستان میں مرثیہ نگار شعراء نے بھی پہلے کی ہو اور اسے فروغ انیس و دبیر نے دیا ہو یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ جس کثرت کے ساتھ انیس کے مقابلے میں دبیر کے مراثی رباعی خمسے پائے جاتے ہیں اسی طرح سلاموں کی بھی دبیر کے یہاں کوئی انتہا نہیں ہے۔

کیا خوب یہ دو مصرعے مقطعے میں دبیر مرحوم نے نظم فرمائے ہیں۔

یہ سلام شہ ابرار کیا خوب دبیر
دیکھ انعام میں مولا تجھے کیا دیتے ہیں

اس شعر سے دبیر مرحوم کی عقیدت اپنے ممدوح سے صاف صاف ظاہر ہو رہی ہے اور مداح اہلبیتؑ کو بارگاہ ممدوح سے جو جو عطایا حاصل ہوئے اس میں سے ایک ادنیٰ عطا شاید یہ بھی رہی ہو کہ ہر قافیہ اور ردیف جو تصنیف کے سلسلے میں سلام کے لیے دشوار ہو سکتی تھی وہ دبیر مرحوم کے لئے بے حد آسان بن گئی۔ آپ کے سلام دو طرح کے ملتے ہیں۔ ایک کی ابتدا لفظ سلام اور سلامی، مجرئی اور مجرائی کے ساتھ اور دوسرے غزل کی طرح جیسے آپ فہرست میں ملاحظہ فرمائیں گے:۔

دفتر ماتم جلد شانزدہم حصہ اول مجموعہ سلام

صفحات ۲۰۴ تعداد سلام ۱۱۰

ردیف الف:۔

۱۔ اے سلامی عشق مولا ہو گیا
۲۔ مجرائی شمع ساں سر مولا جدا ہوا۔
۳۔ مجرئی حر نے جو شبیرؑ کو آقا سمجھا
۴۔ نظم جو وصف قد شمشاد زہرا ہو گیا
۵۔ مجرئی گوشہ کو دست ذبح غش آیا کیا
۶۔ ملنے سے پنجتن کے سلامی خدا ملا
۷۔ عطا یا شہ ہل اتا کیجئے گا
۸۔ شہ کا وہ تشنہ دہن یاد جو آ جاتا ہے
۹۔ غم شہ سے ہے داغ سینہ ہمارا
۱۰۔ مجرائی گرم نالہ جو وقت بکا ہوا
۱۱۔ مجرائی حق نے شہ کو عجب حوصلہ دیا
۱۲۔ کربلا کو مجرئی جس روز جانا ہو گیا
۱۳۔ مجرئی بہر زیارت نہیں جایا جاتا
۱۴۔ مجرائی جس نے ماتم سرور بپا کیا
۱۵۔ مجرئی شاہ ہدا کو آج تپنم ہو چکا
۱۶۔ مجرا اسے مدام جو مداح رضا میں تھا
۱۷۔ اے مجرئی شہید جو شیر خدا ہوا
۱۸۔ مہر باں برج امامت کا ستارا ہو گیا
۱۹۔ شیعوں کو ذوالجلال نے مجرائی کیا دیا
۲۰۔ مجرئی موسم عزا آیا
۲۱۔ مسطور اگر کمال ہو سرور امام کا
۲۲۔ نہ دفن بعد فنا ابن بو تراب ہوا
۲۳۔ اے سلامی دل شبیر میں ہو گھر میرا
۲۴۔ نانا نے جس کے مجرئی شق القمر کیا
۲۵۔ اے مجرئی تو حر کے مقدر کو دیکھنا
۲۶۔ سلامی خاک ہوا خاک سے غبار ہوا
۲۷۔ ہوئے جو مجرئی سلطان بحر و بر پیدا
۲۸۔ دل پہ میرے زخم ہے مجرائی اس تلوار کا
۲۹۔ در علیؑ کا میسر جسے غبار ہوا
۳۰۔ مجرئی کیا حوصلہ تھا اصغر بے شیر کا
۳۱۔ جو کہ قربان مزار علی اکبرؑ ہو گا
۳۲۔ دفن ہو در شاہ نجف پر اگر اپنا
۳۳۔ شہ سے مجرائی ہوا جبکہ علمدار جدا
۳۴۔ میری ہر ایک سے ہو مجرئی تقریر جدا
۳۵۔ موزوں سلام شاہ کا مطلع اگر کیا
۳۶۔ صدف چشم سے مجرائی وہ گوہر نکلا
۳۷۔ پایا جو شاہ دیں کا تن و سر جدا جدا
۳۸۔ مجرائی مقام اب سر منبر ہے ہمارا
۳۹۔ لکھتے ہیں وصف احمد و حیدرؑ جدا جدا
۴۰۔ رو دے سلامی ذیست کا ہو اعتبار کیا
۴۱۔ مجرئی زائر ہوا جو حضرت شبیرؑ کا
۴۲۔ لکھ ماتم حسینؑ میں دفتر جدا جدا
۴۳۔ مجرئی شاہ سے کہتی تھی یہ رو کر صغرا
۴۴۔ اختر سے قلب شیعہ روشن ضمیر کا
۴۵۔ مجرائی جب کہ خاتمہ پنجتن ہوا
۴۶۔ مجرئی اوج پہ ہے دیدۂ گریاں اپنا

۴۷۔ جو دل میں ولائے شہ مرداں نہیں رکھتا
۴۸۔ صغرا نے بھی اے بجرئی غم کھائے ہیں کیا کیا
۴۹۔ جو سلامی شہ والا کا ثنا خواں ہو گا
۵۰۔ بجرئی جب ہوا پامال چمن زہرا کا
۵۱۔ پامال کربلا میں جو شہ کا چمن ہوا
۵۲۔ بجرائی قمر چھپ گیا خاتون جناں کا
۵۳۔ بجرئی خیمے میں شہ کے حشر کا ساماں ہوا
۵۴۔ غم کا سر حسینؑ پہ کوہ گراں گرا
۵۵۔ بزم ماتم میں سلامی نام روشن ہو گیا
۵۶۔ سلامی ماتم سرور کہاں نہیں ہوتا
۵۷۔ بجرائی ثنا خواں ہے جو سلطان زمن کا
۵۸۔ پیشوا راہ نما ہے شہ مرداں اپنا
۵۹۔ اکبرؑ کا جب نہ رن میں سلامی نشاں ملا
۶۰۔ در دولت امیرؑ المومنیں کا
۶۱۔ بجرئی حضرت کا مہماں ہو گیا
۶۲۔ رو تو اے بجرئی اب موسم ماتم آیا
۶۳۔ مدح شبیرؑ میں مصرع جو رقم ہوئے گا
۶۴۔ وقفہ عباسؑ کو بجرائی قضا نے نہ دیا
۶۵۔ اک نہ اک نیرنگ ہوتا ہی رہا
۶۶۔ سلامی حشر جو سوئے لشکر ثواب آیا

ردیف با:

۶۷۔ شب عاشور بھائی کو بلا میں دیکھ کر زینبؑ
۶۸۔ پائے نہ بجرئی خلف بو تراب آب

ردیف تا:

۶۹۔ بجرئی یوں کوئی باندھے نہ گنہگار کے ہات
۷۰۔ یوں آبرو ہے بجرئی اشک عزا کے سات
۷۱۔ بجرائی اس سکینہؑ کے باندھے رسن میں ہات

ردیف جیم:

۷۲۔ ہر تعزیہ خانے میں قیامت ہے بپا آج

ردیف دال:

۷۳۔ بجرئی کوئی نہ کرتا [illegible] سجاد
۷۴۔ بجرئی بعد [illegible] شبیر
۷۵۔ [illegible]
۷۶۔ [illegible]

ردیف را:

۷۷۔ بجرائی کہا شہ نے کہ یاور نہیں اصغر
۷۸۔ کیوں نہ پھر آہ سے گردیں فلک پیر سے تیر
۷۹۔ سلام اس پہ جو پہنے ہے ناتواں زنجیر
۸۰۔ بجرئی جب کہ چڑھا شاہ کا سر نیزے پر
۸۱۔ ہو خاک سلامی در سرور کے برابر
۸۲۔ بجرئی نور دو صفا ہے میری گویائی میں
۸۳۔ چل سلامی آستان شاہ پر
۸۴۔ بجرائی سبک دوش ہے منبر سے اتر کر
۸۵۔ در بان در شاہ ہے رضواں کے برابر
۸۶۔ خزاں چمن ہوا زہرا کا درمیان بہار
۸۷۔ غم حسینؑ میں بھولے ہیں داستان بہار
۸۸۔ نام شبیرؑ کا لے بجرئی گریاں ہو کر
۸۹۔ جز روضۂ شبیرؑ نہیں امن کہیں اور

ردیف سین:

۹۰۔ نگہ مہر کا جلوہ جو دکھائے عباسؑ

ردیف فا:

۹۱۔ بجرئی انصار کم تھے شاہ والا کے [illegible]

ردیف کاف:

۹۲۔ بجرئی دامن میں لی جب کربلا کے بن کی خاک
۹۳۔ سوز غم شبیرؑ میں ہے یہ اثر [illegible]

ردیف لام:

۹۴۔ یاد آتے ہیں [illegible]
۹۵۔ سیپارہ ہیں بصورت قرآن [illegible]
۹۶۔ اے بجرئی بلا میں ہیں شبیرؑ آج کل
۹۷۔ ہیں آج بجرئی اسی تشنہ دہن کے پھول

ردیف میم:

۹۸۔ اے بجرئی اس بحر میں وہ شعر سنا گرم
۹۹۔ بجز سلام لکھے گر نہ [illegible]

۱۰۰۔ مجرئی خلد ہے سرکار امام مظلوم

ردیف نون :-

۱۰۱۔ نام پر شاہ کے پانی جو پلا دیتے ہیں
۱۰۲۔ مجرئی پاؤں جہاں شاہ ہوا رکھتے ہیں
۱۰۳۔ غم شبیرؑ میں جو اشک بہانے کا نہیں
۱۰۴۔ کہے نہ مجرئی کیوں داغ شہ حسینؑ
۱۰۵۔ مجرائی شہ کے غم میں کہیں انتہا نہیں
۱۰۶۔ مجرئی شیعوں پہ واجب ہو گا ماتم میں
۱۰۷۔ مجرائی دو روضۂ شاہ ہوا نہیں
۱۰۸۔ طالب نہ سلطنت کے نہ ظل ہما کے ہیں
۱۰۹۔ غم آل عبا ہے اور میں ہوں
۱۱۰۔ مجرئی حاضر بزم شہ والا میں ہوں
۱۱۱۔ سلامی کسی کا سہارا نہیں

دفتر ماتم جلد ہفتم، ہم حصۂ دوم مجموعہ سلام
صفحات ۲۵۴، تعداد سلام ۱۳۴

ردیف نون :-

۱۔ سلام اُن پہ جو غم میں مبتلا ہیں
۲۔ جلوہ ہے جو غبار رہ بوترابؑ میں
۳۔ مجرائی روتا ہوں غم بوترابؑ میں
۴۔ خبر اشک نخل غم میں سلامی ثمر نہیں
۵۔ مجرئی اکبرؑ کے ماتم میں پیمبرؐ روتے ہیں
۶۔ سلامی لاشۂ اصغرؑ نہ تھا آغوش مسرور میں
۷۔ مجرائی وصف روضۂ شبیرؑ کیا کریں
۸۔ مثل فلک بلند ہیں منبر کہاں کہاں
۹۔ سونا ہے چین سے جو سلامی مزار میں
۱۰۔ اے سلامی میں کہاں منبر شبیرؑ کہاں
۱۱۔ ہے مکرر گیسوئے رخ اکبرؑ کہاں کہاں
۱۲۔ مجرئی وصف ماتم کی ہیں تفسیر حسینؑ
۱۳۔ مجرئی تا قیامت محشر پہ ہے محشر ان دنوں
۱۴۔ شمیم روضۂ شہ سے دماغ جو دیتے ہیں
۱۵۔ مجرائی نہ کیوں کر رہے ماتم رمضاں میں
۱۶۔ کیوں نہ پھر قلزم ہو لے مجرئی ہم چشموں میں
۱۷۔ گر طوف قبر سید عالی ہمہ کر دوں
۱۸۔ گو کہ اے مجرئی وہ تشنہ دہن کتنے ہیں
۱۹۔ عصیاں سے مجرئی نہیں رنج محن ہمیں
۲۰۔ مجرئی شہ نے کہا مرگ کا خواہاں ہوں میں
۲۱۔ رہے جو مجرئی شہ کے فغاں میں
۲۲۔ سلامی نجف کو عناں کھینچتے ہیں
۲۳۔ جو شہ تیغ شعلہ فشاں کھینچتے ہیں
۲۴۔ جو مجرائی سیف زباں کھینچتے ہیں
۲۵۔ عتاب وہ نہیں ہیں سلیماں زمن کے ہیں
۲۶۔ حضرتؐ کے اہلبیتؑ کا جو مدح خواں نہیں
۲۷۔ مجرئی اشک جو بہاتے ہیں
۲۸۔ السلام اے قبر زیبائے حسینؑ
۲۹۔ سلامی اوج فلک پر نہیں یہ تلوے ہیں
۳۰۔ سلامی آج مدینے میں ہو عزائے حسینؑ
۳۱۔ غم شہ میں گر اشک باری ہے
۳۲۔ مجرائی دل فگار جو گلشن میں پھول ہیں

ردیف واؤ :-

۳۳۔ کیوں نہ غم سے خشک ہو سبط پیمبرؐ کا لہو
۳۴۔ نیساں کی چشم گرم سرور میں تر نہ ہو
۳۵۔ مجرئی شہ نے کہا اے مری خواہر دیکھو
۳۶۔ سلامی کہتے تھے ظالم رلاؤ زینبؑ کو
۳۷۔ غیظ میں جب آ کے کھینچا شاہ نے تلوار کو
۳۸۔ مجرئی یہ تشنگی تھی سید ابرار کو
۳۹۔ بیت جنت میں ملے ظلم سلام ایسا ہو
۴۰۔ سلامی سجدۂ حق میں کیا مجروح حیدرؑ کو
۴۱۔ مجرائی کفن جو نہ ملا شاہ زمن کو
۴۲۔ لائی ہے بوستان رسولؐ خدا کی بو

۴۳۔ رضواں کے آگے حشر میں پڑھ کر سلام کو
۴۴۔ باب خیبر کھول دے دست خدا ایسا تو ہو
۴۵۔ محو ہیں قدسی حبیب ذوالجلال ایسا تو ہو

ردیف ھا۔

۴۶۔ سلامی کرتے تھے اکبرؑ خطاب آہستہ آہستہ
۴۷۔ گئے سوئے میداں جو اکبرؑ دوبارہ
۴۸۔ کیا حضرت عباسؑ تھے شیدائے سکینہؑ

ردیف یا۔

۴۹۔ بھرائی شہ کو نہ کیوں خلق خدا یاد کرے
۵۰۔ اے بھرائی شبیرؑ کو کیا یاد خدا تھی
۵۱۔ جس کے مدفن کی دوشہ پہ بنا ہوتی ہو
۵۲۔ بھرائی عرش ہے دو آقا کے سامنے
۵۳۔ بھرائی آیا محرم خون بہانا چاہیئے
۵۴۔ بھرائی قحط آب بھی تھا اور غذا نہ تھی
۵۵۔ گنہ کے مرض کی دوا چاہیئے
۵۶۔ پنجتن گر دارد بزم عزا ہو جائیں گے
۵۷۔ جو کہ مصروف سلام شہدا رہتا ہے
۵۸۔ بھرائی نسخۂ شفا کیا ہے
۵۹۔ بھرائی کہتی تھی صغرا یہ دوا لائی ہے
۶۰۔ بھرائی شہ کی لاش کو یاد خدا دہی
۶۱۔ سلامی ہر طرف شور بکا ہے
۶۲۔ کربلا میں جو سلامی شہ والا آئے
۶۳۔ بھرائی زر و سیم کی پروا نہیں رکھتے
۶۴۔ چشم تر یہ اشک بر ساتی رہی
۶۵۔ ہر اک چشم صرف بکا ہو گئی
۶۶۔ مری تسلیم ہے اس کو جو شیر حق کا پیارا ہو
۶۷۔ دل سے جو معتقد خاک شفا ہو جائے
۶۸۔ جس نے عزائے شاہ شہیداں بپا نہ کی
۶۹۔ بھرائی جا کر زیارت کو نہ آنا چاہیئے
۷۰۔ ہر اک ذرہ کب اے بھرائی حساب میں ہے
۷۱۔ اے بھرائی وہ بارگہ بوتراب ہے
۷۲۔ سلامی ذرہ نہ دوں آفتاب کے بدلے
۷۳۔ بزم ماتم میں جو با چشم پر آب آتا ہے
۷۴۔ کیونکر نہ بھرائی کو تنفر ہو آب سے
۷۵۔ نبیؐ کو بھرائی غم بے حساب ہوتا ہے
۷۶۔ بھرا اسے جو کہتی ہے عاشورگی شب ہے
۷۷۔ نکلے جو شیر ہبر و غابۂ تراب کے
۷۸۔ جس گھڑی گرمی بازار قیامت ہوگی
۷۹۔ بھرائی شاہ کی شہادت ہے
۸۰۔ بھرائی یاد حق ہے یاد علی
۸۱۔ حشر کو جو ہر ی اشک عزا دار ملے
۸۲۔ بھرائی کہتے تھے شہ خالق اکبرؑ کے لئے
۸۳۔ اے بھرائی فغان حرم عرش پہ گئی
۸۴۔ کینہ دل بھرائی سرور میں نہیں ہے
۸۵۔ سلامی شاہ کے غم میں جو اشک بار ہوئے
۸۶۔ سلامی ابر فلک کیوں نہ اشکبار رہے
۸۷۔ سلامی پیشوائے اوصیا اس طرح جیتا ہے
۸۸۔ بھرائی لہو کیوں نہ بہے دیدۂ تر سے
۸۹۔ بھرائی جہاں شہ کی تصویر نظر آئے
۹۰۔ ہو بھرائی نہ خواہش اکسیر وزر سے
۹۱۔ غضب ہے بھرائی مختار تھے جو کوثر کے
۹۲۔ اے بھرائی بتول عزائے پسر میں ہے
۹۳۔ ہے شاہ کے صدقے سے یہ توقیر ہماری
۹۴۔ سلامی جب کہ مجھ کو قتل سرور یاد آتا ہے
۹۵۔ اس کو بھرا کہ جو بیکس بھی ہے دلگیر بھی ہے
۹۶۔ اے بھرائی جو اشک مری چشم تر میں ہے
۹۷۔ برگشتہ سلامی کا مقصد تو نہیں ہے
۹۸۔ جگر چرخ سے جوں تیر گزر کرتا ہے

۹۹۔ گر رقم جلوۂ نور رخ سرور ہوئے
۱۰۰۔ رن میں اے بجرئی زینبؑ کے جو دلدار آئے
۱۰۱۔ پاؤں سجادؑ کا اے بجرئی زنجیر میں ہے
۱۰۲۔ سلامی سیر عجب [illegible] میں ہے
۱۰۳۔ بجرائی نہ کر ذکر [illegible] آ کے
۱۰۴۔ بجرئی جب چھوٹے اکبرؑ سے پسر کے ٹکڑے
۱۰۵۔ بجرئی جو ہوئی نہ کیوں شہ کے جگر کے ٹکڑے
۱۰۶۔ بجرئی دیکھ کے مجلس میں گہر بار مجھے
۱۰۷۔ کربلا میں مجھے لیجائے جو تقدیر مری
۱۰۸۔ بجرئی شہ نے کہا یوں حیدرؑ کرار سے
۱۰۹۔ بجرئی کہتے تھے سرور زینبؑ دلگیر سے
۱۱۰۔ بجرائی علمدار شاہ نے جب تیغ دوسر کی
۱۱۱۔ خواہش نہیں بجرائی ہمیں دولت و زر کی
۱۱۲۔ جس وقت سلامی نے مژہ اشکوں سے تر کی
۱۱۳۔ بجرئی شہ کو جو ہر شام و سحر یاد کرے
۱۱۴۔ ضیائے رخ شہ جو مسعود ہے
۱۱۵۔ بجرائی گر رسا مری تقدیر ہو گئی
۱۱۶۔ داغ غم حسینؑ سے دل لالہ زار ہو
۱۱۷۔ تازہ ہیں داغ غم مژہ اشکبار سے
۱۱۸۔ پڑھتے ہیں سب زیارت سرور کھڑے کھڑے
۱۱۹۔ جس کو الفت ہے سلامی حیدرؑ کرار کی
۱۲۰۔ بجرئی ہر چشم گوہر بار ہے
۱۲۱۔ جبکہ خیمے سے برآمد شہ ابرار ہوئے
۱۲۲۔ ہر دل ہے داغ ماتم شبیرؑ کے لئے
۱۲۳۔ بجرئی کیا ذات پاک حضرت شبیرؑ تھی
۱۲۴۔ تخت دارا نہ تاج قیصر دے
۱۲۵۔ بجرئی رن میں جو عباس دلاور آئے
۱۲۶۔ گرد روضۂ حسین سلامی سے دور ہے
۱۲۷۔ بجرئی اشک بہا سبط پیمبرؐ کے لئے
۱۲۸۔ گرد تھی بجرائی پیش حسن اکبر چاندنی
۱۲۹۔ بجرئی ہے سوگوار ماہ حیدر چاندنی
۱۳۰۔ وصف حضرت کے مہ عارض کا جو مسعود ہے
۱۳۱۔ سلامی رن میں جو سلطان بحر و بر آئے
۱۳۲۔ قتل شہ کو اے سلامی شام کے لشکر گئے
۱۳۳۔ بجرئی طالع خفتہ جو ہوں بیدار ابھی
۱۳۴۔ اے بجرئی نمود محرم صفر میں ہے

دفتر ماتم جلد ہژدہم حصۂ سوم مجموعہ سلام

صفحات ۱۸۲ تعداد سلام ۹۸

۱۔ خیمہ در شاہ پہ سر رہے
۲۔ بجرئی روئیں نہ کیوں کہ ہم گریباں چیر کے
۳۔ بجرئی خیمے سے جب حضرت شبیرؑ چلے
۴۔ اے بجرئی گردن سے جدائی ہوئی سر کی
۵۔ بجرئی رن میں جو صبح شب عاشور ہوئی
۶۔ کشتۂ غم ہو کہ حق میں ترے اکسیر یہ ہو
۷۔ بجرئی اشک بہا سبط پیمبرؐ کے لئے
۸۔ شفاعت جہاں اہل تقصیر کی ہے
۹۔ سلامی ذاکروں کو رتبۂ معراج حاصل ہے
۱۰۔ سلامی ماتم شبیرؑ میں جو آج بیکل ہے
۱۱۔ بجرائی بیچے ساقیٔ کوثر کے لال کے
۱۲۔ رمضان کیوں نہ سلامی کو محرم ہو جائے
۱۳۔ تعریف کی ہے نظم رواق امام کی
۱۴۔ پیر و شہ بے سر کا ازل سے جو قلم ہے
۱۵۔ بجرائی غلامی میں شہنشاہ امم کی
۱۶۔ مدح علیؑ میں ہے یہ بلندی کلام کی
۱۷۔ سلامی یہ امت کا کیسا ستم ہے
۱۸۔ سرداد و علمدار کا بجرائی کو غم ہے
۱۹۔ ہے مدح کربلا میں یہ رفعت کلام کی

۲۰۔ غم شاہ میں مجرئی ہم رہے
۲۱۔ صدمہ مجرائی عجب شاہ امم دیکھیں گے
۲۲۔ سلامی یہ رہ میں ستم ہو گئے
۲۳۔ داد دجو رزم گہہ میں شاہ امم ہوا ہے
۲۴۔ اک بیت جو سلام کی شہ کی رقم کرے
۲۵۔ گر مرقع میں شبیہ شہ ذیشان نکلے
۲۶۔ دل میں بہار داغ امام زمن رہے
۲۷۔ مجرئی شہ کی مصیبت جو بیاں ہوتی ہے
۲۸۔ پڑھوں سلام محبان پنجتن کے لئے
۲۹۔ السلام اے قبلۂ ایمان مرے
۳۰۔ سلامی ہر اک ذرہ مہر مبین ہے
۳۱۔ وصف گل زہرا میں ہیں رنگین سخن ایسے
۳۲۔ ٹکڑے اے مجرئی زہرا کا چمن ہوتا ہے
۳۳۔ فصل خزاں جو گلشن شاہ زمن میں ہے
۳۴۔ اس کو مجرا نہ جسے خوف تھا شمشیروں سے
۳۵۔ قتل شبیرؑ کے تھے مجرئی ساماں کتنے
۳۶۔ جسے اے سلامی غم پنجتن ہے
۳۷۔ سلامی یہ پُر درد اپنا سخن ہے
۳۸۔ بہشت بریں میں جو نہر لبن ہے
۳۹۔ اے مجرئی کیوں کر نہ جھڑیں پھول دہن سے
۴۰۔ رواق امام زمن دیکھئے
۴۱۔ موزوں وہ ثنائے گل زہرا میں سخن ہے
۴۲۔ کون قائل تھا سلامی کہ جناں اور بھی ہے
۴۳۔ مجرئی فخر ملک کیوں نہ وہ انسان ہوئے
۴۴۔ مجرئی گلچین قضا شبیرؑ کے گلشن میں ہے
۴۵۔ صفدر کو طلب اے شہ مردان نہیں کرتے
۴۶۔ مجرئی جب تلک مرے قالب میں جان رہے
۴۷۔ مضمون عزا کے دل میں ہیں پنہاں نئے نئے
۴۸۔ کیا گیا جو ان سپاہ امام زمن میں تھے

۴۹۔ اے مجرئی قیامت صغرا عیاں ہوئی
۵۰۔ لخت دل ہیں مجرئی نذر حسن کے واسطے
۵۱۔ یہ شب ضربت ہے چیٹو اے محبان علیؑ
۵۲۔ مضمون ہے گل سطر یہ طوبیٰ کا گماں ہے
۵۳۔ دیدۂ حیدرؑ پہ خم تیری جبیں ہے
۵۴۔ مجرئی سبط نبیؐ جبکہ چمن سے نکلے
۵۵۔ مجرئی مالک کوثر کو جو پانی نہ ملے
۵۶۔ سلامی دو پہر تک شہ کے لشکر کی صفائی ہے
۵۷۔ قتل شبیرؑ کی اے مجرئی تیاری ہے
۵۸۔ سلامی شاہ پہ شدت تھی یہ تشنہ دہانی کی
۵۹۔ دیدۂ پنجتن پہ رسائی ہوئی
۶۰۔ سلامی کو کیا بادشاہی ہوئی
۶۱۔ سلامی صدا اشکباری ہے
۶۲۔ خیمۂ شہ سے بلند اے مجرئی نالے ہوئے
۶۳۔ مجرئی [illegible] اشک بڑی ہوئے گی
۶۴۔ [illegible] مجرائی دو حیدرؑ پہ جانے سے

(ج) ط(۱۱) :۔

۶۵۔ شہ کے مجرے کی باد پائی ہے

(د) ط(۱۲) عرش پر لشکر کی رسائی ہے

۶۶۔ امتیاز نیک و بد کیا ہو قضا کے سامنے
۶۷۔ زبان دہن میں ہے شبیرؑ کی ثنا کے لئے
۶۸۔ عروج ہے جو دو شاہ کے گدا کے لئے
۶۹۔ دکھا دے روضۂ شبیرؑ ابکی سال مجھے
۷۰۔ حق نے دل تو کا بھرا مہر و وفا سے پہلے
۷۱۔ مجرئی [illegible] شہ کے سوا اور بھی ہے
۷۲۔ صاف [illegible] مجرئی [illegible] دریا سے پہلے
۷۳۔ نام شبیر کا لو سبق [illegible] سے پہلے
۷۴۔ تن کو لاغر دل کو صرف نوحہ خوانی کر دیا
۷۵۔ دلائے پنجتن ہے مجرئی اپنے مقدر میں

۷۶۔ یوں بھرائی ثواب ہے اشکِ عزا کے ساتھ
۷۷۔ خاکساری ہے سلامی کیمیا میرے لئے
۷۸۔ باغِ عالم میں بہارِ زندگانی دیکھ لی
۷۹۔ دم نہ نکلے بھرائی رونے میں اگر دم ٹوٹے
۸۰۔ بھرائی شورِ دشمن محبوں کے گھر میں ہے
۸۱۔ کیا بزم میں سرد ہے آفتابِ اشک

(س)

۸۲۔ ضیافت میں پیمبرؐ نے جو شرکت آپ کی چاہی
(ش) ۔۔ چرخِ چہارم پہ گئے جب شبِ معراجِ نبیؐ
(ج) ۔۔ رواق حسینی نے رفعت عطیا کی
(ف) ۔۔ سلامی عجب ذات ہے مرتضیٰ کی
۸۳۔ کیا ہم کو حق نے سخن آفریں
۸۴۔ جس کا سکون ہے سلامی روضۂ شبیرؑ ہے
۸۵۔ گیسوئے اکبرؑ سے سنبل موپریشاں ہی رہا
۸۶۔ دور کر دیتا ہے اک ذرہ سب آزاروں کو

۸۷۔ سوزاں ہو غمِ شہ میں جو داغ پر طاؤس
۸۸۔ کشتۂ غم ہو کہ حق میں ترے اکسیر یہ ہے
۸۹۔ جہاں میں کس کا مددگار بجز تراب نہ تھا
۹۰۔ زینت اس بزمِ عزا کی ہے عزاداروں سے
۹۱۔ چشم ترا جا نہ دکھلاتی رہی
۹۲۔ بھرائی رو رہا ہوں غم بوتراب میں
۹۳۔ بلوے میں اہلبیتؑ کے سر پر ردا نہیں
۹۴۔ غازۂ روحِ سخن وصفِ شہ غازی ہے
۹۵۔ (نائب ۹۴ کے بعد ۹۶ کا ہندسہ ہے)
۹۶۔ صورت ابر نہ ہم سوئے گلستاں جاتے
۹۷۔ نظم کی جو ہر جگہ پر دھوپ سونے کا ورق
۹۸۔ زہے اشکِ عزا کہ صاف گوہر ایسے ہوتے ہیں

(ف) (۹۷) سرِ داد و علمدار کا بھرائی کو غم ہے (۱۸) سلام (ج)
(ف) (۹۶) اکیسویں شب آئی ہے ماہِ صیام کی (۱۹) سلام مطلع دیگر
سے یہ درمیانی مطلع ہے۔

مرزا دبیر مرحوم

شبیرؑ کا عز و جاہ سبحان اللہ — غربت میں ہیں سب گواہ سبحان اللہ
حلقوم پہ شمشیر زباں پر تکبیر — سبحان اللہ واہ سبحان اللہ

نیزے پہ سرِ شہ سے تھی حشمت پیدا — تھا جلوۂ خورشید قیامت پیدا
نیزے پہ وہ سر تھا سب سروں کے آگے — تھی بعد فنا شانِ امامت پیدا

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

مرزا دبیر کا منفرد ادراک

میں نے اپنی کتاب "مرثیہ نگاری اور میر انیس" کے آخری باب میں مولانا شبلی کے موازنۂ انیس اور دبیر کا ذکر کرتے ہوئے اس بات پر خاص زور دیا ہے کہ میر انیس اور مرزا دبیر دونوں اول درجہ کے شاعر ہونے کی وجہ سے اس قدر منفرد اور مختلف ادراک رکھتے ہیں کہ دونوں کا موازنہ اس غرض سے کرنا کہ ایک کو بڑھایا جائے اور دوسرے کو گرایا جائے بہت بڑی غلط فہمی اور تنقیدی شعور کی بہت بڑی کمی ہے۔ میر انیس کے ادراک کا جائزہ لیتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ اُن کا ادراک اس قسم کا ہے جس کو رومانی یا قدرتی احساس Romantic Natural Sensibility کہا جا سکتا ہے جب کہ مرزا دبیر کا ادراک وہ ہے جسے مابعد الطبیعیاتی ادراک Metaphysical Sensibility کہنا چاہیئے۔ یہ دونوں ادراک اس قدر متضاد ہیں کہ ایک کو سچی شاعری اور دوسرے کو جھوٹی یا بناوٹی شاعری کہہ دینا آسان ہے اور یہ اُس وقت اور بھی زیادہ آسان ہو جاتا ہے جب کہ شبلی کی طرح کا نقاد رائے دینے بیٹھے جو حالی کے نظریۂ نیچرل شاعری سے گہرے طور پر متاثر ہو۔ اس معاملہ میں اصل غلطی یہ ہے کہ ہمارے نقاد دو منفرد ہستیوں اور اُن کے مختلف ادراک میں فرق کرنے سے قاصر ہیں اور پھر وہ تنقید کو ایک قسم کی گھوڑ دوڑ سمجھتے ہیں جس میں نقاد کا اہم ترین فرض یہ ہے کہ اپنے مرغوب شاعر کو مخالف سے بہتر اور برتر ثابت کرے۔ بعد غیرہ جذبہ تنقید اگر دو شاعروں کا موازنہ کرتی ہے تو یہ جاننے کے لئے کہ وہ کس حد تک ایک دوسرے سے اس قدر منفرد ہیں کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا اور دونوں کی مخصوص نفسیاتی ہستی کا جو ان کے مختلف فنون کی بنیاد ہوتی ہے نقشۂ تضاد سے صاف صاف سامنے آ جاتا ہے۔

میرا مقصد میر انیس کا مطالعہ تھا مگر چونکہ مرثیہ نگاری کے میدان میں مرزا دبیر اُن کے ہم پلہ رہے اس لئے مرزا دبیر کی شاعرانہ فطرت پر نظر ڈالنے سے میرے سامنے دونوں کی فطرت اور دونوں کا الگ الگ ادراک سامنے آ گیا۔ میں نے مرزا دبیر کے یہاں مابعد الطبیعیاتی ادراک کی جو عمل پایا اور جب بھی میرے سامنے کوئی دونوں کا موازنہ کرنے بیٹھ اور شبلی کی راہ جانے لگا یا کسی مبہم طریقہ پر شبلی کو رد کرنے لگا تو میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ دونوں شاعروں کی بڑائی اسی میں ہے کہ دونوں کے ادراک مختلف بلکہ متضاد ہیں۔

اب چونکہ میں مرزا دبیر کی طرف خاص طور سے متوجہ ہوں اس لئے اس امر کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مابعد الطبیعیاتی ادراک کیا ہے اور مرزا دبیر کس طرح اس کے

اہم مالک ہیں۔ شاعر کا ایک ادراک تو وہ ہوتا ہے جس کے بابت کہا گیا ہے کہ شاعری دل سے نکلتی ہے اور فوراً دل میں گھس جاتی ہے۔ اس کی تعریف میر انیس نے یوں کی ہے:

سامعین جلد سمجھ لیں جسے صنعت بو دبی

دوسرا ادراک یہ ہوتا ہے کہ شاعر کے دل کی نکلی ہوئی بات دماغ سے بھی نکلتی ہے اور پہلے سامع کے دماغ پر اثر کرتی ہے اور پھر دل میں اُترتی ہے۔ عموماً اُن شاعروں کا جو فطری شاعر ہونے کے علاوہ عالم بھی ہوتے ہیں ایسا ہی ادراک ہوتا ہے۔ مرزا دبیر مسلّم عالم تھے اور اُن کے ادراک کی مثال یہ شعر ہے:

فرعونِ شب سے معرکہ آرا تھا آفتاب
دن تھا کلیم اور ید بیضا تھا آفتاب

اس کے خلاف میر انیس کا یہ شعر دیکھئے:

تھا چرخِ اخضری پہ وہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

تو معلوم ہوتا ہے کہ مرزا دبیر کی تخیل بجائے اشیاء کے قدرتی عالم یعنی اُن کے رنگ کی طرف جانے کے تاریخی واقعات کی طرف جاتی ہے اور استعارے قدرت سے نہیں بلکہ کتابوں سے لاتی ہے۔ شب ان کے لئے محض سیاہ نہیں ہے بلکہ کالے ضمیر کے فرعون کی طرح ہے۔ سورج محض چمکدار اور رنگ کی چیز نہیں ہے بلکہ روشنی اور ید بیضا ہے اور دن محض روشنی کا وقت نہیں ہے بلکہ حضرت موسیٰ کی طرح تاریکی سے نبرد آزما ہے۔ سامع مرزا دبیر کے شعر سے اک دم متاثر نہیں ہو جاتا بلکہ پہلے فرعون، موسیٰ اور ید بیضا کے واقعہ کی طرف اس کا دماغ جاتا ہے اور پھر اس واقعہ کی اہمیت سمجھ کر دن کے نکلنے کا احساس کرتا ہے۔ یہاں محض حسیات اور تاثرات کا کھیل نہیں ہے بلکہ عقل بھی اس میں حصہ دار ہے۔ اسی طرز تخیل کو ڈاکٹر جانسن نے مابعد الطبیعاتی کہا تھا اور اسی کو آج ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ مابعد الطبیعاتی ادراک کہتا ہے۔ مرزا دبیر کے دور کے لوگ اس ادراک سے پوری طرح متاثر تھے۔ اُنھوں نے اسے "بلاغت" کا نام دیا تھا اور یہ رائے اب بھی اُس زمانے کا مذاق رکھنے والوں میں عام ہے کہ میر انیس کا کلام فصاحت ہے اور مرزا دبیر کا بلاغت ہے۔

مولانا شبلی کی اہم کوششوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ مرزا دبیر کے بابت اُن کے عصر کی اس اہم رائے کو رد کر دیں۔ وہ فرماتے ہیں: "انیس اور دبیر کے مقابلہ میں یہ فقرہ ضرب المثل ہو گیا ہے کہ میر صاحب کے کلام میں فصاحت زیادہ ہے اور مرزا صاحب کے کلام میں بلاغت۔ لیکن یہ فقرہ جس قدر زیادہ مشہور ہے اُسی قدر بلکہ اُس سے زیادہ غلط اور بے معنی ہے بلاغت کی جو تعریف تمام کتابوں میں مذکور ہے اور جس سے کسی کو کسی قسم کا اختلاف نہیں اس کی رُو سے بلاغت کی پہلی شرط یہ ہے کہ کلام فصیح ہو۔ اس لئے فصاحت و بلاغت کو باہم حریف قرار دینا اجتماع النقیضین ہے۔" مولانا شبلی عربی کے عالم ہیں اور فصاحت و بلاغت کو کچھ سے کہیں زیادہ سمجھتے ہیں۔ اُن کی یہ ثابت کرنے کی کوشش کہ مرزا دبیر کے یہاں فصاحت نہیں ہے تو بلاغت بھی نہیں ہے۔ قدیم تنقید یعنی اصطلاحوں کو مثالوں پر عائد کرنے کی مناسب مثال ہے مگر میں نے اس قدیم چکر میں پڑنے کے بجائے نفسیات کو تنقید کی بنیاد بنانا سیکھا ہے۔ یعنی میں دیکھتا ہوں کہ کسی شاعر کی تخیل کیسے کام کرتی ہے اور اس سے کیسی یعنی کس قسم کی گلکاریاں وجود میں آتی ہیں۔ مولانا شبلی جن مثالوں کو مرزا دبیر کے میر انیس سے مقابلے میں نقص واضح کرنے کے سلسلے میں پیش کرتے ہیں وہی میرے لئے مرزا دبیر کے مخصوص ادراک کی مثالیں ہیں۔ مثلاً میر انیس و دبیر کی بہت مشہور مثال یہ ہے کہ حضرت عنبر کے نام لانے والے سے امام علیہ السلام نے جو کچھ فرمایا اُس کے بابت میر انیس کہتے ہیں:

یہ تو نہیں کہا کہ شہ مشرقین ہوں
مولانا نے سر جھکا کے کہا میں حسینؑ ہوں

مولانا شبلی اسے موقع کی حالت سے مناسب بتاتے ہوئے کہتے ہیں "اس موقع پر یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ اس واقعہ کو مرزا دبیر صاحب نے اس طرح باندھا ہے:

"فرمایا: "میں حسین علیہ السلام ہوں"

میر انیس اور مرزا دبیر کے موازنے پر جو بحث ہے اس کے فیصلے کے لئے دونوں کے صرف یہ دو دو مصرعے کافی ہیں۔ مجھے مولانا کی یہ مثال ناکافی ہی نہیں بلکہ کم فہمی اور طرفداری پر مبنی نظر آتی ہے۔ تاریخی حیثیت سے یہ نہیں معلوم کہ امام علیہ السلام نے کیا فرمایا تھا۔ دونوں شاعر اپنا قیاس لگا رہے ہیں۔ میر انیس کے تصور میں امام انکسار سے کام لے رہے ہیں۔ مرزا دبیر کا تصور امام کی شان کی طرف ہے۔ دونوں اپنے حساب حالت اور موقع کے مناسب بات رقم کر رہے ہیں۔ فرق یہ نہیں ہے کہ ایک کی بات نفسیات کے مطابق ہے اور دوسرے کی اس کے خلاف ہے۔ فرق دونوں کے تخیل عمل کا ہے ورنہ دونوں بالکل مناسب بات ہی کہہ رہے ہیں۔ ہم کو یہ ضرورت نہیں محسوس ہوتی کہ مولانا سے اتفاق کریں۔ ہمارا دھیان مرزا دبیر کے ہمعصروں کی طرف جاتا ہے جو بلاغت کی مولانا کی طرح بال کی کھال نکالنے سے ضرور قاصر تھے مگر میر انیس اور مرزا دبیر کے کلام کے فرق کا جس ضرور مولانا سے زیادہ رکھتے تھے اور کیونکہ انھیں دونوں شاعروں سے ہمدردی تھی اس لئے ایک کو بڑھا کر دوسرے کو گھٹانے کا جواز نہیں ڈھونڈتے تھے۔ مرزا صاحب کے کلام کو بلاغت کہنا اور میر صاحب کے کلام کو فصاحت کہنا صحیح ہے یا غلط ہمیں اس سے سروکار نہیں ہے۔ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ دونوں کے کلام صاف مختلف ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ مخصوص اثر رکھتے ہیں جو ہر معنی میں شاعرانہ اور تخیلی ہے اس لئے ہم دونوں کو مختلف ادراک رکھنے والا مانتے ہیں اور دونوں کو آمنے سامنے کرنا سعی لاحاصل سمجھتے ہیں۔

شاعرانہ ادراک مواد کی تشکیل سے زیادہ طرز ادا کا کھیل ہے اور مرزا دبیر کا ادراک وہ مخصوص تصورات رکھتے ہیں سامنے لاتا ہے جو اپنی صفت یا سرچشمہ میں بالکل اُن کی چیز ہیں یعنی اُن کی انفرادیت کا صاف صاف پتہ دیتے ہیں۔ مرثیوں میں تخیل کے لئے سب سے مناسب میدان گھوڑے اور تلوار کی تعریف میں آتا ہے۔ مولانا شبلی اس سلسلے میں فرماتے ہیں "مرثیہ گویوں کا سب سے بڑا موضوع شاعری یہی ہے اور مرزا دبیر تو اس عالم میں لامکان تک پہنچ جاتے ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ سب کچھ کہتے ہیں اور غور سے دیکھئے تو تلوار کے متعلق کچھ نہیں کہتے چنانچہ فرماتے ہیں:

جنگہ چشم نیام اوج پر آیا
اور صاف ہر اک فرد بشر کو نظر آیا
خط کھینچنے کو کلک ذوالفقار آیا
یا دوڑ کے ظلمت کے گلی سے خضر آیا!

ظلمات میں یہ فتح پہ قبضہ کئے پھری
یونس کو جیسے بطن میں ماہی لئے پھری

ذات ایک طرف مٹا دیا میں نے صفات کو
کیسی زبان، زبان میں یہ کاٹ آئی بات کو

اس قسم کی مثالوں کے بعد مولانا فرماتے ہیں: "انصاف کرو یہ تلوار کی تعریف ہے یا ہوائی طلسمات!" "ہوائی طلسمات!" جی ہاں ہم مانتے ہیں کہ ہوائی طلسمات ہے مگر پوچھتے ہیں کہ اس میں کیا قباحت ہے؟ کیا شاعری کو حقیقت ہی ہونا چاہیئے ہوائی طلسمات نہیں؟ شاعرانہ نظر کا نفسیاتی مطالعہ یہ امر واضح کرتا ہے کہ قوت تخیل حقیقت اور مجاز کو ملا کر نئی نئی

عورتیں ڈھالتی رہتی ہے اور یہ کہ عورتیں زور دار انفرادیت والے شاعروں کے بیان سے ایسی منفرد ہو جاتی ہیں۔ ان سے شاعر اصناف صنف پہچانا جا سکتا ہے۔ یہی بات بڑے شاعر کو معمولی شاعروں سے ممتاز کرتی ہے۔ بڑے شاعر کے تصورات امیجز کا ایک الگ اور اچھوتا عالم ہوتا ہے جس کو کسی عام نظریہ سے پرکھنا غلط ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ Type of imagery کی بنا پر منفرد ادراک کے شاعروں کو قسموں میں بانٹ دیا جائے۔ دنیا کی شاعری میں زیادہ تر دو قسم کے ادراک نظر آتے ہیں۔ انگریزی شاعری کی مثال لے کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک قسم کے شاعر اسپنسر کی طرح ہوتے ہیں جن کے ادراک میں ایک خاص ڈھنگ، حقیقت سے خاص آہنگ اور فنی روایت سے خاص سمجھوتا ہوتا ہے۔ اُن کی شاعری مولانا حالی کے نظریۂ نیچرل شاعری پر پوری اترتی ہے۔ دوسرے قسم کے شاعر ڈون کی طرح کے ہوتے ہیں جن کے ادراک میں ایسے ڈھنگا پن، حقیقت سے دوری اور فنی روایت سے خاص بغاوت یہاں تک کہ بیان بدیع اور عروض کے مانے ہوئے اصولوں کو توڑنے کا رجحان ملتا ہے۔ اُردو کے شاعر بھی ان دو قسموں میں رکھے جا سکتے ہیں۔ میر، میر حسن اور میر انیس پہلی قسم میں ہیں جب کہ سودا اور مرزا دبیر دوسری قسم میں آتے ہیں۔ سودا نے اس ادراک کی داغ بیل ہی ڈالی ہے جو مرزا دبیر کے یہاں پورے طور پر بار آور ہوتا ہے ہوائی طلسمات بنانا یعنی Fantasy پر ٹیک لینا دور دراز کی تشبیہات اور استعارات لانا۔ باریک بینی اور مشکل پسندی میں گم ہو جانا، تلمیحات کو اپنی مرضی کے مطابق توڑنا اور مروڑنا، ثقیل اور غریب الفاظ سے پرہیز نہ کرنا بلکہ اُن کو اپنے خاص مقصد کے ماتحت اپنے کلام میں جگہ دینا، الفاظ میں عام مضمون سے الگ لے جا کر استعمال کرنا، مصرعوں اور بندوں میں اس حد تک تصرف کرنا کہ کلام موزوں بھی نہ معلوم ہو، یہ سب باتیں جو پہلے قسم کے شاعروں کے نزدیک اغلاط ہیں دوسرے قسم کے شاعروں کے ادراک کا طرۂ امتیاز ہیں۔ مولانا شبلی نے ان سب باتوں کا ذکر کیا ہے اور مثالوں پر مثالیں دی ہیں مگر ستم یہ ہے کہ وہ روایت کے محض ایک رجحان پر پلے ہونے کی وجہ سے اور اس قسم کی روایت کے اثمکتان سے در آمد کو سب کچھ سمجھ کر ان باتوں کو اغلاط ہی گننے پر مصر ہیں اور ان پر خوب خوب مُنھ بناتے ہیں۔ مولانا شبلی کی تنقید بصیرت افروز نہیں ہے بلکہ ایک محدود نظریہ سے چمٹ کر اس سے چھڑائے نہ چھوٹنے کی مثال ہے۔

بیسویں صدی میں تنقید کو بڑی وسعت حاصل ہو گئی ہے اور منفرد شاعروں کے نفسیاتی مطالعہ نے اسے بڑی گہرائی اور گیرائی دے دی ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ جو شاعری انیسویں صدی میں شاعری کہی جاتی تھی وہ بھی ایک قسم کی شاعری ہے، جس کو وہ لوگ شاعری نہیں کہتے تھے وہ دوسرے قسم کی شاعری ہے۔ مرزا دبیر کی شاعری اپنی الگ اہمیت رکھتی ہے۔ یہ ایک مخصوص ادراک کا جسے ہم مابعد الطبیعاتی ادراک کہتے ہیں کمال ہے۔ اُن کے کلام میں اس کے شاہکار موجود ہیں وہ مرثیہ جس کا پہلا بند یہ ہے اس ادراک کے استقلال اور پختگی کی مثال ہے ؎

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخِ کہن کانپ رہا ہے
رستم کا جگر زیرِ کفن کانپ رہا ہے
خود عرشِ خدا نہ زمن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے حیدر کے پسر کو
جبریل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

مولانا شبلی کے تتبع میں ہمارے محاسبین ادب اس مرثیہ میں بھی قدم قدم پر نقائص نکالتے ہیں مگر یہ نہ صرف اُن کی نکتہ چینی سے بالاتر ہے بلکہ ہر محدود تنقیدی نظریہ

کو توڑتا ہوا اپنے مخصوص ادراک کا سکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جما دیتا ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی رائے ہے کہ اس صدی میں زندگی بڑی پیچیدہ، پہلو دار اور مبہم ہو گئی ہے اور اسے شاعری میں ادا کرنے کے لئے ایسے ادراک کی ضرورت ہے۔ جو بیک وقت مختلف سطحیں رکھتا ہو اور ان سب سطحوں کو ملا کر ایک متحد اثر قائم کرنے کا اہل ہو۔ جس مرثیہ کا میں نے اوپر ایک جزو اقتباس کیا ہے۔ وہ ہر طرح پر اس ادراک کا مظاہرہ کرتا ہے اس لئے اگر میں یہ کہوں کہ جدید دور کے شاعروں کے لئے جو شاعری کو اپنے دور کی سچی ترجمانی بنانا چاہتے ہیں مرزا دبیر کی شاعری اور اقسام کی شاعری سے زیادہ مشعل راہ ہو سکتی ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ آج کا شاعر اپنی روایت کے دوسرے شاعروں کو پس پشت ڈال کر مرزا دبیر ہی کا ہو رہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اُسے جو دشواریاں پیش آ رہی ہیں وہ مرزا دبیر کے مطالعہ سے حل ہو سکتی ہیں۔ بیسویں صدی مرزا دبیر کو ہم استاد منوانے کی طرف رجوع ہے۔ مرزا دبیر اپنی شاعری کے بابت فرماتے ہیں:۔

خامہ ہے فروتن مرا افراطِ ادب سے
جھک کر شرفا اور نجبا ملتے ہیں سب سے
نخوت کے معنی ہیں الگ لفظوں کے لب سے
جس طرح سے بد اصل جدا نیک نسب سے
دشمن سے بھی ہم قطع نہیں کرتے حیا کو
مانند غبار اٹھتے ہیں تعظیم ہوا کو

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے ادراک میں ہر قسم کا تجربہ جذب کرنے کی گنجائش ہے۔ وہ انکساری کے ساتھ پستی، سنجیدگی کے ساتھ طنز، علم کی صحت کے ساتھ توہم کا طلسم، ترنم کے ساتھ بے رنگی ملا کر ایک شاہکار مرکب بنانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے اور اسی لئے جدید دور کا نمائندہ ادراک کہلانے کے قابل ہے۔ وہ ہر قسم کی لغزشوں کو بھی اوصاف میں تبدیل کر لیتا ہے۔ اور اسی طرح ایک نئے فن کا پیغامبر ہو جاتا ہے۔ آج مرزا دبیر کی صد سالہ برسی کے موقع پر ہمارا ان کو سب سے بڑا خراج عقیدت یہ ہوگا کہ ہم اُن کے ادراک کی اہمیت کا اعتراف کر لیں۔ یہ سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کریں کہ اول درجے کے شاعر کی طرح اُن کا بھی ایک منفرد اور مخصوص ادراک ہے۔ دور حاضر کو اس کی اشد ضرورت ہے اور شاعروں کی شعوری کوشش یہ ہونا چاہئے کہ اپنا اہم ترین وقت مرزا دبیر کے مطالعہ کو دیں اور اس سے ہدایت حاصل کریں۔ اردو شاعری جو پستی میں گر گئی ہے اُسے ایک نئی زندگی بخشیں۔

(بشکریہ ماہنامہ کراچی دبیر نمبر)

خار و گل و بوستان و صحرا دیکھے
نیرنگ شب و روز کے کیا کیا دیکھے
اب قبر حسینؑ چل کے تو دیکھ دبیر
دنیا دیکھی اور اہل دنیا دیکھے

جو روضۂ شان کربلا تک پہنچا
معراج ہوئی عرش علیٰ تک پہنچا
کیا قرب ہے اللہ کا اللہ اللہ
پہنچا جو حسینؑ تک خدا تک پہنچا

(مرزا دبیر)

مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی

نوادرِ مرزا دبیر

۱۹۵۲ء کی بات ہوگی۔ محرم کا مہینہ تھا۔ جھنگ کی ایک مجلس میں کسی صاحب نے میر صاحب کے مرثیہ کے چند بند پڑھے اور بار بار کہا۔ "مرزا صاحب فرماتے ہیں"۔ بند تھا ؎

"ح" سے ہے اشارہ کہ یہ ہے حامیِ اُمت
سمجھیں گے اسی "سین" کو سب سینِ سعادت
"ی" اُس کی بزرگی میں ہے "یٰسین" کی آیت
ہے "ن" سے ظاہر کہ یہ ہے نورِ نبوت
ناجی ہے وہ اس نام کو لے گا جو دہن سے
یہ حُسن میں دس حصے زیادہ ہے حسن سے

(منتخب مراثی انیس ص۳۸۔ مجلس ترقی ادب لاہور)

مرثیہ ہے: "یارب چمنِ نظم کو گلزار ارم کر"

میں نے اُن سے کہا کہ یہ بند میر انیس صاحب کے ہیں۔ مرزا دبیر کے نہیں۔ وہ بزرگ غالباً انیس و دبیر کے کلام میں امتیاز نہیں کر سکتے تھے۔ بہرحال یہ بات واضح تھی کہ جھنگ میں مرزا دبیر کا کلام بھی مقبول رہا ہوگا اور مجالس میں پڑھا جاتا رہا ہوگا۔ بعد میں میں نے کئی آدمیوں سے پوچھا کہ صاحب یہ جھنگ میں مرزا صاحب کی شہرت و مقبولیت کا سبب کیا ہے؟ مگر کوئی جواب نہ ملا۔

ملتان گیا، وہاں بھی مرزا صاحب کا نام اور کلام زبان زدِ خاص و عام تھا۔ بلکہ ایک ملتانی مرثیہ گو کا لقب "دبیرِ پنجاب" سُن کر حیرت ہوئی مگر اس شہرت کا راز نہ کھل سکا۔ اتفاقاً ایک محترم دوست چودھری منظور حسین صاحب نے اپنے والد بزرگوار سے ملاقات کی دعوت دی موصوف بزرگ و معمر مرثیہ گو شاعر ہیں۔ بات میں بات نکلتی آئی۔ میں نے پوچھا: "چودھری صاحب دبیر کا کلام تو لکھنؤ میں لوگ سمجھنے سے قاصر تھے، پنجاب میں اتنی سخت اُردو کیسے مقبول ہوئی اور دبیر کی شہرت کیسے پہنچی؟ فرمایا: "ریاست کپورتھلہ میں ایک قصبہ کا حال مجھے معلوم ہے، ہمارے تلونڈی چودھریاں میں نواب قادر بخش مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں کپورتھلے کے سفیر لاہور تھے جہاں وہ ارطوجاہ سے ملے تھے۔ پھر ۱۸۵۷ء میں ریاست کی طرف سے لکھنؤ کے اطراف میں ایک فوج بھیجی گئی جس کے افسر سلطان علی خاں تھے۔ یہ صاحب انگریزوں کی فتح کے بعد جاگیردار ہو گئے تھے۔ سلطان علی خاں لکھنؤ میں رہے اور مرزا صاحب کے خاص دوستوں میں شمار ہوئے۔ کہتے ہیں کہ مرزا صاحب نے ایک مرثیے میں اُن کی تعریف میں کچھ بند بھی لکھے تھے۔ سلطان علی خاں نے تلونڈی چودھریاں میں لکھنؤ کے طرز پر عزاخانہ بنوایا۔ اس امامباڑے کی مجلسوں میں مرزا دبیر کا کلام پڑھا جاتا تھا۔"

کچھ اسی طرح کی حکایات سید کسرال کے حضرات سے سُننے میں آئیں۔

بات یہ ہے کہ مرزا دبیر لکھنؤ کے مرثیہ گویوں میں آخری مرثیہ گو تھے جو دربار اودھ اور شہزادگان لکھنؤ میں محترم سمجھے جاتے تھے۔ میر ضمیر اور میر خلیق کے بعد اُن کا کوئی برابر کا حریف نہ تھا۔ یوں تو لوگوں نے بہت کوشش کی کہ میاں دلگیر کا حریف بنائیں حتیٰ کہ بعض لوگوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ "دلگیر کے شاگرد ہیں" مگر مرزا صاحب نے بڑی بُردباری سے اس طوفان کو ٹال دیا۔ مرزا صاحب کی شاعری عربی، فارسی تراکیب اور معانی و بیان کے محاسن لفظی و معنوی سے آراستہ پیراستہ ہوتی تھی، یہ بات علماء کے ذوق کی تھی لہٰذا شہر کا دوسرا معزز طبقہ بھی ان کی استادی کا قائل اور قابلیت کا معترف تھا۔ اخلاق اور دین داری، سخاوت اور بردباری نے عوام کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ ادبی حلقوں میں ان کی نثر نگاری (دیکھئے ان کا مضمون "آداب [illegible] پر تکلف لہجہ [illegible] تھا [illegible] کے حریف مانے جاتے تھے۔ اسی وجہ سے جب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب میں ان کا نام داخلِ فہرست کیا۔ دہلی میں مرزا غالب اُن کا لوہا مانتے اور مرثیہ گوئی میں منفرد جانتے تھے۔

نواب محمد عباس علی خاں محمد نے قطعۂ تاریخ "دبیر ماتم" میں دبیر کو ان لفظوں سے یاد کیا ہے، درحقیقت اس میں مبالغہ نہیں ہے۔

مرثیہ گوئے شہیدانِ جفا، زینتِ بزم
مدح خوانِ نبی و ذاکرِ آلِ امجاد
صاحبِ درع و سخا، متقی و شب بیدار
مجمعِ خلق و کرم عابد و فیاضِ وجواد
رشکِ خاقانی و فردوسی و سعدی و کلیم
ہمسرِ بوذر و سلمان و ادیس و مقداد

مرزا دبیر ایک دبستان کے بانی تھے، جس کا مقصد اُردو زبان کو عربی فارسی لغات سے مالا مال کرنا تھا۔ وہ شعر و ادب میں ہندی زبان و تہذیب کی چھاپ کا سایہ پسند نہیں کرتے تھے۔ اسلامی ثقافت، ثقہ زبان اور علمی اسلوب کی اشاعت اُن کا نصب العین تھا۔ ہمارے عہد میں اس کی مثال ابوالکلام آزاد کی نثر ہے۔ ہم نے آزاد کی نثر کے شیفتہ و فریفتہ حضرات کو دیکھا ہے۔ اُن کے مقابلے میں وہ لوگ بھی دیکھے جو ابوالکلام آزاد کو انتہا پسند مشکل نویس سمجھتے ہیں۔ علوم اسلامیہ کا ذوق رکھنے والے حضرات عربی فارسی سے غیر معمولی دلچسپی رکھتے تھے۔ ثقیل زبان کو علمی زبان سمجھتے۔ انگریزوں کی پسندیدہ فورٹ ولیم کالج والی نثر کو دوسرے درجے کی زبان۔ دبیر خاقانی و بدر چاچ، منشی مہدی اور ظہوری و نعمت خان عالی کے طرز کا احیاء چاہتے تھے۔ اودھ کی حکومت کے [illegible] اس قسم [illegible] کے عوامل [illegible] ثقافتی عوامل نے [illegible] کو [illegible] اُن کی شہرت لکھنؤ سے دکن اور کشمیر، بنگال اور سندھ تک پہنچی اور اس وزن و آہنگ میں مدتوں وہ منفرد رہے۔ آخری پچیس تیس برس میں اُن کے حریف میر انیس نے سخت مقابلے کئے اور آہستہ آہستہ وہ بھی برابر کے اعزاز حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

مرزا صاحب کے سوانح اور فن پر میں لکھ چکا ہوں، اس مضمون میں صرف ان آثار کا تذکرہ کرنا ہے، جن سے مرزا صاحب کی شخصیت اور فن کے بارے میں کچھ نئی روشنیاں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اس سلسلے میں "اودھ" اخبار لکھنؤ کی اشاعت ۱۰ مارچ ۱۸۷۵ء کی خبر ہے:

جناب دبیر کی وفات
ہیہات، ہیہات، ہیہات
"افسوس، افسوس، افسوس کہ قیامت آ گئی"

حیف خیف، صد ہزار حیف کہ تعلیم سخن
اُٹھ گئی، آفتاب کمال غروب ہو گیا، مرثیہ گوئی
کا خاتمہ بالخیر ہوا یعنی جناب افصح الفصحاء،
ابلغ البلغاء، سحبان زماں، طوطی ہندوستان،
شاعر بے نظیر جناب مرزا دبیر نے وقف انزوئے
انیس ہو کر شمع ساں اپنے جسم ناتواں کو گھلا
دیا اور آخر چند روز بے آب و دانہ رہ کر
امراض ورم کبد وغیرہ میں اس عندلیب معانی
نے گلزار قدس کا رستہ لیا۔ انا للہ وانا الیہ
راجعون۔"

اس واقعۂ حسرت ناک سے تمام لکھنؤ میں
کہرام مچا ہے، ہر کہ و مہ کی جان پردہ سخت
صدمہ ہے کہ جس کا بیان اندوہ قلم سے
رقم نہیں ہو سکتا۔ واضح ہو کہ سنگل کی آخر
شب یعنی ۲۹ محرم ۱۲۹۲ھ کو یہ حادثہ
واقع ہوا۔"

پھر اس اخبار کی اشاعت ۱۴ مارچ ۱۸۷۵ء صفحہ ۳۵۱
پر ہے۔

لکھنؤ۔ مختصر سوانح عمری حضرت دبیر مغفور

"جناب مرزا سلامت علی صاحب
متخلص بہ دبیر فن مرثیہ گوئی میں بے مثل
اور لاجواب تھے۔ ہندوستان میں آفتاب
تھے۔ سوا اس کے عابد شب زندہ دار تھے
اور عالم روزگار تھے۔ پندرہ سولہ برس کا
سن تھا کہ شوق ماثوق سلام اور مرثیہ گوئی
کا ہوا اور اصلاح سلام وغیرہ پر میاں دلگیر
شاعر بے نظیر سے لی۔ بعد ازاں مرثیہ گوئی
وغیرہ میں نام عالی پیدا کیا اور سب پھولے
نہ سماتے تھے۔ سوا ان کے کسی کو دل لگا کر نہ
بناتے تھے۔ رفتہ رفتہ ایسا نام پیدا کیا کہ سرکار
میں پہنچے۔ نواب اصغر علی خاں جنت
آشیاں، علیین مکان، والد ماجد نواب
ممتاز الدولہ بہادر کے ملازم ہوئے اور یہی
وجہ اور قدامت ہے کہ نواب ممتاز الدولہ
بہادر آج تک مانتے اور اپنا ملازم قدیم
جانتے تھے۔ بوجہ قدامت و مداحی جناب
سید الشہداء علیہ الآف والتحیات تعظیم
فرماتے تھے اور اپنے برابر بٹھاتے تھے اور
بھی سرکاروں میں اُن کی عظمت و رفعت
ہونے لگی اور مہاراجا جیسوہ رام اور کنبوہ
بادشاہ شکوہ اُن کو بہت جانتے تھے اور
بدل و جان مانتے تھے۔ بادشاہان رفیع
المکان سنیع الشان اودھ نے ان کی نہایت
قدر دانی کی نصیر الدین حیدر بادشاہ سے
تا حضرت واجد علی شاہ بادشاہ سب نے
مہربانی کی۔ چنانچہ جب بارہ سو اکانوے
ہجری میں مرزا صاحب کلکتہ تشریف لے
گئے، واجد علی شاہ بادشاہ کی خدمت
میں عرضداشت بھیجی اور یہ شعر بادشاہ
نے دستخط فرمایا:۔

گر بر سر و چشم من بیائی
بر قلب نہم کہ کیمیائی

جناب مرزا صاحب پہنچے جس مکان میں تھے
اُس کے دوسرے درجے تک حضرات واجد علی
شاہ آکے اور پیشوائی کر کے لے گئے اور اس
قدر تعظیم و تکریم فرمائی جیسے کوئی برابر والے
کی عزت اور توقیر کرتا ہے اور اپنے مرثیہ

میں شاہ اودھ نے بہت سے بنا اُن کی
تعریف اور تصیف میں پڑھے۔ چنانچہ
یہ مصرعہ ارشاد حضرت سے ہے۔
ع: میں بچپنے سے عاشق نظم دبیر ہوں
اُس وقت مرزا صاحب مغفور نے کھڑے
ہو کر یہ مصرعہ پڑھا ؎
تعظیم کلام کو دبیر اٹھا ہے
شاہ اودھ نے فرمایا آپ بیٹھ جائیں
اور بعد خاطر داری بے شمار و عزت افزائی
ہزار پانچ سو روپے بطور دعوت عطا فرمائے
اور مثل سال گزشتہ امسال بھی عظیم آباد
سے مرزا صاحب نے عرضی بھیج دی تھی۔
چنانچہ پانچ سو روپے جناب مرزا صاحب
مغفور زیب درگہ عطا فرمائے۔
بہتر سال کا سن تھا، طاقت جواب
دے چکی تھی، امسال عظیم آباد میں تشریف
لے گئے اور نویں تاریخ شائقین و سامعین
بہت جمع تھے۔ مرثیہ طولانی بہت زور شور
سے پڑھا۔ اس وقت سے اختلاج قلب
شروع ہوا۔ ریل پر اپنے گھر آئے، دس دن
تک نہایت علیل رہے ۲۹ محرم کو کہ
عاشق حسینؑ تھے اس دار فانی سے کوچ
فرما کر رونق افزائے دار البقا ہوئے۔
گروہ مومنین و مسلمین خواص و عوام
جنازہ کے ہمراہ تھا، گریہ و بکا سے سب
کا حال تباہ تھا۔ جمعرات کو بتاریخ دوم
صفر سوم ہوا۔ نواب ممتاز الدولہ بہادر
نے شریک سوم ہو کر عزت افزائی فرمائی
جناب مرزا اوج صاحب پسر مرزا صاحب
نے قریب دس بارہ رباعیوں کے حسب حال
اپنے اور وفات پدر بزرگوار پڑھیں جس کا
سماعت کرنا اہل مجلس کو دشوار تھا اور ہر
ایک بشر گریہ و زاری سے بے قرار تھا۔ کہرام
پڑ گیا۔ عجائب مضامین عالی تھے گویا مرزا
دبیر مرحوم پڑھ رہے تھے۔ تمام شہر کو اُن
کی مرثیہ گوئی میں جو کہ شبہ تھا دفع اور رفع
ہو گیا۔ ہر شخص اُن کے پڑھنے کی تعریف کرنے
والا اور مداح تھا اور ہر صغیر و کبیر کی زبان
صدق بیان پر یہ کلمۂ حق جاری تھا کہ الولد
سر لابیہ۔ مرزا صاحب کو یاد کر کے ہر
شخص رونے لگا۔ کہرام پڑ گیا۔ رنج سے حشر
بپا ہوا۔ نواب ممتاز الدولہ بہادر نے مرزا
محمد جعفر صاحب متخلص بہ اوج کو گلے لگا لیا
اور کل طلب فرمایا ہے۔ یقین صادق ہے کہ
خلعت عطا فرمائیں گے مگر مضامین رباعیات
سے پایا جاتا ہے کہ یہ مرزا صاحب مغفور کا
نام روشن کریں گے کہ اچھوں کے اچھے ہوتے
ہیں اور جناب مرزا صاحب، کچھ فقط
لکھنؤ میں نامور نہ تھے۔ حیدرآباد، عظیم آباد،
سندھ بلکہ تمامی ہندوستان میں حتیٰ کہ کربلائے
معلیٰ تک مشہور تھے۔ اُن کے نام نامی کو
گویا عالمگیر کہنا چاہیئے۔ خاک اس گردش
دوراں پر کہ اس کی گردش سے ایسا کامل پردۂ
خاک میں مل جائے مگر سوائے صبر کے کیا
چارہ ہے۔ اب خدا سے یہی دعا ہے کہ خدا
مرزا اوج کو سلامت رکھے کہ تسکین بخش
دہائے رنجور ہیں، یادگار جناب مرحوم
و مغفور ہیں۔ آئندہ جو سنا جائے گا۔ لکھا

جائے گا۔" (تقریباً دو کالم)

۱۷ مارچ کے شمارے میں یہ عبارت شائع کی گئی ہے:۔

"مطبوعہ (کذا) مارچ میں مختصر سوانح عمری حضرت دبیر صاحب مغفور کے لکھے گئے تھے اس میں ایک غلطی ہو گئی ہے کہ بجائے ضمیر کے مرزا صاحب کو شاگرد میاں دلگیر کا لکھا ہے اور کچھ حال اور باقی رہ گیا تھا وہ یہ ہے کہ مرزا صاحب کو ایک بڑا آنسل سرکار ملکہ زمانیہ اور نواب سلطان عالیہ دختر نواب ملکہ زمانیہ سے بھی تھا۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں روپے کا سلوک انھیں دو سرکاروں نے کیا تھا اور آج تک نواب ممتاز الدولہ بہادر سلوک فرماتے ہیں۔

جب مرزا صاحب کے انتقال کا وقت آیا پانچ بجے صبح کو نماز بھی پڑھی اور حال ابتر ہونے لگا اس وقت میاں اوج نے کہ فرزند مرزا صاحب کے ہیں پوچھا کہ "مجھ کو کس کے سپرد کیا؟" فرمایا "تمھیں خدا کو سونپا" اور انتقال کیا انا للہ وانا الیہ راجعون ازبس کہ بروز سوم حال طبیعت داری میاں اوج صاحب کا بخوبی سب کو دریافت ہو گیا کہ اکثر رباعیات تصنیف فرما کر پڑھیں، اب وہ رباعیاں بھی واسطے ملاحظہ ناظرین سخن فہم کے درج اخبار کرتے ہیں:۔

اس کے بعد مرزا اوج کی رباعیاں اور کچھ قطعات تاریخ ہیں۔ میں نے بہاولپور کی اسٹیٹ لائبریری سے مندرجہ بالا مضمون تو پورا نقل کر لیا تھا۔ رباعیات و قطعات کے نوٹ یہ ہیں۔

رباعی اوج

افسوس، بلیغ نکتہ پرور نہ رہا
وہ قدر شناس اہل جوہر نہ رہا
روشن ہے کلام کی بقا سے اے اوج
آئینہ رہا مگر سکندر نہ رہا

اور سید ہدایت الٰہ ہدا کے قطعۂ تاریخ کا آخری شعر ہے:۔

سال تاریخش چو جستم از فلک آمد ندا
سدرہ بے روح القدس بیند دبیر بے دبیر

منشی محمد مرزا جان محمود کے قطعہ کا مصرعہ تاریخ ہے

"غم انیس میں ہے ہے" "یا دبیر کا غم"
۱۲۹۱ھ ۱۲۹۲ھ

بڑی اطلاع تک کے تمام اخبارات نے اپنے طور پر خلاصہ کر کے لکھی اور ان خبروں کے حوالے سے "گارسیں تاسی" نے اپنے لکچر ۱۸۷۵ء میں کچھ تفصیل لکھی ہے جس سے یورپ کے علم دوست افراد کو اطلاع ہوئی۔ گارسیں تاسی کہتے ہیں "دبیر کی شہرت ہندوستان سے نکل کر ایران و عراق تک پہنچ گئی تھی" اور یہ بات صحیح ہے مرزا صاحب کے تراجم بیرون برصغیر میں پھیلے ہوئے تھے

دوسری خبر اودھ اخبار ۲۵ اگست ۱۸۷۵ء کے حوالے سے مقالات میں یہ بھی ہے۔

"اس سانحے کے بعد اوج جب حیدرآباد دکن گئے تو سالار جنگ نے انھیں مالا مال کر دیا اور ایک منصب بھی پیش کیا لیکن اوج کو لکھنؤ چھوڑنا منظور نہ تھا۔"

(مقالات گارسیں تاسی طبع انجمن ترقی اردو ۱۹۴۳ء حصہ دوم ص ۲۰۱)

خط نمبر (۲) دبیر

اودھ اخبار ۹ فروری ۱۸۷۵ء صفحہ ۱۸۹ مرزا صاحب کے ایک خط سے آراستہ ہے۔ یہ خط اُن کے مشہور مصرعۂ تاریخ کی بحث سے متعلق ہے۔ خط فارسی میں ہے اور اُن کے آخری مکتوبات میں ہے۔

"رقعہ"

سال تاریخش بزبر و بینہ مرقوم شد
طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

در مصرع تاریخ ارباب استعمال کثیرہ فرصت ملاحظہ قواعد تاریخ و معمائی دارند شاید بتکمیل اعداد کہ فی الحقیقت کامل است گمان تنقیص می نمایند لہذا جہت رفع توہم اعداد و حروف مرقوم می شود و در زبر و بینات۔

طور سینا بے منبر کلیم اللہ و بے انیس

۸۶	۹۰	۵	۳
آحاد	عشرات	مأت	آحاد عشرات از بر
۴۰۶	۴۰	۴	۵ ۳

در کتب مورخان مستند مصنف را مخترع ساختہ کہ اختیار است خواہ بلفظی زبر و بینہ بگیر خواہ بلفظی فقط بینہ بگیر و جواز است جواز است و قطعہ ثانیہ انشاء اللہ تیاری شود۔ قدم رنجہ فرمائید تا التماس سرزدی بمعاینہ نمودہ شود۔

والسلام

داعی بقا مشتاق لقا دبیر عفی عنہ

اس خط کے بعد کالم آٹھ میں زبر و بینات کا حساب اور بحث ہے لیکن مضمون نگار کا نام نہیں ہے مگر یہ مرزا ذوج صاحب نے والد مرحوم کی طرف سے مضمون لکھا ہے۔ افسوس ہے میں جلدی کی وجہ سے وہ طویل عبارت نقل نہ کر سکا۔ مرزا حامد علی بیگ مہر نے اپنے رسالہ زر ثبوت صحت تاریخ میں ایک حملہ لکھا جس سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہ مضمون ابتدائی طور پر سید بادشاہ علی بقا نے لکھا ہو، بقا صاحب مرزا دبیر کے خویش تھے اور اس بحث میں پیش پیش تھے۔ مہر لکھتے ہیں "دبیر نے جو تاریخ صاحب بیان بلیس و طبع نفیس جناب میر ببر علی صاحب انیس کے انتقال کی بانا عدد زبر و بینہ کمال جدت کے ساتھ فرمائی اس کی سمجھ میں نابعدان کو چیز تحقیق کو انتہائی پریشانی ہوئی کہ آخر بجھانے کی نوبت آئی تو سید بادشاہ علی صاحب متخلص بہ بقا ابن سید وزیر علی صاحب صبا اسکنہ اللہ فی الجنۃ الباری فریق مرزائے مغفور سے اس کی کیفیت واقعی نادانوں کے ذہنوں پر حالی کرنے کا طریقہ سوال و جواب کا ایجاد کیا اور افہام و تفہیم نکات و غوامض سے طبیعت مستردین کو شاد کیا۔"

(رسالہ مذکور ص ۳)

دوسرا خط

مرزا دبیر کا ایک خط جناب نجم المرتضیٰ صاحب کے پاس محفوظ ہے۔ یہ صوفت کے دادا جناب مولانا عنایت علی صاحب سانوی (المتوفی ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۷ء) بہت عالم و فقیہ تھے۔ پٹیالے سے لکھنؤ تک اُن کی شہرت تھی اور اکابر ملک سے روابط۔

اصل خط کی عبارت

ضیاء المشرقین، کہف الثقلین، فرزند ذکی جبر دین مبین، فرزند ذکی شمع شرع متین دام مجدکم۔

بعد سلام مسکیر از اقتدامش چمن اسلام زر ابتسام داز ارتاش گلشن کلام فصاحت انضمام است گزارش آنکہ نزاد دیدہ انامل تقدس شمائل را اگر حرز بازوی مفاخرت دائم بجا و چون صحیفہ اوراد سعادت خوانند و طائران دل بہ کن زر دام عقیدت خدام و تمامے ارادت تو اوج ترقی مرام، زلال اشتیاق در کام و بادہ تمنا در جام است۔ مگر در تو او بسبب تردد عزم سفر در تقدیم لوازم عیادت سعفر

زار خدمت سراپا برکت دور ماندم تا صبح سواری شوم و اگر حیات مستعار باقی است بعد معاودت استفادہ صحبت سراسر افادت می کنم۔ شافی حقیقی صحت کامل و شفائے عاجل کرامت و طول حیات عنایت فرماید (آمین) والسلام

لفافے پر تحریر ہے۔

بعونہ و صلوتہ

بمنظر رفعت اثر عرش معراج پیغمبر فصاحت و طور ابدا نور کلیم بلاغت و ملبس اصابع تقدس منابع ضیاء المشرقین کہف الثقلین نازنندہ حجر زین مبین فرزند شمع شرع متین جناب کرامت انتساب حضرت مرزوی سید عنایت علی صاحب حسینی دام مجدہ فائز باد۔

داعی بقا مشتاق لقا

دبیر عفا عنہ

(۳)

پہلے سوانحی مضمون، دو ناری کے خطوں کے بعد اپنے کتب خانے کے ان سائیس مخطوطہ مرثیوں کا تذکرہ مناسب سمجھتا ہوں جو معاصر یا قریب العصر دبیر لکھے گئے ہیں۔ جن مرثیوں پر کاتب کے نام یا سنہ کتابت تحریر ہے۔ اُن کی تفصیل یہ ہے:۔

۱۔ جب قرب ہوگا آمد روز نشور کا

ایک سو گیارہ بندوں کا یہ مرثیہ "۲۰ ربیع الثانی ۱۲۴۸ ہجری" کا مخطوطہ ہے اور بے حد قیمتی اور معلوماتی ہے۔

(الف) مرزا صاحب ۱۱ جمادی الاول ۱۲۱۸ھ میں پیدا ہوئے۔ اس مخطوطے کے وقت اُن کی عمر تیس سال تھی۔

(ب) مرثیے کے بند نمبر ۷۳ تا ۸۲ دس بند مرزا صاحب کے قلم سے لکھے ہوئے ہیں (عکس تحریر پہلی مرتبہ شائع ہو رہا ہے)۔

(ج) اس مرثیے میں دو نام آئے ہیں پہلا نام حضرت امام مہدی آخر الزماں کا ہے (بند ۱۱)

اُس دم کی کیا شکوہ و تجمل کروں بیاں
سرخ و سفید رنگ رُخ سید زماں
مثل ستارہ خال رخ راست پر عیاں
سن میں مثال خضر، مگر حسن میں جواں
پیدا یہ صاف ہوئے گا حسن جمال سے
کم سن و سال ہے ابھی چالیس سال سے

مابین ہر دو چشم رگ ہاشمی بلند
مردم کریں گے دیدۂ مردم کو دل پسند
وقت نظارہ چشم تجلی سے بہرہ مند
وہ چشم وہ جمال خدا کو یہ تھا پسند
ہر لحظہ حق کو ذوق تھا اس رخ کی سیر کا
پنہاں اسی لئے تو رکھا چشم غیر سے

اور قد کی راستی الف راست سے سوا
نسبت پہ اس سے ہے الف راستی کو کیا
اس قد پاک سے جو مشابہ الف بنا
حق نے کیا حروف تہجی کا پیشوا
اس اک الف سے ارض بھی ہے اور سما بھی
دنیا کی ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی ہے

سر سرمایۂ نور پلکوں پر لوگوں کی پتلیاں سپند، مابین ہر دو چشم رگ ہاشمی بلند (بینی) وہاں تنگ، موجودہ پر نگاہ خلائق سے وہ نہاں، خط پشت لب پاک جیسے تنگ متن پر حاشیہ گیسو دلیل شرح دو لام۔

یوں ناطق درود و شبیہ امام ہے
جس طرح سے نماز میں واجب سلام ہے

سینہ گہر راز خدا کا خزینہ یہ ہاتھ وہ ہیں قبضے میں جن کے ہے کائنات۔

ترآن و وحی و شرع نبی، دین کبریا
یہ چار چیزیں ہوئیں گی چار آئینہ
اور پشت شاہ دیں پہ سپر ہوگی یوں دھری

جیسے نبی کی پشت پہ مہر پیمبری

آٹھ بند سراپا کے اندر تین بند اسلحہ اور آراستگی کے ہیں۔

بند ۳۵ سے دوسرا سراپا شروع ہوتا ہے۔

یارو سنو اب آمد دجال روز سیاہ
سگ اُس کی شکلِ نحس سے مشتق خدا گواہ
ریشِ دراز جس میں شیاطین کی پناہ
بینا جو ایک چشم تو اک چشم کور داہ
بے شبہ لام ظلم زہ گیسوئے پیچدار
عصیاں کا نون ابروئے دجال نابکار

اس قدر طول بیان کا سبب یہ ہے کہ مرثیہ پر بحث کرنے والے صاحبانِ نظر کا اتفاق ہے کہ "چہرہ" سب سے پہلے ضمیر نے لکھا۔ خود میں بھی اب تک یہی لکھتا اور سمجھتا رہا۔ ضمیر نے اپنے مرثیہ :-

"کس نور کی مجلس میں مری جلوہ گری ہے"۔

میں کہتے ہیں۔

جس سال کہے وصف یہ ہمشکلِ نبیؐ کے
سن بارہ سو اکچاس تھے ہجرت نبوی کے
آگے تو یہ انداز سخن تھے نہ کسی کے
اب سب یہ مقلد ہوئے اس طرز نوی کے
دس میں کہوں سو میں کہوں یہ وہ ہے مرا
جو جو کہے اس طرز میں شاگرد ہے میرا

یعنی ۱۲۴۹ھ میں ضمیر نے پہلی کی، مگر میرا محفوظ مرثیہ اُس کی تردید کرتا ہے۔ یہ مرثیہ ۱۲۴۸ھ کا مکتوبہ ہے اس لئے قطعاً مرزا صاحب نے سال چھ مہینے پہلے لکھا ہوگا۔ یعنی محرم ۱۲۴۸ ہجری سے کچھ پہلے یا محرم میں بہرحال ضمیر کی تاریخ سے ایک سال پہلے ایک مرثیہ میں ایک کے بجائے دو چہرے لکھے ہوئے موجود ہیں۔ اس بنا پر شاید یہ کہنے کا جواز موجود ہے کہ مرثیہ میں چہرہ کی ابتدا مرزا دبیر نے کی۔

یہ اور بات ہے کہ میر ضمیر نے حضرت علی اکبرؑ کا سراپا لکھنے میں اولیت کا دعویٰ ہے۔

(۲) زنداں کی طرف بند تجمل سے رواں ہے

صحیح شدہ ۷۵ بند صفر ۱۲۵۷ ہجری میں محبوب علی نے لکھا۔

(۳) ہر سنگ بنا لعل و گہر مہر علیؑ سے

۱۲۲ بند مخطوطہ جمادی الثانیہ ۱۲۷۰ ہجری

(۴) قدرت کے حوصلے کا تجمل حسینؑ ہے

۸۴ بند از قلم اکبر علی ۲۵ محرم ۱۲۷۳ ہجری

(۵) جب موسم جوانی اکبرؑ گزر گیا

۴۳ بند از قلم اشرف النساء ۱۲۸۲ ہجری

(۶) عصیاں کے عارضے سے تجھے بل تو اتواں ہے

۵۰ بند از قلم اشرف النساء ۱۲۸۲ ہجری

(۷) آمد ہے[1] بادشاہ فلک بارگاہ کی

۷۵ بند از قلم سرفراز علی ۱۳ ذی الحجہ ۱۲۹۲ ہجری

مطبوعہ نوادر ایسی دو چیزیں قابل توجہ و مطالعہ ہیں۔

(الف) شمس الضحیٰ۔ میر صفدر حسین کی مصنفہ فارسی کی کتاب جس میں میر صاحب نے دبیر کے فضائل، اُن کے خاندانی اعزاز و وقار پر گفتگو کی ہے۔ اس کا نام ہے "مناقب دبیریہ فضائل العارفین و مقلب بہ شمس الضحیٰ" صفحہ ۱۰۔

کتاب کے پانچ باب ہیں "صفت مداحی اہلبیت طاہرین" ص ۱۱ تا ۷۰

"دوم شیمہ کریمہ ذکر مصائب حضرت سید الشہداء" ص ۷۰ تا ۱۰۸

"سوم فضیلت بکا بر مصائب آل عبا" ص ۱۰۸ تا ۱۱۷

---

[1] یہ سب قلمی مرثیے "جواہر دبیر" کے نام سے ادارہ اظہار سنز لاہور شائع کر رہا ہے۔ جن کی ترتیب و تحقیق و تنقید میں وہی اصول پیش نظر رکھے ہیں جو "منتخب مراثی انیس" مجلس ترقی ادب لاہور میں ملحوظ رکھے تھے۔

(مرتضیٰ حسین فاضل)

"چہارم شرط جود و سخا و کثرت فیض و عطا" ص ۱۱۷ تا ص ۱۲۹

"پنجم اتصاف بفضائل معنوی و صوری و کمالات باطنی و ظاہری"

ص ۱۲۹ تا ۱۳۹

ہر باب کو "مقصد" کا عنوان دیا ہے اور ختم کلام میں اولاد و اجداد کا تذکرہ ہے جو ۱۴۰ سے ۱۵۱ تک چلا گیا ہے ص ۱۵۱ پر مصنف کتاب نے مرزا دبیر کی مدح میں چھپن شعروں کا قصیدہ لکھا ہے صفحہ ۱۵۴ سے غلام حسین اور دبیر داؤج کے نام (۱) غفران مآب (۲) مختار خاں دہلوی (۳) علی مراد خاں (۴) امجد علی شاہ (۵) محمد نور اللہ خاں دہلوی (۶) مرزا محمد باقر دہلوی (۷) میر ضمیر (۸) مولانا سید تقی صاحب کے خطوط درج ہیں صفحہ ۱۶۵ کی آخری سطر سے سوانح دبیر کا ایک ضمیمہ شروع ہوتا ہے۔ جس کا آغاز ان فقروں سے ہے۔

"واضح باد کہ ہر گاہ جناب مرزا دبیر صاحب مغفور بضرورت تذہیب چشم" الخ پھر علی نقی کا خط بنام دبیر اور متفرقات ہیں۔

یہ کتاب تحقیق و مواد کے اعتبار سے بہت اعلیٰ درجہ کی تصنیف و تالیف ہے۔ مصنف نے سو سے زیادہ کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ تفسیر و حدیث، تاریخ و تذکرہ شعراء کا بہت بڑا ذخیرہ مصنف کی دسترس میں ہے۔ فارسی اور ترتیب کتاب سے موصوف کی علمی و ادبی قابلیت پر روشنی پڑتی ہے۔

شمس الضحیٰ اُن کامیاب کتابوں میں ہے جو کسی شاعر کی زندگی میں اُس شاعر پر لکھی گئی ہوں۔ مصنف نے لکھا ہے کہ مرزا صاحب کی عمر پچاس سے اوپر ہوگی (صفحہ ۹۸) اس لئے ۱۲۹۰ھ کے حدود میں تالیف کا وقت متعین کیا جا سکتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ پونے دو سو صفحات کی کتاب میں مرزا کی تاریخ ولادت و واقعات حیات نہیں ملتے صرف یہ معلوم ہوا۔

(الف) بچپنے عرفان و علم سے شغف تھا، ریاضت کا شوق و تحصیل کمال کا ذوق تھا۔

(ب) ابتداء سن میں شاعری کا شعور تھا۔ غزل و ہزل و ملفوظات بلکہ قصائد مدح ملوک و سلاطین و حکام و امراء سے پرہیز کیا گیا۔ گیارہ سال کی عمر سے مناقب و مصائب پر طبع آزمائی شروع کی اور میر مظفر حسین ضمیر سے تلمذ کیا۔ بارہ سال کی عمر میں دستگاہ فن حاصل کر لی۔ چودہ سال کی عمر میں بڑے مشہور شعراء کے ہم پلہ ہو گئے

(ج) مرزا صاحب کے کلام کا احاطہ مشکل ہے۔ کچھ شاگردوں کے پاس ہے کچھ ضائع ہو گیا۔ نظم و نثر اردو فارسی و عربی ہزاروں کی تعداد میں اوج صاحب کے پاس ہے۔

(حاشیہ مصحح)

(د) مرزا صاحب کی محنت اور خوانندگی و تقدس کا بیان۔

(ہ) شہرت کی گونج "در دیگر امصار و بلدان ملک وسیع الفضائی ہندوستان و قصبات و قریات تا منتہائے کلکتہ و بمبئی و سورت و لاہور و ملتان و دکن و اسد و کابل و کشمیر و لندن بلکہ در مکہ معظمہ و مدینہ منورہ و جنۃ البقیع و در نجف اشرف و در کربلائے معلی و در رواق و روضہ خیر الناس حضرت عباس و خیمہ گاہ و در کاظمین شریفین و سامرہ ... در خراسان ... و معصومہ قم ... کہ اہل ہند مجالس تعزیت منعقد می سازند مراثی نظم نمودہ آں جناب خوانندہ می شوند (۱۰۷)

خاندان و اجداد و اولاد کی تفصیل اچھی ہے۔ باقی تاریخ سوانح دبیر کے متعلق جو کچھ ہے وہ نہ ہونے کے برابر میرا نسخہ ناقص الطرفین ہے۔ اُس کی اشاعت ۱۲۹۸ھ میں لکھنؤ کے مطبع اثنا عشری سے ہوئی اور کسی پڑھے لکھے شخص نے مرزا اوج صاحب کی مدد اور گھر کے دستاویزات کی روشنی میں مفید حاشیے لکھے۔

(ب) دفتر ماتم کی تلاش لکھنؤ سے لاہور تک جاری ہے۔ اتفاق ہے کہ اب تک اُس کی بیس جلدیں یکجا دیکھنے میں نہیں آئیں۔ مرزا دبیر کی اہمیت و مقبولیت کے لئے "دفتر ماتم" ایک دلیل ہے۔ بیس جلدوں کا یہ کلیات مرثیہ، مثنوی، سلام، مخمس، قطعہ و رباعی جیسے اصناف کلام کا مجموعہ ہے جس میں بشمار ثابت لکھنوی مرزا صاحب کے ۲۶۶ مرثیے چھپے ہیں۔ میرے پاس پہلی جلد کا پہلا مرثیہ ہے۔ اتفاق سے جلد کا صفحہ آخری ۴۵۸ محفوظ ہے سرورق پر مرزا اوج مرحوم کی ایک مختصر تحریر اور مہر کتب خانہ ہے۔

"بعض کلام معجز نظام جناب والد علام طاب ثراہ سے جو منقسم ہے بیس جلدوں میں ہم نے اپنے کتب خانے سے دیا ہے اور صاحبان مطبع سبطینیہ سے تصحیح کا اقرار لیا ہے۔ باقی النقل کالاصل اس بات کا صادق آنا کاتبوں کے ہاتھ ہے" ــــ مہر

بائیں کنارے پر مالک مطبع سبطینیہ حسن مرزا صاحب کے دستخط ہیں۔ کتبہ میر اعظم خاں لکھنؤ کے مطبع سبطینیہ سے چھپی ہوئی ہیں جلد کا سنہ ۱۳۰۰ ہجری ہے۔ اس جلد کا پہلا مسدس جو حمد و نعت و منقبت کے بعد امجد علی شاہ اور سلطان العلماء و سید العلماء کے فضائل پر ہے بطور تمہید کے چھاپا گیا ہے۔ اس مسدس کا سنہ تخلیق ۱۲۶۰ھ اور منقول عنہ نسخہ "نوزدہم ماہ جمادی الاخری ۱۲۶۹ھ روز چہارشنبہ ہے۔

(اس نادر کتاب کے دو عکس پیش کئے جا رہے ہیں)

دفتر ماتم سے پہلے نول کشور نے مرزا صاحب کے مرثیوں کی دو جلدیں چھاپی تھیں۔ جلد اول دسمبر ۱۸۷۵ء یعنی ذی الحجہ ۱۲۹۲ ہجری میں مرزا صاحب کی وفات کے گیارہ ماہ بعد چھپ گئی منشی صاحب نے خاتمۃ الطبع میں لکھا۔

"زمانہ کو ہمیشہ اس بات کی حسرت رہی کہ میر انیس اور مرزا دبیر کا تمام کلام یکجا دیکھیں۔ طبع ہونا تو درکنار بھی کسی کو نہ ملتا تھا۔ پس یہ آرزو کیونکر حاصل ہو سکتی۔ اس واسطے کہ ہزاروں روپیہ کے صرف کرنے پر بھی ایسی امید کا بر آنا محال تھا۔ یہ دونوں شاعر مرثیہ گوئی میں بے نظیر تھے ان کا ایک ایک مرثیہ گنجینۂ گوہر شمار ہوا۔ لطف یہ ہے کہ باوصف اس بات کے ہر ایک شاعر ہمیشہ اپنے کلام کو پوشیدہ رکھتے رہے۔ تاہم تمام جہان میں شہرت پائی کہ خدا جانے زمانے میں انوری و خاقانی کو بھی نصیب نہ ہوئی ہوگی۔ سنہ اللہ یہ مرثیہ گو اخیر کے افتخار اس زمانے میں گزرے جن کا مثل نہ پیدا ہوا نہ ہوگا

مرزا دبیر کی فصاحت و بلاغت اور سخن سنجی کا بیان کرنا ایسا ہے جیسا کوئی سحبان وائل کا ذکر کرے اور پھر کہے کہ وہ کس کا شاگرد تھا اور کیسا فصیح اللسان گزرا۔ گویا ایک فعل عبث ہے مگر اپنا یادگار زمانہ کے لئے اتنا لکھ دینا کافی ہوگا کہ حضرت مرزا دبیر علاوہ مرثیہ گوئی زبان اردو کے علم و فضل میں یگانہ روزگار عالی رکھتے تھے اور بہت بڑے مرتاض اور عابد و پرہیزگار تھے۔ مخیر ایسے بڑے کہ عمر میں لاکھوں روپیہ پایا۔ کیا مگر روپیہ کو خذف ریزہ سے بدتر سمجھا۔ ایسے شخص کو اگر اپنے وقت کا حاتم کہتے تو سزاوار تھا۔ اکثر اوقات جب کچھ روپیہ پاس نہ ہوتا تھا تو نقد کلام یا گھر کے برتن تک سائل کی نذر کرتے تھے

یہ ایک مشہور بات ہے کہ ایک سائل کو حضرت دبیر نے اپنا مرثیہ عطا کیا۔ وہ حیدرآباد دکن لے گیا اور وہاں ایک ہزار روپیہ کو بیچ دیا۔

خلاصہ یہ کہ کبھی سوال سائل کا رد نہ کرتے تھے ہمیشہ توکل پر گزران تھی۔ اکثر شاگرد آپ کے ازراہ دلسوزی کبھی کبھی گستاخ ہو کر اگر عرض بھی کرتے کہ آپ اولاد کا حق تو رکھا کیجئے تو فرماتے کہ کبھی خدا مالک ہے۔ غرضیکہ ایک ہی مخیر و متوکل تھے۔

اس بزرگ زیدہ شاعر نے ۷۲ برس کے سن میں بعارضہ اختلاج قلب و امراض کبد وغیرہ محرم الحرام کی ۲۹ تاریخ منگل کے دن وفات پائی تھی چونکہ کلام فصاحت نظام اس بلبل ہندوستان کا ایک زمانہ مشتاق تھا اس واسطے جناب مالک مطبع اودھ اخبار نے چاہا کہ جس طرح ہو سکے اس کو طبع کیجئے۔ جناب مرزا محمد جعفر صاحب ادیب فرزند حضرت دبیر مرحوم سے استدعا کی۔ مرزا صاحب موصوف نے جس قدر مسودے تمام مرثیوں کے بہم پہنچے سب عنایت کئے۔ پھر کیا دیر تھی فی الفور مجموعہ مرثیہ مرزا دبیر طبع ہونا شروع ہوا۔

چونکہ یہ مرثیے مرزا ادیب صاحب کے عنایت کئے ہوئے ہیں اس واسطے یقین ہے کہ صحیح اور بلا تصرف ہوں گے۔ اس میں کلام نہیں کہ مرزا ادیب صاحب نے اس خصوص میں نہایت فیاض چشمی سے کام لیا اور حفظ وصیت کیا۔ کیونکہ کوئی کلام بدون طبع ہونے کے کامل طور پر محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس کلام معجز نظام کی کیا تعریف ہو سکے انصاف یہ ہے کہ اگر شاعری پیغمبری ہوتی اور اس کا اردو زبان کی فصاحت پر انحصار و مدار ہوتا تو مرزا دبیر ہی کا حق تھا۔ ایسے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں۔

بفضلہ اب یہ مجموعہ مطبع نول کشور مقام لکھنؤ ماہ دسمبر ۱۸۷۵ء میں چھپ کر شائع ہوا۔

مرزا دبیر کی شہرت و محبوبیت کا اثر ہے کہ منشی جی نے مرزا صاحب کا کلام اسی سال شایع کر دیا جس سال مرزا صاحب نے رحلت کی تھی اور میر انیس کا کلام گیارہ ماہ بعد دسمبر ۱۸۷۶ء میں چھپا۔

شیخ وحید

مرزا دبیر کی کوئی مدحت کرے تو کیا
بے مثل تھے جہاں میں حقا وہ با خدا
ہر وقت انھیں عبادت خالق کا شوق تھا
شب زندہ دار اور سحر خیز دائما
بیداری میں جو تھا وہی عالم تھا خواب میں
ہر حال میں رجوع خدا کی جناب میں
سجدے کا شوق تھا سر اقدس کو بیکراں
پابند جا نماز قدم بھی تھے ہر زماں
دل سینہ میں تھا کعبۂ خلاق دو جہاں
اللہ اکبر ایسے نمازی ہوئے کہاں
پیدا دہن سے سجدۂ خیر الانام تھی
دنداں نمازی اور زباں پیش امام تھی
اٹھے پڑھی نماز ہوا وقت صبح جب
قرآں پڑھا وظیفۂ معمول پڑھ کے سب
دن کو نماز روزہ تو شب کو نماز شب
ایسے کہاں ہوئے ہیں عبادت گزار اب
رہتے تھے صبح و شام اسی بندوبست میں
تسبیح خاک پاک کف حق پرست میں
ورد زباں یگانہ و بیگانہ کی ثنا
خوش تھے عزیز و دوست رضامند آشنا
نیکی یہ تھی برا نہ کسی کو کبھی کہا
ایسا جہاں میں اور ہوا کوئی با خدا
اوصاف میں ولی تو یہ قدسی سیر میں تھے
کچھ شک نہیں ملک یہ لباس بشر میں تھے

دبیر اور شبلی

(پروفیسر گیان چند جین صاحب صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی ۔ الہ آباد)

خوشی کی بات ہے کہ آپ سرفراز کا دبیر نمبر نکال رہے ہیں۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں باک نہیں کہ میں نے نصابی ضروریات کے سوا دبیر کو بہت کم پڑھا ہے۔ میرے ایم اے کے نصاب میں مراثی دبیر کی ایک جلد تھی وہ پڑھی۔ اس کے علاوہ وہ چند مراثی نظر سے گزرے جو عام طور پر نصابی مجموعوں میں ہوتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ جس طرح انیس کے اچھے مرثیوں کا ایک اوسط حجم کا انتخاب روح انیس قارئین سے داد لیتا رہا ہے دبیر کا ایسا کوئی مجموعہ اہل نظر کے سامنے نہیں آیا جس کی وجہ سے دبیر بہت گھاٹے میں رہے۔

عام قارئین اور شائقین ادب کی چشم تصور میں مرزا دبیر کی تصویر قائم ہے وہ شبلی کے موازنۂ انیس و دبیر کی مطا کردہ ہے۔ شبلی جذباتی آدمی تھے اور کشتۂ جذبات انسان اچھا نقاد نہیں ہو سکتا، کم سے کم موازنے کی گوں کا تو ہوتا ہی نہیں، شبلی دبیر کے بارے میں فیصلہ کرتے ہیں۔

"اس کے ساتھ الفاظ میں فصاحت، سلاست، روانی، بندش میں چستی اور چستی کے ساتھ بے تکلفی، دل آویزی اور برجستگی، لطیف اور نازک تشبیہات اور استعارات، اصول بلاغت کے مراعات، ان تمام اوصاف میں سے کون سی چیز مرزا دبیر میں پائی جاتی ہے؟ فصاحت ان کے کلام کو چھو بھی نہیں گئی، بندش میں تعقید اور اغلاق، تشبیہات اور استعارات اکثر دور از کار بلاغت نام کو نہیں۔ کسی چیز یا کسی کیفیت یا حالت کی تصویر کھینچنے سے وہ بالکل عاجز ہیں۔ خیال آفرینی اور مضمون آفرینی البتہ ہے لیکن اکثر جگہ اس کو سنبھال نہیں سکتے۔"

(موازنۂ انیس و دبیر ص ۵۲، مکتبہ جامعہ ۱۹۷۹ء)

جو شخص اس قسم کی رائے دے اس تنقید کی میزان اس کے سپرد نہیں کر سکتا۔ مولانا نے خدا معلوم کس کس کے قصر شعر، سقیم مصرعے دبیر کے سر منڈھ دیے اور ان کی گردن مارنے کے درپے ہو گئے۔ ضرورت ہے کہ روح انیس کی طرح دبیر کا ایک عمدہ انتخاب مرتب کر کے پیش کیا جائے تاکہ دبیر صحیح روشنی میں سامنے آ سکیں۔ اس انتخاب میں ایک بڑی دقت ہوگی۔ دبیر کا مخصوص رنگ خیال آفرینی اور معنی بندی کا ہے۔ شاید وہ خود انیس کے مقابلے میں اسی رنگ و آہنگ کو اپنی متاع فوق جانتے ہوں گے لیکن آج کا مذاق اسے پسند نہیں کرتا۔ آج سلیس و فصیح بولی کی زیادہ ساکھ ہے۔ دبیر کے یہاں اس رنگ کا فقدان نہیں ایک غیر مطبوعہ تحقیقی مقالے سے حضرت علی اصغر کے مرثیے کے تین جستہ جستہ بند ملاحظہ ہوں۔

ہر اک قدم پہ موچتے تھے سبط مصطفیٰ
لے تو چلا ہوں فوج عمر سے کہوں گا کیا
نے مانگنا ہی آتا ہے مجھ کو نہ التجا
منت بھی گر کروں گا تو کیا دیں گے وہ بھلا
پانی کے واسطے نہ سنیں گے عدو مری
پیاسے کی جان جائے گی اور آبرو مری

پہنچے قریب فوج تو گھبرا کے رہ گئے
چاہا کریں سوال پہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے
چادر پسر کے چہرے سے سرکا کے رہ گئے
آنکھیں جھکا کے بولے کہ ہم کو لائے ہیں
اصغر تمہارے پاس غرض لے کے آئے ہیں

پھر ہونٹ بے زبان کے چومے جھکا کے سر
رو کر کہا، جو کہنا تھا وہ کہہ چکا پدر
باقی رہے نہ بات کوئی اے مرے پسر
سوکھی زبان تم بھی دکھا دو نکال کر
چھیری زباں لبوں پہ جو اس نورِ عین نے
تھرا کے آسمان کو دیکھا حسینؑ نے

آپ نے دیکھا، یہ انیس کا کلام نہیں دبیر کا ہے، اس

دبیر کا جس کے کلام کو بقول شبلی فصاحت چھو بھی نہیں
بلاغت نام کو نہیں۔ میں غیر مسلم ہونے کے باوجود ان کا
کو نقل کرتا ہوں تو ایک خاموش رقت طاری ہو جاتی ہے
آخر صاحب اولاد ہوں۔

ضرورت ہے کہ دبیر کے نمائندہ انتخاب میں ا
دو مرثیہ معنی بندی کا رکھ لیا جائے بقیہ بیش تر حصہ سلیس
پر اثر کلام پر مشتمل ہو۔ دبیر کی نامقبولیت کی اصل
ان کا کلام نہیں ایک علامہ کا جانب دارانہ فیصلہ
جسے سہل انگاری کے سبب قبول کر لیا گیا ہے۔ قدر
دبیر کو چاہیئے کہ صحیح انتخاب کے ذریعے دبیر
ان کا جائز مقام دلائیں۔

(جناب ہنر لکھنوی)

(۱)

فرمانروائے کشورِ نظم و بیاں دبیر
صاحب لوائے لشکرِ نظم و بیاں دبیر
معنی کشائے دفترِ نظم و بیاں دبیر
زینت فزائے افسرِ نظم و بیاں دبیر
کل تک تھی اس جناب سے ہندوستاں کی زیب
ہے آج روضۂ پاک سے باغِ جناں کی زیب

(۲)

غازہ نمائے صورتِ زیبائے شاعری
شیرازہ بندِ مصحفِ اجزائے شاعری
خلعت نوازِ قامتِ بالائے شاعری
نور تجلیِ یدِ بیضائے شاعری
افسوس کیا ہوا وہ سلیمانِ شاعری
ایماں و روحِ نظم و بیاں جانِ شاعری

(۳)

تھے فردِ ہر کمال میں وہ آسماں جناب
جود و سخا و خلق و مروت میں انتخاب
تقویٰ و زہد و ورع عبادت میں لاجواب
ہر دم توکل اور قناعت میں لاجواب
مدحت طرازِ دل سے خدا کے ولی تھے
یہ کم ہے کیا شرف کہ ثنا خواں علی تھے

(۴)

ذاکر بغیر مجلسِ ماتم ہے دردمند
منبر ہے یا کہ آہِ لبِ عرش سے بلند
گریہ کناں ہیں سوگ نشینانِ حق پسند
دیدار کا ہے شوق ہر اک چشم کو دو چند
مشکل ہے صبرِ ہجر میں برنا و پیر کو
مجلس میں آنکھیں ڈھونڈ رہی ہیں دبیر کو

ضیاء الحسن موسوی

خصوصیات و اوّلیات مرزا دبیر

اردو شاعری کی صنف مرثیہ کی مکمل اور نکھری ہوئی شکل ایک مثلث بناتی ہے۔ دبیر، انیس اور عشق اور ان تینوں کا رُخ ضمیر کی طرف ہے جنھوں نے اس صنف کو وہ جہت عطا کی جدھر گام زن ہو کے اردو مرثیہ ایک ایسی صنف شاعری قرار پایا جس کی نظیر عالمی ادب میں کہیں نہیں ملتی۔

کسی موضوع پر قلم اُٹھانے کے لئے شرط استحقاق بھی ہونا چاہیئے اس لئے انتہائی خاکساری کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ مجھ کو ان تینوں اساطین مرثیہ نگاری سے نسبت کا شرف حاصل ہے۔ "میر انیس سے میرا اُنس" روزنامہ جنگ میں شائع شدہ میرے ایک مقالے کے ایک حصہ سے یہ واضح ہو چکا ہے کہ میر انیس سے میرے بزرگوں کے کیا تعلقات تھے۔ اگرچہ میر انیس نے اپنے خاندان سے باہر کسی کو شاگردی کا شرف نہیں عطا کیا مگر میرے خاندان کے ایک بزرگ میر اولاد حسین آہ کنتوری نے شاگردوں سے زیادہ اُن سے استفادہ کیا اور اُن کو یہ شرف بھی حاصل تھا کہ میر انیس بزرگ اُن کو مخاطب اور متوجہ فرمایا کرتے تھے۔ ایک اور بزرگ میر ہادی علی کنتوری نے اپنی زندگی کلام انیس کی تحقیق میں صرف کی اور اُن سے علامہ نظم طباطبائی بھی صحت کلام انیس میں مشورہ کرتے تھے۔

سلسلۂ جناب میر عشق سے میرا تعلق یہ ہے کہ میرے ماموں مولانا حکیم سید ساجد حسین ساجد مدظلہ پیارے صاحب رشید کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اور میں نے اُن سے سالہا سال استفادہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے جناب مؤدب لکھنوی مرحوم اور برادر مکرم جناب مہذب لکھنوی مدظلہ سے بھی استفادہ کیا ہے۔

رہ گیا سلسلہ مرزا دبیر تو اس سے میری وابستگی کے کئی پہلو ہیں۔ مرزا دبیر کے شاگرد اور پرنس زید پوری مرحوم کے منجھلے بھائی جناب متوسط حسین اکمل مرحوم میرے اتالیق تھے۔ جناب فراست زید پوری کے شاگرد مولوی سید غلام عباس ناصر زید پوری مرحوم شاعری اور فنون شاعری میں میرے استاد تھے۔ میرے خاندان کے ایک عظیم عالم و شاعر جناب مولوی سید ظفر مہدی اثیم موسوی جو ولی مرزا دبیر کے عزیز ترین شاگردوں میں سے تھے۔ علم شرح حدیث میں ان کی کتاب روضۃ الصادقین بڑی بلند پایہ کتاب ہے اُس کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور باقی پانچ قلمی کتب خانہ ناظمیہ لکھنؤ میں محفوظ ہیں۔ اثیم مرحوم نے "اشک مسلسل" کے نام سے ایک طویل مرثیہ نظم کرنا شروع کیا تھا جو ازاول تا آخر تاریخ کربلا ہے اس کے تین ہزار سات سو چالیس بند لکھنے کے بعد اُن کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اُن کے

فرزند اور مرزا اوج کے شاگرد جناب سید حیدر مہدی شمیم موسوی نے اُس کو مکمل کیا۔ یہ شاہکار ابھی تک غیر مطبوعہ ہے

جناب ظفر مہدی اشیم کی خاطر سے مرزا دبیر ہر سال ایک مجلس پڑھنے میرے نانیہال قصبہ جردل ضلع بہرائچ تشریف لیجاتے تھے۔ اُن کے بعد یہ مجلس مرزا اوج پڑھتے رہے۔ اشیم مرحوم کی تاریخ وفات مرزا محمد طاہر رفیع مرحوم نے کہی تھی ؎ از فضیلت سال رحلت شد عیاں

مرزا اوج نے ان کی ستائش میں یہ رباعی کہی تھی۔

تھی آپ کے دم سے رونق بزم سخن
تھا آپ پر اعتماد با نجم سخن
کیوں کر نہ ہوا تبر اُمت نظم و بیان
تھے آپ پیمبر از الوالعزم سخن

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو دبستان دبیر ذاکر حسین فاروقی)

مسلک دبیر کے مشہور سالک جناب سرفراز حسین خبیر مرحوم سے عزیزوں جیسے تعلقات تھے اُنھوں نے میری شادی کی تاریخ یہ کہی تھی۔ سُنا خبیر نے جس دم یہ مژدہ دلخواہ
لکھا یہ سال (ضیاء الحسن بنا نوشا) (۱۳۷۴ھ)

لکھنؤ میں میری زندگی کے ابتدائی بیس سال نصیر منزل نخاس میں گزرے جو کوچۂ مرزا دبیر سے بہت قریب ہے اور مجھے یہ شرف بھی حاصل ہے کہ مرزا محمد طاہر رفیع مرحوم نے مجھے اپنی گود میں کھلایا ہے اور آج تک ان کی گفتگو اور اُن کی مرثیہ خوانی کانوں میں گونجتی ہے اور تصویروں کی طرح نظروں میں پھرتی ہے۔ خاندان مرزا دبیر سے یہ ربط آج بھی باقی ہے چنانچہ برادرم ضمیر اختر صاحب نے مراثی دبیر مرزا دبیر کا جو اشاریہ مکمل اور مرتب کیا ہے[1] اور جو خجستہ اور نادر تصاویر پرماہ نو کے لئے مرزا محمد طاہر صاحب کی صاحبزادی مقیم کراچی نے عطا کی ہیں۔ اس میں اُن روابط کو بھی دخل ہے۔

مراثی دبیر کے اشاریہ میں (۳۶۶) مراثی کا تذکرہ ہے لیکن دفتر ماتم مختلف مطابع سے شائع ہوئی ہے مثلاً مطبع علوی لکھنؤ مطبع شمس العلوم لکھنؤ، مطبع جعفری نخاس جدید لکھنؤ وغیرہ جلد نہم

[1] ابھی تک یہ اشاریہ شامل اشاعت نہیں ہے۔

طبع اول میں ۲۷ مراثی ہیں جو اشاریے میں شامل ہیں مگر مطبع دوم میں ۴۴ مراثی ہیں۔ اس طرح کل ۳۸۲ مطبوعہ مراثی دفتر ماتم میں شامل ہیں۔ ان میں سے اگر ہم ضمیر کے (۲) اور مشیر کا (۱) مرثیہ جو شامل ہو گیا ہے خارج کر دیں تو ۳۸۰ مراثی رہ جاتے ہیں۔

مرزا محمد طاہر صاحب رفیع کے فرزند مرزا محمد صادق صاحب (مقیم لکھنؤ) کے پاس جو ذخیرۂ مراثی ہے وہ چھ صندوق میں ہے اور اہل خاندان کی روایت کے مطابق مرزا دبیر کے مراثی کی تعداد دو ہزار ہے نہ کہ تین ہزار جیسا آب حیات میں تذکرہ ہے آب حیات میں اور بھی بعض ایسے حقائق بیان کئے گئے ہیں جن کی تصحیح کے لئے مرزا دبیر کے بچپن کے دوست اور شاگرد میر محمد رضا ظہیر نے ایک مستقل رسالہ "تنقید آب حیات" کے نام سے لکھا ہے جس میں اسناد شاہی پیش کر کے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ مرزا دبیر کا خاندان دہلی میں ایک ممتاز خاندان تھا اور آغا جان کا غذ فروش سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

مرزا دبیر اور میر ضمیر کی ناچاقی کی داستان جو آب حیات میں ہے اور جس کو بلا تحقیق و درایت دوسروں نے بھی نقل کر دیا ہے اس کی حقیقت بھی میر ظہیر نے تفصیل سے لکھی ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

جنوری ۱۹۵۵ء میں جب میں بین الاقوامی اسلامی مذاکرہ کے سلسلے میں لاہور میں تھا تو ایک شام میں ڈاکٹر صفدر حسین سجاد رضوی اور سجاد باقر رضوی کے ساتھ عابد علی عابد مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا وہ ایک یادگار شام تھی جو زیادہ تر مرزا دبیر مرحوم اور اُن کے مراثی کے تذکرے سے مخصوص رہی۔ اس میں میں نے عرض کیا تھا کہ شبلی نے موازنۂ انیس و دبیر کسی بدنیتی سے نہیں لکھا تھا بلکہ وہ تقابلی تنقید کی ایسی سعی تھی جس کے نتیجہ میں ۱۴ افادی کتابیں لکھی گئیں۔ مگر اس ہنگامہ میں مثبت نقطۂ نظر گم ہو گیا اور اُن لوگوں کی بن آئی جو ادبی حمایت و مخالفت کے سہارے اپنی ترویج کی سعی کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ میر انیس اور مرزا دبیر کو عربی کے شعراء

جریر و فرزدق کی طرح سمجھ لیا گیا جو ایک دوسرے کی زندگی بھر ہجو کیا کئے۔ حالانکہ معاملہ برعکس ہے۔ یہ دونوں عظیم شعراء ہمعصر ضرور تھے مگر وہ ایک دوسرے کا بے حد احترام کرتے تھے البتہ زوال آزما معاشرے کے لوگ جو زندگی کے ہر شعبے میں بٹیر بازی، مرغ بازی، پہلوانی کی ذہنیت رکھتے ہیں وہ بالعموم علم و ادب میں بھی یہی رویہ اختیار کرتے ہیں۔ پھر جاگیرداری نظام میں کچھ نسلی وابستگیاں ہو جاتی ہیں کسی ایک عالم اور مجتہد کے ماننے والے اس کے بعد اسی کی اولاد کو اپنا پیشوا مانتے ہیں خواہ وہ نااہل ہی کیوں نہ ہو اور دوسرے اہل علم و کمال سے استفادہ "روایت" کے خلاف سمجھتے ہیں۔"

میر انیس، مرزا دبیر کے کمال اور ان کی شاعرانہ عظمت کا مثبت تذکرہ بنیادی امر ہے اور تقابل ثانوی چیز ہے۔ پھر اگر تقابل ہو تو اس میں اس عہد کے دوسرے مرثیہ نگاروں اور پورے ماحول کا جائزہ شامل ہونا چاہئے۔ اور یہ ان کا کام ہے جو مرثیے کے مبادیات سے آگاہ ہوں جن میں فارسی اور عربی زبان کی آگاہی کے ساتھ فنون شعر و شاعری اور موضوع کے پس منظر کا مکمل علم ضروری ہے

میر انیس کے پس منظر میں مثنوی میر حسن، رنگ تغزل شاہ نامہ، حملۂ حیدری ملا باذل اور مسلمانان برصغیر کی سیاسی زندگی کی تبدیلیاں بھی آتی ہیں۔ مرزا دبیر نے عربی فارسی اور اردو کے قدیم مراثی ملا اہلی شیرازی کی مثنوی سحر حلال کے ساتھ دہلی پر مرہٹوں اور جاٹوں کے حملے اور برصغیر کے مسلمانوں کی پستی اور زوال کے زیر اثر اپنی مرثیہ گوئی کی عظیم عمارت خود بنائی ہے اور اس عمارت میں فقط اپنے اہل خاندان ہی کو جگہ نہیں دی ہے بلکہ اس میں پورے برصغیر کے تشنگان استفادہ کو جگہ دی ہے جس کی جھلک دربار حسینؑ میں بھی نظر آتی ہے۔

میر انیس اور مرزا دبیر دونوں اپنے کمال اور خداداد صلاحیتوں کی تعمیر ہیں۔ وہ سلاطین اور دربار کی سرپرستی سے بلند نہیں ہوئے ہیں۔ دونوں میں استغنا ہے، عزت نفس ہے اگر وہ بادشاہ کی ستائش کرتے ہیں تو اس لئے کہ وہ تحریک آزادی اور اقتدار ملت کی علامت ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی جتا دیتے ہیں کہ ان کا ممدوح فقط وہ ہے جو مرثیوں کا موضوع ہے۔

میر انیس اور مرزا دبیر دونوں کا مقصد ایک ہے۔ وہ المیۂ کربلا کے سوز و گداز سے دلوں کو موم بنا کے اور آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے بہا کے مجالس عزائے حسینؑ کی تکمیل کرتے ہوئے اسلام اور اخلاق کے وہ نقش جمانا چاہتے ہیں جو مظلوم کو احساس کمتری میں مبتلا نہ ہونے دیں اور حریت و عزت نفس کے لئے قربانی پر کمربستہ رکھیں اور اسلام سے وابستہ رکھیں۔ اگر فرق ہے تو اسالیب اور لہجوں کا ہے اس لئے دونوں کا موازنہ کرنے سے پہلے دونوں کو اور ان کی تخلیقات کو پڑھنا، سمجھنا اور ان میں جائزہ لینا ضروری ہے۔

جب ہم کلام مراثی مرزا دبیر کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم کو ان کے ادبیات و امتیازات کے عجیب و غریب مناظر نظر آتے ہیں۔

دبیر نے خطبات امام حسین علیہ السلام نظم کئے ہیں۔

(لعل لب شبیر گہربار ہے رن میں۔ یہ غیر مطبوعہ مرثیہ ہے اور تمام صنائع و بدائع کا مجموعہ ہے)

دبیر نے فارسی شاعری کی برتری کے دور میں اردو شاعری کو معیاری اور فارسی شاعری کا ہم پلہ بنا دیا۔

دبیر نے باکردار علماء کی مدح و ستائش کے عنصر کا اضافہ کیا۔

دبیر نے زوال پذیر اردو شاعری کی

تطہیر کی اور صحت بخش ادب کی تخلیق کی
دبیر نے ایسی اسلامی اور اخلاقی شاعری
کی جس کو مقدمۂ شعر و شاعری میں مولانا
حالی نے اعلیٰ درجے کی اخلاقی شاعری کے
نام سے یاد کیا ہے۔
دبیر نے مرثیے کی اثر انگیزی میں حیرت انگیز
اضافہ کیا۔ سوز خوانی یا تحت لفظ خوانی
میں منتخب چند بند پڑھے جاتے ہیں تو
مستقل اور طویل مرثیے کا کمال حاصل
ہوتا ہے۔
دبیر نے فضائل محمدؐ و آل محمدؐ نظم کرنے
میں دوسرے مرثیہ نگاروں پر اپنے تفوق کا
ثبوت دیا ہے
دبیر نے میر ضمیر کی منتخب کردہ چار بحور
کے علاوہ چند مزید طویل اور مختصر بحور
میں کامیاب مرثیہ نگاری کی۔
دبیر نے مرثیے کے حدود میں رہتے ہوئے
اپنے عصر کے سیاسی حالات نظم کئے۔ فرخ
سیر کے فرزند مرزا اوج نے سارنگ کو مزید
اخلاقی اور اصلاحی بنایا اور یہی روح کو
حالی اور اقبال کی نظموں تک لے جاتی ہے
دبیر نے قبل واقعۂ کربلا اور بعد واقعۂ
کربلا کے اہم حالات پر بھی مرثیے کہے۔
دبیر نے مرثیے کا آغاز حمد و نعت و
منقبت سے کیا۔
دبیر نے چہاردہ معصومین کے متعلق
مستقل مراثی کہے۔
دبیر نے حضرت فاطمہ زہراؑ اور حضرت
ام البنین کی شادی نظم کی۔

دبیر نے حضرت عباسؑ اور حضرت
علی اکبرؑ کی ولادت نظم کی۔
دبیر نے مراثی میں نعتیہ مسائی نظم کئے اور
ایک مرثیہ قربانی کے احکام پر کہا۔
دبیر نے مراثی میں مہذب مناظرہ اور
استدلال کا آغاز کیا اور مخالفت عزاداری
کے ایک رسالہ کا استدلالی جواب نظم کیا۔
دبیر نے مسدس کے علاوہ مخمس کی شکل
کے مرثیے بھی نظم کئے اور اپنے شاگردوں
کے سلاموں کی تضمین بھی کی۔ مراثی کے
علاوہ محافل کے لئے بشکل مثنوی "احسن
القصص" احوال ولادت و فضائل چہاردہ
معصومین نظم کئے۔
دبیر نے مرثیہ سے "سمعی بصری" فن پاروں
کا کام لیا اور اُن کو مصوری اور عکاسی
اور صوت و آہنگ کا مجموعہ بنا دیا۔ دبیر
کا کلام علم معانی و بدیع صنائع و بدائع کا
بے مثال مجموعہ ہے۔
دبیر کا سلسلہ شاگردی پورے برصغیر
میں پھیلا ہوا ہے اور بالواسطہ شاگردوں
کو شامل کر کے یہ تعداد صدہا سے متجاوز ہے۔
یہ چند نکات ہیں جن میں سے ہر ایک
مستقل مقالہ کا طالب ہے اور یہ ثبوت
فراہم کرتا ہے کہ مرثیہ کا دوسرا نام دبیر ہے۔
مرزا دبیر نے حمد و نعت و منقبت میں
چودہ مرثیے ایسے کہے ہیں جن میں سے ایک
ایک مرثیہ "دفتر ماتم" کی ایک جلد کا پہلا
مرثیہ ہے۔
جلد اول: "طغرا تو بیں کن فیکون ذوالجلال ہے۔

حمد و نعت رسول (۲۴) بند۔

جلد دوم: اے روزہ دار آہ و بکا کے یہ روز ہیں

در حال حضرت علیؑ ۴۰ بند

جلد سوم: بلقیس پاسباں ہے یہ کس کی جناب ہے

در حال جناب فاطمہؑ ۱۰۱ بند

جلد چہارم: مجموعۂ صدمات واقعہ یہ ماہ صفر ہے

در حال امام حسنؑ ۱۰۷ بند

جلد پنجم: "یارب مجھے مرقع خلد بریں دکھا" در حال امام حسین ۱۰۹ بند۔

جلد ششم: کربلا کا بھی کیا فیض عام ہے۔

در حال امام زین العابدینؑ ۹۳ بند۔

جلد ہفتم: ہے قصد کچھ فضائل باقر رقم کروں

در حال امام محمد باقرؑ ۳۲۰ بند

جلد ہشتم: جعفر صادقؑ کا رتبہ خلق میں مشہور ہے

در حال امام جعفر صادقؑ ۳۱ بند

جلد نہم: کیا موسیٰ کاظمؑ کے فضائل کا بیان ہو۔

در حال امام موسیٰ کاظمؑ ۳۴ بند

جلد دہم: کیا شاہ خراساں کی زیارت کا شرف ہے

در حال امام رضاؑ ۴۳ بند

جلد یازدہم: جب زہر سے شہید جناب رضا ہوئے

در حال امام محمد تقیؑ ۲۵ بند

جلد دوازدہم: شہید ظلم و ستم ہیں سب وصیائے علیؑ

در حال امام علی نقیؑ ۲۰ بند

جلد سیزدہم: شہرۂ جہاں ہیں حسن عسکریؑ کا ہے

در حال امام حسن عسکریؑ ۲۲ بند

جلد چہاردہم: جب قبل حشر ہوگا ظہور امام عصرؑ

در حال امام عصرؑ ۱۰۹ بند

ان مرثیوں کے متعلق جناب افضل حسین ثابت مرحوم لکھتے ہیں۔

"ان مرثیوں کی تصنیف کی نسبت مرزا ادیب کہتے تھے کہ نواب نادر مرزا فیض آبادی (شاگرد آتش) نے مرزا دبیر کو فیض آباد میں زمانہ شاہی اودھ میں بلوایا تھا یہ بزرگوار خاندان امرائے نیشاپور کے ایک معزز فرد تھے (چودہ ہزار روپے ماہوار وظیفہ پاتے تھے) خود بھی اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے۔ غزل میں آتش کے اور رثیہ میں مرزا دبیر کے شاگرد تھے) انھوں نے مرزا دبیر سے فرمائش کی تھی کہ چودہ معصوموں کے حال میں مجھے مختصر مرثیے کہہ دیجئے کہ ہر معصوم کی وفات کے دن میں مجلس کیا کرتا ہوں۔ پڑھا کروں گا۔ مرزا دبیر جب فیض آباد سے چلے ہیں تو ان نادر مرزا کے چند نوکر ہمرکاب آئے تھے۔ مرزا دبیر پالکی میں آئے تھے۔ راستے میں یہ تمام مرثیے کہتے آئے تھے لکھنؤ آکر جب اُن کے ملازم رخصت ہوئے تو وہ تمام مرثیے مرزا دبیر نے اُن کے ہاتھ نواب نادر مرزا کو بھجوا دیئے۔ از بسکہ یہ مرثیے روزانہ کی مجلس میں بہت جلد و مختصر کہے تھے۔ مرزا دبیر کا ارادہ یہ تھا کہ ہر معصوم کے حال میں ایک ایک مرثیہ طولانی اور مجموعی ہو۔ پنجتن پاک کے حالات میں اس کے بعد چند مرثیے کہے تھے۔ باقی ائمۂ اطہار کے حالات میں پھر مرثیے کہنے کی نوبت نہیں آئی صرف امام موسیٰ کاظمؑ کے حال میں ایک مرثیہ بہت بڑا کہا جو چند مرتبہ مرزا دبیر نے پڑھا اور شائع نہیں ہوا۔ اس مرثیہ کی یہ ٹیپ بہت مشہور ہوئی:۔

مضرت پہ انتہائے اسیری گزر گئی
زندان میں جوانی و پیری گزر گئی

(حیات دبیر جلد اول ص ۲۶)

مرزا دبیر کے مطبوعہ مراثی کے اکثر مطلعے "جب" یا "جو" ایسے الفاظ سے شروع ہوتے ہیں مثلاً لفظ "جب" ایک سو سے زیادہ مراثی کے آغاز میں ہے مثلاً ؎

"جب فاطمہؑ سے عقبہ شہ لاشتی ہوا"

یا ؎ "صبح عاشور نے جب چاک گریبان کیا"

اسی طرح لفظ "جو" تیس سے زیادہ مراثی کے مطلعوں میں آیا ہے۔ مثلاً ؎

"اکبرؑ نے طلب کی جو رضا دشت وغا کی"

کیا عجب ہے کہ آغاز کا یہ اسلوب اُن کے گہرے مطالعۂ قرآن کا نتیجہ ہو جس میں بعض آیات اور سوروں کا آغاز "اذا" کے لفظ سے ہوتا ہے۔ اِذا اور اذا کا ترجمہ "جب" ہوتا ہے۔ مطالعہ قرآن و حدیث نبوی کے گہرے اثرات مرزا دبیر کے اکثر مراثی میں نظر آتے ہیں جن کے مصرعوں میں آیات و احادیث کے ٹکڑے نظم کئے گئے ہیں۔ مثلاً

ع جب ختم کیا سورۃ اللیل تم نے
؎ اے صبح وفا کون ترا شمس ضحیٰ ہے
؎ اے مومنو یعقوب کے بارہ جو پسر تھے
؎ جب نقش "کن" سے زینت لوح بقا ہوئی
؎ شق کیا چاند کو انگشت سے پیغمبر نے
؎ طغرا نویس "کن فیکون" ذوالجلال ہے۔
؎ قرآن سے فضیلت دوز مرجان کی عیاں ہے
؎ ہے عقد کی تاکید احادیث نبیؐ میں
؎ ہوتا ہے عیاں مصحف رب دوسرا سے
؎ یا رب کریم وہ ہے جو وعدہ وفا کرے

(الکریم اذا وعد وفیٰ)

یہ تو صرف چند مطلعے ہیں۔ مرثیے کے چہروں اور مختلف عناصر میں آیات و احادیث کے اشارے ظاہر کرتے ہیں کہ مرزا دبیر کی نظر فنون شاعری کے علاوہ قرآن و تفاسیر و احادیث پر بھی گہری تھی اور اُن کے کلام پر جا بجا ثقالت کا جو الزام لگایا جاتا ہے وہ اُن کے علم اور اُس ماحول کا نتیجہ بھی تھی جس میں مشکل پسندی کے علاوہ علمی اشارے اور قرآن و سنت کے ٹکڑے نظم کرنا ہنرمندی کا تقاضا سمجھا جاتا تھا۔ زیر آید درست جیسے محاورہ کو مرزا دبیر نے آنحضرت کے خاتم المرسلین ہونے کے سلسلے میں یوں استعمال کیا ہے:۔

بعد آئے ہیں پر سب سے نخست آئے ہیں مولا
زیر آئیں نہ کیوں کر کہ درست آئے ہیں مولا

اس عہد کے ماحول اور تقاضائے حال کے علاوہ جب مرزا دبیر سہل ممتنع کی منزل پر آتے ہیں تو یوں گہرافشاں ہوتے ہیں:۔

؎ کیوں عرش کبریا نہ گرا اس گناہ پر
تلوار بوسہ گاہ رسالت پناہ پر
؎ واللہ کہ کچھ بھی نہ تھا اور تھا بھی تو کیا تھا
بس ایک خدا اور دوسرا محبوب خدا تھا
؎ رکھو نہ تمنائے بہشت اور کسی سے
جنت کا تعلق ہے حسین ابن علیؑ سے
؎ تم غم میں مرے نالہ و فریاد کرو گے
اس سال ہمیں حج میں بہت یاد کرو گے
؎ نھی کلائیوں میں تشنج سے بل پڑے
ہچکی جو آئی منہ سے انگوٹھے نکل پڑے
؎ لو ملک امامت کی امیری بھی مبارک
زنداں بھی یتیمی بھی اسیری بھی مبارک
؎ خالق کے سوا دھیان کسی کا نہ رہا تھا
فرزند پیمبر ہمہ تن محو خدا تھا۔
؎ رُخ سے مسافروں کے عیاں حق کا نور تھا

نزدیک تھی بہشت وطن اُن سے نہ چھوٹا

گیارہ برس کی عمر میں مرزا دبیر کے والد مرزا غلام حسین اُن کو میر ضمیر (متوفی ۱۲۷۲ھ ۱۸۵۵ء) کے پاس لے گئے پہلی رباعی جو استاد کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کی اور اُستاد نے اُس میں کوئی تبدیلی نہ کی وہ یہ تھی ؎

کسی کا کندہ نگینے پہ نام ہوتا ہے
کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دنیا کہ جس پر شام و سحر
کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

دبیر کی غزل کا ایک شعر ہے ؎

چمن کی بے ثباتی پر جو اس کا دھیان جاتا ہے
تو کیا روتی ہے شبنم منھ پہ رکھ کے گل کے دامن کو

وعظ و نصیحت اور وہ بھی بادشاہوں کو بڑی ہمت و استغنا کا کام ہے۔ ایک مرتبہ امجد علی شاہ شاہ اودھ کے سامنے مرزا دبیر نے روز قیامت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ؎

جب روز کبریا کی عدالت کا آئے گا
جبار بادشاہوں کو پہلے بلائے گا

اور پھر جب یہ بیت پڑھی ؎

گردوں تڑپے گا پنجۂ محتاج کی طرح
قبروں سے شاہ نکلیں گے محتاج کی طرح

تو امجد علی شاہ کی روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں اور اس مجلس کے بعد انھوں نے "دفع مظالم" کا محکمہ قائم کیا تاکہ اُن کی انتظامیہ سے جو عوام متاثر ہوتے ہوں اور جن کی حق تلفی ہوئی ہو اس کی تلافی کی جائے۔

مرزا دبیر کی شاہان اودھ کے نزدیک کیا عظمت تھی یہ اس واقعے سے بھی معلوم ہوتی ہے جو تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ تیز ہوا سے جو کا شامیانہ اُڑ گیا تو واجد علی شاہ نے منبر کے قریب کھڑے ہو کر خود چتر لگایا اور آخر مجلس تک کھڑے رہے۔

جن لوگوں نے ادب مراثی کا گہرا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اکثر بڑے مرثیہ نگار بعض ایسے مضامین کو جو دوسرے شعرا نے نظم کئے ہیں اُن سے بہتر انداز میں نظم کرنے کی سعی کرتے تھے اور میں نے ایسے باذوق سامعین بھی دیکھے ہیں جو ایک ہی موضوع پر نظم کئے ہوئے متعدد اساتذہ کے صدہا اشعار سناتے تھے اور اس ترتیب کے ساتھ کہ فلاں مرثیہ نگار نے یہ مضمون یوں باندھا ہے اور فلاں نے اس سے بہتر اور فلاں نے اس سے بھی بہتر۔ شان کے طور پر میر انیس اور مرزا دبیر کے دو شعر ایک ہی موضوع پر ہیں جن میں ایک نے دوسرے سے بہتر طریقے سے ادائے مقصد کی سعی کی ہے۔

میر انیس فرماتے ہیں ؎

عالم ہے مکدر کوئی دل صاف نہیں ہے
اس عہد میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے

اور مرزا دبیر فرماتے ہیں :-

انصاف کہاں سے ہو کہ دل صاف نہیں ہے
دل صاف کہاں سے ہو کہ انصاف نہیں ہے

ان دونوں اشعار کی اپنی اپنی خوبیاں اور محاسن ہیں جن کی تفصیل اساتذہ کی زبانی سنی تو اندازہ ہوا کہ فقط ان دو شعروں پر ایک رسالہ لکھا جا سکتا ہے اور بحث کی جائے تو کبھی ایک کا پلہ گراں نظر آئے گا کبھی دوسرے کا۔

"مرزا غالب نے ایسے ہی آثار عظمت
دیکھ کے کہا تھا اور کیا خوب کہا تھا کہ ہندوستان
میں انیس و دبیر جیسا مرثیہ گو نہ ہوا ہے
نہ آئندہ ہوگا۔"

(یادگار غالب)

مختصر حالات زندگی کے بغیر یہ مضمون تشنہ رہ جائے اس لئے ذیل میں مرزا دبیر کی زندگی کی جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں۔

مرزا دبیر ۱۲ جمادی الثانی ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۲ اگست ۱۸۰۳ء کو دہلی کے محلہ بلی ماراں میں پیدا ہوئے۔ ان کے مورث اعلیٰ ملا ہاشم شیرازی کے بھائی تھے۔ اپنی مشق سخن کی وجہ سے عظیم شعراء میں شمار ہوتے ہیں شیراز سے یہ خاندان دہلی آیا۔ ان کے اکثر افراد اولیائے مغلیہ کے دربار سے متعلق رہے۔ ملا رفیع سخا جو مرزا دبیر کے پردادا تھے مغل دربار کے میر منشی تھے جب دہلی اجڑنے لگی تو مرزا دبیر کے والد مرزا غلام حسین نے بلی خاندان کے ساتھ لکھنؤ کا رخ کیا۔ اس وقت مرزا دبیر کی عمر تقریباً سات سال کی تھی مرزا صاحب کی تعلیم لکھنؤ میں ہوئی۔ شاعری کا رجحان دیکھ کے ان کے والد نے ان کو میر ضمیر کی شاگردی میں دے دیا۔ مرزا دبیر کی تعلیم اس عہد کے لحاظ سے بہت بلند تھی اور اردو فارسی اور عربی ادب کے علاوہ زہد عقلی اور نقلی علوم کی تعلیم بھی حاصل کی۔ علم کے علاوہ زہد و تقویٰ اور حسن اخلاق کے زیور سے بھی آراستہ تھے۔ کاشف الحقائق میں شمس العلماء مولانا امداد امام اثر نے ان کی عظمت و فضیلت کے تذکرے میں لکھا ہے "رفتار گفتار کردار سب میں یکتائے وقت تھے"۔ مرزا دبیر کا عقد سید نجف کی نواسی سے ہوا تھا جن سے دو بیٹے مرزا محمد جعفر و مرزا ہادی حسین عطا ہوئے۔ ایک صاحبزادی بھی تھیں جو میر وزیر علی صبا کے فرزند میر بادشاہ علی بقا سے منسوب تھیں۔ نوجوانی ہی میں مرثیہ نگاری میں ان کو وہ شہرت نصیب ہوئی کہ شاہ اودھ غازی الدین حیدر نے ان کو شاہی امام باڑے میں مرثیہ پڑھنے کی دعوت دی۔ نصیر الدین حیدر کا زمانہ آیا تو ان کی شہرت عروج پر تھی اور خود شہزادے اور شہزادیاں ان کی شاگرد ہو چکی تھیں اور رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب، خلیق، فصیح، حسین، گدا سکندر کے ساتھ دبیر کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ (فسانۂ عجائب)

اس کے بعد محمد علی شاہ کا زمانہ آیا۔ مرثیہ گوئی کے آسمان پر ضمیر و دبیر ماہ و مشتری کی طرح چمکنے لگے۔ (یادگار انیس)

اسی عہد میں میر انیس فیض آباد سے لکھنؤ تشریف لے آئے اور ظاہر ہے کہ ان کی کامیابی سے مرزا دبیر کو پہلے سے زیادہ جی لگا کر مرثیہ نگاری کرنا پڑی اور بڑے بڑے شعرا اسی عہد میں ان کے شاگرد ہوئے جن میں منیر، نظیم، قدیر، صغیر، شاد، راسخ جیسے لوگ بھی شامل ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی کے سلسلہ میں جو فساد کی آگ بھڑکی اس نے مرزا دبیر کو لکھنؤ ترک کر کے سیتاپور میں پناہ لینے پر مجبور کیا اور جب وہ واپس آئے تو چمنستان لکھنؤ کی بہار خزاں سے بدل چکی تھی۔ معاشی پریشانیوں سے ہراساں ہو کے وہ کانپور گئے اور پھر امام باندی بیگم کی دعوت پر عظیم آباد جانے لگے اور انہی کے نذرانے پر گذر بسر ہونے لگی۔ آخر عمر میں آنکھیں کمزور ہو گئیں۔ تو معزول شاہ اودھ واجد علی شاہ نے مٹیا برج کلکتہ آنے کی دعوت دی اور ایک خصوصی معالج سے علاج کرایا جس سے بصارت عود کر آئی۔

جولائی ۱۸۷۳ء میں پہلے جوان بیٹے مرزا ہادی حسین عطا کا داغ اٹھایا اور اپریل ۱۸۷۴ء میں بڑے بھائی مرزا نظیر کی وفات ہوئی۔ یہ ماہ صفر ۱۲۹۱ھ کا واقعہ ہے اسی سال شوال کے مہینے میں میر انیس دنیا سے کوچ کر گئے اور بقول مرزا دبیر ان کے دونوں بازو ٹوٹ گئے۔

وا در لیا عینی و دینی دو بازوئیم شکست
بے نظیر اول ز ہم امسال و آخر بے انیس

انیس و دبیر کی باہمی "رزمیوں" کی افسانہ طرازی کرنے والے کاش کبھی اس نظم دبیر کا یہ شعر بھی غور سے پڑھتے ؎

یادگار رفتگاں ہستیم و مہمان جہاں
چند روزہ چند ہفتہ بے برادر بے انیس

ان صدمات نے مرزا دبیر کو بیمار کر دیا۔ دو ماہ کے بعد محرم آ گیا۔ عظیم آباد گئے۔ وہاں علالت میں اضافہ ہو گیا واپس آئے اور ۳ محرم ۱۲۹۲ھ م ۶ مارچ ۱۸۷۵ء کو انتقال فرما گئے اور اپنے مکان مسکونہ میں دفن ہوئے جس کی تصویر اس شمارہ میں شامل ہیں۔

اس سلسلہ میں مرزا دبیر اور اُن کے استاد میر ضمیر میں ناچاقی کی جو روایت آبِ حیات میں شائع ہوئی ہے اور جس کو بلا تحقیق و درایت بعض اور مولفین نے بھی درج کر دیا ہے اور اب تک بعض "مورخین ادب" اس کی نقل کرتے ہیں اُس کی نقاب کشائی ضروری ہے۔ یہ کہنا کہ مرزا دبیر کا ایک مرثیہ اُستاد کو پسند آ گیا تھا اور وہ اُسے اپنے نام سے پڑھنا چاہتے تھے مگر لوگوں کے جھگڑا نے سے وہی مرثیہ جو مرزا دبیر اُستاد کی نذر کر چکے تھے۔ ایک مجلس میں اپنے استاد سے پیش خوانی کرا رہے تھے مرزا دبیر نے پڑھ دیا اور اس پر استاد اور شاگرد کے تعلقات خراب ہو گئے۔ یہ روایت کے خلاف تو ہے ہی مگر صحیح روایت کے بھی خلاف ہے اور اُس میں جائے تعجب اس لئے نہیں کہ یہ تو شعراء کی باتیں ہیں بزرگانِ دین کے متعلق مشہور اور مستند مسلمانوں کی کتب حدیث میں ایسی ایسی روایتیں آ گئی ہیں جن سے مستشرقین اور دشمنانِ اسلام نے اُن کی سیرت کا غلط نقشہ پیش کرنے میں من مانا فائدہ اُٹھایا ہے۔ مرزا دبیر اور میر ضمیر کے شاگرد ہی اور استاد کے تعلقات کی تاریخ نہیں بلکہ لکھنؤ اور مسلم ہندوستان کی تہذیب کا علم رکھنے والے جانتے ہیں کہ یہ خلافِ عقل ہے۔ جب مرثیہ لگانے والے برابر اور اچھے ہوں اور اس کا ایک مرثیہ اُس کا شفیق اُستاد اس سے مانگے اور وہ اُستاد کی نذر بھی کر دے اور پھر عہد خلافی، بدعہدی اور کمظرفی کا ایسا مظاہرہ کرے کیا یہ قرین عقل ہے؟ پھر کم از کم میں تو یہ ماننے کو تیار نہیں کہ ضمیر جیسا کہنہ مشق اور صاحب کمال اُستاد جس نے مرزا دبیر اور میر انیس کو کمال کی راہ دکھائی ہو وہ اپنے شاگرد سے اس کا مرثیہ اس لئے طلب کرے گا کہ اپنے نام سے پڑھے اور سالہا سال کی آزمائش کے بعد بھی شاگرد کی کم ظرفی سے آگاہ نہ ہو۔ اس سلسلہ میں روایت کا تقاضا پورا کیا جائے تو ضمیر کی مدح دبیر میں رباعی دونوں کی عمر کا فرق اور بہت سے حقائق پر گفتگو ضروری ہوگی اس لئے طوالت سے بچنے کے لئے مرزا دبیر کے دوست اور شاگرد میر محمد ضامن ضمیر کے رسالہ "تنقید" آبِ حیات کی روایت کی طرف توجہ کرنی چاہیئے اور دوسرے مستند راویوں کے اقوال کا جائزہ لینا چاہیئے۔

ضمیر مرزا دبیر کے بے تکلف دوست اور شاگرد تھے اور ان کے متعلق "دبستانِ دبیر" ص ۲۴۲ میں لکھا ہے کہ "مشہور ہے کہ مرزا صاحب کا جو مرثیہ پسند آ جاتا ہے تکلف لے جاتے اور اپنا تخلص ڈال کے پڑھ دیا کرتے مرزا صاحب بھی اُن سے انکار کرنا نہیں جانتے تھے اس لئے کہ بچپن کے دوست بھی تھے اور شاگرد بھی۔"

غور طلب یہ بات بھی ہے کہ جو اپنے شاگرد کو ایک متعدد مرثیے عطا کر دیا کرے کیا وہ اپنے اُستاد سے ایک مرثیے کے لئے بخل اور بدعہدی کر سکتا ہے؟

اب اس روایت کی حقیقت یہ ہے کہ میر عابد علی بشیر جو لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور پہلے میر ضمیر کے شاگرد تھے پھر اُستاد کی ہدایت پر مرزا دبیر کو اپنا کلام دکھانے لگے انہی کی سازش سے یہ بات دو شاگردوں میں غلط فہمی پیدا ہوئی جس کو آبِ حیات کی روایت کہا جاتا ہے۔

مرزا دبیر خوش گوئی ہی سے عزت [illegible] آسمان پر [illegible] سے روشن ستارہ بنتے جا رہے تھے جس سے [illegible] نے چاہا کہ وہ اُستاد کی شفقت اور تربیت سے محروم ہو جائیں اور اُن کی اصلاح کے بغیر مرثیے پڑھیں تو ان کے مرثیے میں غرت پڑے۔ میر عابد علی بشیر اس سازش کے سرغنہ تھے اور موقع کی تاک میں تھے۔

۵ رمضان کی انیس، بیس اور اکیس تاریخ کو نواب

افتخار الدولہ بہادر کے ہاں دھوم دھام کی مجلسیں ہوتی تھیں۔ میر ضمیر اور مرزا دبیر پڑھا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ نواب صاحب نے ۱۹ اکتوبر کو یہ فرمائش کی کہ آج کو دونوں بزرگوار نئے مرثیے پڑھیں۔ مرزا دبیر کی زندگی اور شاعری دونوں کا شباب تھا۔ انھوں نے دو دن میں نیا مرثیہ کہہ لیا جس کا مطلع ہے ؎

ذرہ ہے آفتاب زیر تراب کا

استاد نے سنا تو بہت ناراضی ہوئی مگر مرزا دبیر کو جب علم ہوا کہ استاد نے مرثیہ پڑھا نہیں کیا تو ادب سے عرض کیا کہ حضور یہ مرثیہ پڑھ دیں۔ میں صرف چند رباعیاں پڑھ دوں گا۔ میر ضمیر اس سعادت مندی سے خوش ہوئے مگر یہ پسند نہ کیا کہ شاگرد اپنی محنت کی داد سے محروم ہو جائے بڑے اصرار کے بعد میر ضمیر اس پر راضی ہوئے کہ فضائل کا حصہ مرزا دبیر پڑھیں اور مصائب کے بند میر ضمیر۔ مجلس میں مرزا دبیر نے اعلان کیا کہ میں نے نیا مرثیہ نہیں کہا ہے حضرت استاد کے تو تصنیف مرثیے کا ابتدائی حصہ میں پڑھوں گا اور آخری حصہ وہ خود ارشاد فرمائیں گے۔ اس اعلان کے دوران میر عابد علی بشیر نے میر ضمیر سے کہا فضائل کا حصہ بہت پُر زور ہے اگر دبیر نے پڑھا تو مجلس انھی کے ہاتھ میں رہے گی۔ میں اُن کو منع کئے دیتا ہوں کہ مرثیہ نہ پڑھیں۔ میر ضمیر نے منع کیا مگر حضرت بشیر فوراً منبر کے پاس پہنچے اور مرزا دبیر کے کان میں کہا حضرت استاد فرماتے ہیں کہ تم یہ مرثیہ نہ پڑھو کوئی دوسرا مرثیہ پڑھ کے اُتر آؤ۔ مرزا دبیر کو اس بات کا یقین نہیں آیا۔ انھوں نے کہا اگر حضرت استاد خود مجھے اشارہ سے منع کریں تو میں منبر سے اُتر آؤں گا اس لئے کہ اس وقت میرے پاس کوئی اور مرثیہ نہیں ہے۔ بشیر پلٹ کر آئے اور میر ضمیر سے کہا دبیر کہتے ہیں کہ آج ہی تو مجھے اُستاد کا امتحان مقصود ہے دیکھوں میرے پڑھنے کے بعد وہ کیا کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ میر ضمیر یہ بات سُن کر آگ بگولا ہو گئے ادھر مرزا دبیر منبر پر بیٹھے اُستاد کے حکم کے منتظر تھے اُدھر اُستاد سر جھکائے بیٹھے تھے اور مرزا دبیر کے اشارہ کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد مرزا دبیر نے مرثیہ شروع کیا اور اعلان کے مطابق فضائل پڑھ کے اُتر آئے۔ اب میر ضمیر منبر پر گئے اور کہا کہ مرزا دبیر نے جو مرثیہ میرے نام سے پڑھا ہے وہ دراصل خود اُن کا ہے طبیعت براز زختہ و افسردہ تھی کسی پُرانے مرثیے کے چند بند پڑھ کے منبر سے اُتر آئے۔ نواب افتخار الدولہ نے دونوں کے لئے خلعت منگوائے میر ضمیر طیش میں خلعت کی کشتی کو ٹھوکر مار کے اُٹھ گئے۔ مرزا دبیر نے بھی استاد کے احترام میں خلعت سے انکار کر دیا۔ شر پسندوں کو موقع ملا اور اُنھوں نے میر ضمیر کو بدظن کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی مرزا دبیر اُستاد کی خفگی پر حیران و پریشان تھے اور اس سارے کھیل سے لاعلم تھے۔ حقیقت حال معلوم کرنے کی غرض سے استاد کے گھر گئے۔ میر بشیر اور اُن کے ساتھیوں نے اس ڈر سے کہ سازش بے نقاب نہ ہو جائے مرزا دبیر پر طعن و طعن شروع کر دی اور اُستاد سے گفتگو کی نوبت ہی نہیں آئی۔ مرزا دبیر واپس چلے آئے اور اُستاد کی خدمت میں حاضری کا سلسلہ بند کر دیا۔ شر پسند سمجھے کہ اس کے بعد دبیر کا ستارہ زوال کے برج میں آ جائے گا۔ مگر اس کے برعکس اُن کی مقبولیت بڑھتی گئی۔ اسی زمانے میں میر انیس لکھنؤ آئے اور سامعین نے اُن کے ادبی معرکوں سے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ چند سال بعد واجد علی شاہ کا عہد آیا اور ان کے وزیر اعظم حضور عالم نے جو مرزا دبیر کے شاگرد تھے ایک عظیم الشان مجلس کی۔ میر ضمیر بھی تشریف لائے مرزا دبیر نے اپنے مشہور مرثیہ سے

اے عرش بریں تیرے ستاروں کے تصدق

کو شروع کیا اور ہر طرف سے تحسین و آفرین کی صدائیں بلند

ہونے لگیں۔ اچانک مرزا دبیر منبر پر کھڑے ہو گئے اور ہاتھ باندھ کے عرض کی: یہ سب حضرت استاد کا صدقہ ہے۔ اس پر دل استاد کا دل بھر آیا۔ مرزا دبیر منبر سے اُترے تو میر ضمیر نے گلے سے لگا لیا اور اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ وہاں گفتگو میں سازش کا حال کھلا تو میر ضمیر نے میر عابد علی کو گھر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ مگر مرزا دبیر نے استاد سے کہہ سُن کے خطا معاف کرا دی اور خود بھی اُن کو گلے سے لگایا۔

اس کے بعد میر ضمیر نے کئی شاگردوں کے منجملہ میر عابد علی کو بھی مرزا دبیر سے اصلاح لینے کی ہدایت فرمائی۔ اس صحیح روایت کو جو درایت پر بھی پوری اُترتی ہے دبستانِ دبیر میں بھی نقل کیا گیا ہے۔

مرزا دبیر اور اُن کے بیٹے اور پوتے یعنی مرزا اوج اور مرزا محمد طاہر رفیع نے مرثیہ گوئی اور شاعری کی اشاعت میں حصہ لیا اس کا اندازہ ان کے صدہا شاگردوں کی فہرست سے ہوتا ہے جن میں سے اکثر کے مراثی اور احوال کے لئے علیحدہ علیحدہ کتابیں درکار ہیں اور بعض کے متعلق اہلِ قلم نے کتابیں لکھی بھی ہیں۔

صفیر بلگرامی۔ شاد عظیم آبادی شیخ نقیر حسین عظیم منیر شکوہ آبادی سید ظفر مہدی ہیثم جرولی میر بادشاہ علی بقا قدیر دہلوی صفدر نیفی آبادی سید باقر مہدی بلیغ زکی بلگرامی سید گوہر علی مشیر نواب محمد رضا خان رضا رسا اختر لکھنوی شیخ امداد علی عشیر مونس حسین نصیب زیدپوری اور اُن کے باکمال فرزند یونس اکمل اور سخنور حسین دہلوی نواب سلطان بیگم سید اولاد حسین ماہر پھلپری میر محمد رضا ظہیر وہاب حیدرآبادی امام باندی بیگم عفت شہزادی زیب النساء حاجی تاج العلماء فراست زیدپوری میر افضل حسین ثابت سید نظیر الحسن فوق نسیم جرولی مرزا محمد ہادی

رسوا سید اعجاز حسین اعجاز [illegible] سرفراز حسین [illegible]
غلام عباس خاں ناصر زیدپوری نجم آفندی
[illegible] طالب حسین طالب [illegible]

مرزا دبیر نے قدیم جدید افادی اصلاحی انقلابی ہر رنگ میں مرثیے کہے ہیں اور اُردو شاعری کے فروغ میں حصہ لیا ہے جس کو اگر تفصیل کے ساتھ [illegible] جائے تو پتہ چلے گا کہ اور کسی شاعر کے آفتاب کمال نے اتنی کرنیں نہیں پھیلائی ہیں جتنی کہ مرزا دبیر کے [illegible] سارے [illegible] کہ شاید اب لکھنؤ کے کسی اور شاعر کے شعرا نے اتنے مختلف اسالیب اور رنگ پیش کئے ہیں۔ تاریخی روایات کی صحت کا خیال یعنی شاعری کو تاریخ سے ہم آہنگ رکھنے کی سعی، دعاؤں اور سورہ ہائے قرآنی کے مطالب سے مرثیوں کے چہرے کی تشکیل، فلسفیانہ مسئلے پر مرثیے کہنا، مقامی رنگ، ملت کے عروج و زوال کے [illegible] کا اضافہ، اپنے عصر کے اہم اجتماعی حالات نظم کرنا [illegible] اتنے تجربے اس مکتب مرثیہ نگاری کے وابستگان نے کئے ہیں جو شاید کسی اور صنفِ سخن میں ہوئے ہوں۔ میرے اُستاد حضرت ناصر زیدپوری مرحوم نے ۱۹۴۲ء سے قبل کے فسادات صوبہ بہار کے پس منظر میں مسلمانوں کی تباہی کو ایک مرثیہ کا چہرہ قرار دیا تھا اور اُس کا [illegible] اب تک کانوں میں گونجتا ہے ؎

چھلکے ٹھنڈے ہیں مگر دل سے دھواں اُٹھتا ہے
وہ رنگ ہے جس کے موجد مرزا دبیر کے فرزند مرزا اوج ہیں۔ اس مقابلے کا نظری اختتام مرزا اوج اور مرزا محمد رفیع کے تذکرۂ کمال پر ہونا چاہئے مگر ؎

سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

اوج اور رفیع

مرزا دبیر کے فرزند مرزا محمد جعفر اوج جو سید انشاء کے

نواسے تھے ۶ جمادی الاول ۱۲۶۹ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۸۵۳ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور چھیاسٹھ سال کی عمر میں ۲۵ جمادی الثانیہ ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۸ اپریل ۱۹۱۷ء کو انتقال فرمایا اور اپنے والد کے پہلو میں دفن ہوئے (معراج الکلام)

مرزا دبیر نظری شاعر تھے اور والد کی توجہ نے اُن کی فطرت کے جوہر ایسے نکھارے کہ مرزا دبیر کے انتقال کے بعد بائیس سال کی عمری میں اُن کا جو نقشہ دبیر تسلیم کر لیا گیا۔ اودھ اخبار مورخہ ۱۴ اپریل ۱۸۷۵ء کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"۲۳ صفر کو مرزا دبیر کا چہلم ہوا۔ مجلس میں صدہا رئیس اور شہزادے اور امیر اور جمع تھے۔ مرزا دبیر نے رباعیاں نو تصنیف پڑھیں۔ تمام محفل میں وجد کا عالم تھا۔ بعدہٗ تقریر تاریخ وفات پڑھا یہ معلوم ہوتا تھا کہ بعینہٖ مرزا صاحب پڑھ رہے ہیں اس کے بعد حضرت امام زین العابدین کے دربار میں تشریف لے جانے اور حاکم کے انصاف نہ کرنے کا حال پڑھا اس وقت گویا قیامت برپا ہو گئی آخر میں مرثیہ نہ پڑھ سکے۔"

۲۰ اپریل ۱۸۷۵ء کے اودھ اخبار میں زاہدہ میر واجد علی تسخیر کے گھر میں محفل میلاد کی خبر میں مرزا دبیر کے مولود پڑھنے کا حال درج ہے جس کا پہلا بند یہ تھا۔

گردش ہے آج ساغر صہبائے نور کی
نہریں چھلک رہی ہیں شراب طہور کی
عنبر فشاں شمیم ہے گیسوئے حور کی
جھونکے نسیم کے ہیں کہ موجیں سرور کی
روشن زمیں ہے نور رسالتمآب سے
ذرے ملا رہے ہیں نظر آفتاب سے

اس محفل میں میاں عشق اور جناب مونس بھی تشریف فرما تھے اور نہایت تعریف فرمائی اور بقول نامہ نگار ہر شخص کا قول تھا کہ اُن کے کلام میں دونوں رنگ ہیں۔ مرزا دبیر کا بھی اور میر انشاء اللہ خاں کا بھی۔ جس کا آغاز یہ تھا اُس سرزمین چمنستان مرثیہ گوئی کا عروج کیا ہوگا۔ اُس کے پورے اندازے کے لئے تذکروں کی ورق گردانی ضروری ہے۔ نوح ہی میں یعنی ۱۲۹۲ھ میں مرزا دبیر نے "مقیاس الاشعار" تحریر کی جو فن شاعری و عروض و قافیہ و تاریخ گوئی کی بلند معیار کتاب ہے اور بڑے سائز کے ۳۳۶ صفحات پر مشتمل ہے جس کے متعلق داغ دہلوی نے فرمایا کہ "آج علم عروض کا ماہر مرزا دبیر سے بڑھ کر کوئی ہندوستان میں نہیں" (معراج الکلام)

مرزا دبیر شاعری کے مجتہد تھے اُنھوں نے مختلف نئے تجربے بھی کئے اور اُن کے مراثی میں انشا، دبیر اور انیس تینوں کے محاسن ملتے ہیں۔ روایتی علمی رنگ بھی، سہل ممتنع زبان بھی اور خیال آفرینی بھی۔ اُنھوں نے فلسفہ و معقولات کا عنصر بھی مرثیے میں اضافہ کیا اور قومی و اصلاحی رنگ میں بھی مرثیے کہے۔ صحت روایات کی پابندی بھی کی اور فن و قواعد کے التزام پر بھی زور دیا اور روزمرہ شاعری کو بھی آگے بڑھایا۔ صاحب معراج الکلام نے مولانا شبلی نعمانی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "انصاف یہ ہے آج مرزا دبیر سے بڑھ کر نہ کوئی شاعر ہے نہ مرثیہ گو (ص ۱۴) صاحب موازنہ انیس و دبیر کا یہ قول اس لئے بھی اہم ہے کہ دبیر نے شبلی سے یہ کہلوایا کہ اُنھوں نے صنعت مرثیہ نگاری اور شاعری میں وہ مقام حاصل کر لیا ہے جو ارتقائی ہے اور موازنہ سے بلند ہے اور مولانا شبلی نے بھی فوق پر ثابت کر دیا کہ وہ اعتراف کمال میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔

نواب فیاض علی خاں کی دعوت پر مرزا دبیر حیدرآباد دکن گئے اور ریزیڈنسی کے سامنے اُن کے قصر میں مجلسیں پڑھیں جس میں آصف سادس میر محبوب علی خاں نظام حیدرآباد بھی مسلسل سات دن تک شریک ہوئے اور اپنا سلام مرزا دبیر کو دیا کہ وہ اصلاح دے کر پڑھیں اور اثنائے مجلس میں بآواز بلند کہا "مرزا صاحب

آپ واقعی یکتائے فن ہیں میرے والد مرحوم سید نجم الحسن نجم موسوی ان مجلسوں میں شریک تھے اور فرماتے تھے کہ مجلس کے فرش پر جو خصوصی قالین میر محبوب علی خاں کے لئے بچھایا گیا تھا اُس کو انھوں نے چھڑی سے اُلٹ دیا اور چاندنی پر دیگر شرکاء کی طرح بیٹھے اُن کے اس احترام مجلس سے تمام شرکا بہت متاثر ہوئے مرزا اوج اپنے شاگردوں سے محبت بھی کرتے تھے اور اُن کی تربیت سخن پر محنت بھی اس لئے اُن کے شاگردوں نے حیات دبیر، دربار حسینی اور المیزان جیسی گرانقدر تنقیدی کتابیں تصنیف کیں۔ خود مرزا اوج نے ۱۹۰۸ء میں "قواعد حامدیہ" کے نام سے ایک رسالہ لکھا تھا جو اُردو رسم الخط کی اصلاح اور تسہیل سے متعلق تھا۔ انجمن ترقی اردو اور دیگر افراد نے اردو املا میں جو اصلاحیں کی ہیں اُن کا محرک یہی رسالہ تھا اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا اوج زبانوں کے تقابلی علم کے بھی ماہر تھے۔ اُن کے فلسفۂ انبیات کا ایک نمونہ ؎

ہے کہنا یہ مقصد یہ آپ ہی پیدا ہے نہیں کوئی دوسرے خالق کی احتیاج اصلا
ہے اک وجود کی حاجت سو وہ ہے بے نیاز کہاں ہے بل نصوت کی عقل دانا کہاں

نہیں قبول کے تایل کہ عجز قدرت ہو
یہ ہے کمال وحدت میں عین کثرت ہو

شب عاشور کی منظر کشی ؎

وہ رات تھی آغاز شہادت کا سرانجام — برسوں کی تمنا دل عاشق ناکام
جنت کی نہر حوریوں کے دل کا پیغام — دلخواہ دل افروز دلآویز دل آرام
گویا تھی وہ حد خاتمہ صبر و رضا کی
اک رات وہ تھی عمر بہتر شہدا کی

فوج حسینی اور لشکر یزیدی کے دو نبرد آزماؤں کا تقابلی مطالعہ ؎

یہ افواج انکسار وہ شان غرور ہے — وہ نیل سر سے ہے تو یہ آنکھوں کا نور ہے
وہ جان کا وبال یہ دل کا سرور ہے — وہ غول شام کفر تو یہ شمع طور ہے
وہ شبہ کی دلیل یہ دعویٰ یقین کا
تشنہ وہ کفر کا تو یہ تحفہ ہے دین کا

اصلاحی رنگ قومی زبان کی اہمیت :-

پڑھو تم اپنی زباں میں کہ فن کی ہے تسہیل — مترجموں کی ہو محنت ذریعۂ تحصیل
تمہاری منزل مقصود کی یہی ہے سبیل — ہر ایک قوم کے پہلے یہی ہوئے ہیں کفیل
زبان غیر کو پڑھ پڑھ کے دانت کھوتے ہو
یہ تم ترقیوں کے حق میں کانٹے بوتے ہو

غلط نظام تعلیم اور ملائیت پر نقد ؎

غرض تو یہ تھی فضیلت سے بہرہ ور ہوتے — کچھ اپنے دین و شریعت سے بہرہ ور ہوتے
فنون صنعت و تجارت سے بہرہ ور ہوتے — ادب سے خلق سے حکمت سے بہرہ ور ہوتے
مزاح اور مظالم کو یہ سمجھ لیتے
محاسن اور مکارم کو یہ سمجھ لیتے

شہرت پسند ذاکرین پر طنز ؎

ہیں ذاکرین کی مجلس کے رقعے بھی آیا — لکھے ہیں آپ نے اپنے بڑے بڑے القاب
وحید عصر نہیں جن کا شش جہت میں جواب — بلند مرتبہ کیوں شکوہ عرش جناب
پیمبر کا ہیں تو اصلا نہ بیش و پس نہ ترا
خدا یہ آپ کو لکھتے جو دسترس ہوتا

لب مسمہ کی تباہ حالی کا مرثیہ :

وہ کم نصیب کہ سودا ہے خود سری کا نہیں — بڑے بڑوں سے ہے بے عزتی برابری کا ہمیں
نہ کچھ خیال عدو کی تو گری کا ہمیں — نہ کچھ ملال ذرا اپنی بے زری کا ہمیں
وہ بے خرد کہ ہمیں فہم نیک و بد بھی نہیں
حسد بڑا ہے پہ ہم قابل حسد بھی نہیں

آج سے نصف صدی سے بھی زیادہ پہلے مرزا اوج کی یہ ترقی پسندی اور اصلاح طلبی مرثیے کو ہر زمانے سے ہم آہنگ کرنے کی رہنمائی ہے اور یہاں وہ حالی اور انیس کے معنوی ہمعصر بھی معلوم ہوتے ہیں اور ہم عصر بھی۔

مرزا محمد طاہر رفیع

مرزا اوج کے فرزند اور مرزا دبیر کے پوتے تھے ۱۷ رمضان ۱۲۸۳ ہجری مطابق ۴ جنوری ۱۸۶۷ء کو پیدا ہوئے اور مرزا دبیر نے تاریخ کہی ؎

آرام جان مبارک باشد دبیر را

آخر عمر میں بڑے رنج اٹھائے۔ جوان فرزند مرزا ذاکر حسین عرف اغن صاحب کی موت نے کمر توڑ دی اور ۱۳۶۷ھ ۱۹۴۸ء میں انتقال کیا۔ جناب سرفراز حسین خبیر نے تاریخ کہی۔ ع

بزم گردوں بے مسیح و رحلِ منبر بے رفیع

۱۳۶۷ھ

سوداگر کے امام باڑے میں اُن کی سالانہ مجالس کی شان و شوکت کا میں عینی شاہد ہوں۔ مقررہ وقت پر میرے نانا شمس العلماء مولانا ناصر حسین صاحب قبلہ تشریف لائے مجمع تعظیم کے لئے کھڑا ہو جاتا وہ تشریف فرما ہوتے اور مجلس شروع ہو جاتی ان کی آواز کا گرفتہ تھی مگر معلوم ہوتا تھا کہ وہ منبر کے لئے اور منبر ان کے لئے ہے۔ رخصت امام حسینؑ کے وقت بارگاہِ حسینی کی ویرانی ہر مرثیہ گو نے نظم کی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرثیے میں مرزا مخلوط ہر رفیع نے ارباب ذوق اور مرثیہ شناس سامعین کو مخاطب کر کے اس مضمون کا ایک بند پڑھا جس کا آخری مصرعہ یہ تھا ؎

ڈیوڑھی پکارتی ہے کہ زہرا کہاں گئے

تو یہ حال ہوا گویا سامعین دیواروں سے سر ٹکرا رہے تھے۔ ستائش سے بھرپور اثر انگیزی کا وہ منظر الفاظ میں سمونا ناممکن ہے۔ رفیع کو پانچ سال کی عمر میں مرزا دبیر نے پیش خوانی کا شرف عطا کیا تھا۔ مرزا انیس کی تعلیم و تربیت نے اُن کو سلف کا مایۂ ناز خلف بنا دیا۔ عہدِ مرزا دبیر سے اردو شاعری کے جدید زمانہ تک انھوں نے شاعری اور مرثیہ گوئی میں آنے والی تبدیلیاں دیکھیں اور ظاہر ہے کہ انھوں نے اس کو قبول کیا اور مرثیے کا روایتی قالب اور اسلوب کو برقرار رکھتے ہوئے مواد اور مضامین میں جدت اور ندرت پیدا کی۔ امام حسین علیہ السلام کی آخری جنگ کے سلسلے کا

[illegible]

یہ محبت کی ہیں باتیں یہ وفا کے انداز
پئے تسلیم جھکائے ہوئے ہے فرقِ نیاز
اپنے محبوب کی مرضی پہ ہے راضی جانباز
بھرتے ہیں خون میں دم عشق کا بھرنے والے
زندگی جانتے ہیں موت کو مرنے والے

انھوں نے بہار اور ساقی نامہ کو بھی اپنایا اور ثابت کر دیا کہ سلسلہ میر انیس و میر عشق سے اس میدان سے بھی وہ کم نہیں۔ مرزا محمد طاہر رفیع نے ضعداری قائم رکھنے میں دربار رام پور کی ملازمت ترک کر دی۔ چونکہ نواب صاحب عشرۂ محرم کی مجالس بھی ان سے پڑھوانا چاہتے تھے اور وہ اپنے والد اور دادا کی طرح عظیم آباد کی مجالس پڑھنے پر مصر تھے اور آخر کار انھوں نے مالی فوائد پر روایت اور ضعداری کو ترجیح دی اور زمانے کے نامساعد حالات اور پریشانیوں کے باوجود بڑی بے نیازی اور آن بان کی زندگی بسر کی اور یہ حقیقت ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد مرثیہ گوئی کے اسلوب کو برقرار رکھتے ہوئے جدید مراثی کی تخلیق میں مرزا محمد طاہر رفیع کے شاگردوں کا حصہ دوسرے سلسلوں کے شعراء سے کہیں زیادہ ہے۔ اس مقالہ کا اختتام مرزا محمد طاہر رفیع کے اس بند پر کرتا ہوں۔

تجھ سے اے یادِ خدا جان نہ یہ سر ہے عزیز
نہ تو اصغر ہے عزیز اور نہ اکبر ہے عزیز
نہ علم اور نہ علمدار لشکر ہے عزیز
تجھ سے کوئی نہیں شبیرؑ کو بڑھ کر ہے عزیز
تیری سرکار میں سر نذر کو لاتا ہے حسینؑ
تیرے دربار میں اب آپ ہی آتا ہے حسینؑ

مرزا دبیر اور ان کے استاد میر ضمیر سے ملاقاتیں

عظیم آباد پٹنہ کے ایک ادیب نجات حسین خاں نے ۱۸۴۳ء میں لکھنؤ کے مذہبی مقامات کی زیارت اور مسلم الثبوت شعراء سے ملاقات کرنے کے لیے سفر کیا تھا۔ لکھنؤ میں اپنے قیام کے زمانہ کے واقعات انھوں نے ایک روزنامچہ کی شکل میں قلم بند کیے ہیں، اسی روزنامچہ کی بنیاد پر پروفیسر سید حسن صاحب نے ایک مبسوط مضمون قلم بند کیا جو قومی آواز لکھنؤ کی دو قسطوں میں شائع ہوا ہے۔

ہم ۲۲ اگست ۱۹۷۶ء سے مرزا دبیر اور میر ضمیر سے ان کی ملاقات کا حال درج کر رہے ہیں۔

(ایڈیٹر عزادار)

مرزا دبیر کا مرثیہ سننے کے شوق میں نجات حسین خاں ۲۰ مارچ ۱۹۴۳ء کو نواب مرزا صاحب کے ساتھ مولوی محمد مرنا صاحب کے امام باڑے میں حاضر ہوئے، لیکن ان کے پہونچنے کے قبل مرزا دبیر اپنا کلام سنا کر منبر سے نیچے اتر چکے تھے، یہ ایک عام مجلس تھی تقسیم شربت کے بعد نواب مرزا صاحب نے خاں صاحب کا مرزا دبیر سے تعارف کرایا، اس وقت مرزا دبیر منبر کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ خاں صاحب کا بیان ہے۔

"دبیر کا جثہ، سخنی، قامت میانہ اور رنگ سبز مائل بہ سیاہی تھا۔ کاندھے پر سرخ رنگ کا ایک رومال رکھے ہوئے تھے۔"

نواب مرزا صاحب نے خاں صاحب کو دبیر سے ملاتے ہوئے کہا۔

"یہ زیارت تعزیہ و عزاداران و مرثیہ گویان و کملائے عصر و ممتازان دہر کی زیارت کو تشریف لائے ہیں۔"

یہ سن کر دبیر نے خاں صاحب کو نزدیک بلایا اور اپنی قربت سے مفتخر فرمایا۔ اس ملاقات میں کیا باتیں ہوئیں، روزنامچے میں کچھ مرقوم نہیں ہے۔

دوسری مرتبہ خاں صاحب خود مرزا دبیر کے مکان پر مجلس عزا میں شریک ہوئے۔ یہ ایک خاص مجلس تھی اور اس میں دبیر نے اپنا تازہ کلام سنایا۔

خاں صاحب کا بیان ہے کہ مرزا دبیر ہر مہینے کی گیارہویں تاریخ کو اپنے گھر میں مجلس منعقد کرتے تھے اور اس میں نئے نئے مرثیے تحت اللفظ سنایا کرتے تھے اسی مجلس میں انھوں نے اپنے ایک شاگرد متخلص بہ ضمیر کا بھی مرثیہ خود پڑھ کر سنایا اور حاضرین نے خوب خوب داد دی، خاں صاحب کہتے ہیں۔

اگر اس مرثیے میں محض قدرے قلیل اصلاح تھی تو ضمیر نے بہت اچھا مرثیہ لکھا تھا اور یقین ہے کہ استاد کے بعد نام روشن کرے گا بلکہ گمان ہے کہ تھوڑے ہی دنوں میں جس طرح دبیر نے اپنے استاد سے منحرف ہو کر اپنے طور پر ناموری حاصل کی تھی اسی طرح ان کا شاگرد بھی استاد کی پیروی کرے گا۔"

پچیسویں ربیع الثانی ۱۲۵۹ھ ۲۶ مئی ۱۸۴۳ء کو خاں صاحب پھر مرزا دبیر کی مرثیہ خوانی کی مجلس میں شریک ہوئے یہ مجلس امام باڑہ میر باقر میں منعقد ہوئی تھی۔ امامباڑے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

اس کی عمارت نہایت وسیع اور رنگا رنگ محراب دار دیوار گیروں اور انواع تکلفات سے آراستہ تھی۔

تقریباً دس بجے دن کے وقت مرزا دبیر منبر پر تشریف لائے اور ایک طولانی مرثیہ بکمال متانت و بلاغت شہدائے کربلا رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دردناک احوال میں پڑھا اس مرثیے میں انھوں نے تازہ واقعات کا بھی تذکرہ کیا تھا جو ماہ ذی الحجہ ۱۲۵۹ھ میں کربلائے معلّٰی میں پیش آئے تھے۔ مجلس میں حاضرین کی تعداد دو ہزار کے قریب تھی، سب پر گریہ کا عالم طاری تھا۔ خاں صاحب لکھتے ہیں:

"مرزا شاعر ذی طبیعت، فصاحت بیان پر گوئی اور خوش خوانی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے"

میر انیس سے مرثیہ سننے کے لیے نجات حسین خاں ۲۶ ربیع الاول ۱۲۵۹ھ مطابق ۲۷ اپریل ۱۸۴۳ء کو حسن علی خاں کے تعزیے خانے میں گئے یہ مقام ان کی جائے اقامت سے دور تھا لیکن اشتیاق نے راستہ آسان کر دیا۔ مجلس میں مجمع کثیر تھا۔ پہلے ایک شخص نے منبر پر آکر حدیث و فضائل امام بیان کیے پھر انھوں نے بکمال فصاحت و بلاغت و متانت اور نہایت تکلفات شاعری سے آراستہ مرثیہ سنا کر حاضرین میں گریہ و بکا پیدا کیا۔ ہر چہار طرف سے واہ واہ اور سبحان اللہ کی آواز بلند ہوتی رہی۔ خاں صاحب لکھتے ہیں:

انیس کے کلام کی خوبی میں کوئی شبہ نہیں خاندانی شاعر ہیں، آج کل دبیر کے سوا ان کا کوئی نظیر نہیں بلکہ خواص تو انھیں کو ترجیح دیتے ہیں۔

ضمیر، میر ضمیر کا کلام سننے کا خاں صاحب کو زبردست اشتیاق تھا، چنانچہ ۱۱ ربیع الاول ۱۲۵۹ھ، ۱۲ اپریل ۱۸۴۳ء کو وہ حاجی مولانا سید حسن رضا صاحب کے یہاں مجلس میں ضمیر کا کلام سننے کے لیے شریک ہوئے۔ یہ مجلس ہر سیہ خوانی کی تھی۔ حاضرین کا اتنا ہجوم تھا کہ تل دھرنے کی جگہ نہ تھی بہت سے لوگ خیموں کی طنابیں پکڑے کھڑے تھے، مردوں کے علاوہ عورتیں بھی کلام سننے کو آئی تھیں اور ان کے لیے قنات باندھ کر الگ جگہ بنائی گئی تھی۔

اس کے علاوہ آس پاس کے مکانوں کی چھتوں پر بھی بے شمار عورتیں موجود تھیں حاضرین کے لیے پان بھی لائے گئے لیکن بھیڑ کی وجہ سے انھیں ٹھیک سے تقسیم کرنا ممکن نہ تھا، لہٰذا بانٹنے والوں نے گلوریوں کو ہاتھ میں لے کر مجمع میں پھینکنا شروع کیا۔ کسی کو گلوری ملی کسی کو نہ ملی۔ خاں صاحب کو مجمع کے وسط میں جگہ ملی تھی جہاں ایک تخت بچھا ہوا تھا اور اس پر ایک کرسی بچھی ہوئی تھی چار بجے شام کے قریب مرزا دبیر کے استاد میر ضمیر تشریف لائے اور کرسی پر بیٹھے۔ پہلے انھوں نے چند ظریفانہ رباعیاں پڑھیں۔ اسکے بعد اپنا نو تصنیف ہرسیہ پڑھنا شروع کیا۔ مجمع میں ہر طرف نعرہ اور قہقہے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں چار گھنٹے تک یہی کیفیت رہی۔ پھر میر ضمیر نے پڑھنا ختم کیا اور اس کے ساتھ ہی مجلس بھی برخاست ہوئی۔

پانچ دن کے بعد یعنی ۱۶ ربیع الاول کو نجات حسین خاں میر ضمیر کی ملاقات کے لیے ان کے گھر گئے۔ میر ضمیر ان کے ساتھ اخلاق و محبت سے پیش آئے اور ان کے حالات دریافت کیے پھر "زبان ریختہ" میں انھوں نے جو سات بند تصنیف کیے تھے ان میں سے چند خاں صاحب کو سنائے اور وعدہ کیا کہ جمعہ کے دن صبح بیاض خاں صاحب کے یہاں آئیں گے اور مزید کلام سنائیں گے میر ضمیر سے دوبارہ ملاقات ہوئی یا نہیں اور انھوں نے حسب وعدہ (تازہ کلام) سنایا یا نہیں اسکے بارے میں خاں صاحب نے پھر کچھ نہیں لکھا۔ نجات حسین خاں نے ہرسیہ کے الفاظ نہیں لکھے ہیں۔

قابل: سید علی جان قابل، اصلاً عظیم آبادی ہیں لیکن ان کی شاعری کا بیشتر زمانہ لکھنؤ اور کانپور میں گزرا، نواب قدسیہ کے یہاں ملازم تھے نجات حسین خاں کی ان سے پہلی ملاقات ۲۸ صفر ۱۲۵۹ھ کو راستے میں ہو گئی جبکہ خاں صاحب مرزا دبیر کی مجلس مرثیہ خوانی سے واپس آ رہے تھے اسوقت دونوں میں مختصر گفتگو ہوئی لیکن ایک نے دوسرے کے مکان کا پتا نشان پوچھ لیا چنانچہ ۱۵ ربیع الاول کو صبح کے وقت قابل خاں صاحب کے یہاں بغرض ملاقات آئے اور دیر تک بیٹھ کر باتیں کرتے رہے انھوں نے بتایا کہ وہ ناسخ کے شاگرد رشید مرزا مہدی مقبول کے مکان واقع محلہ مفتی گنج میں رہتے ہیں۔

شرف ازل سے جو ازواج مرتضیٰ کو ملا

ذیل کا مرثیہ مرزا دبیر کے مراثی کی جلد نہم میں ۷۷ بند پر مشتمل ہے اور اسی جلد میں ایک دوسرے مطلع سے یہی مرثیہ ۵۷ بند کا ہے جبکہ اس مخطوطہ میں جو ہمارے زیدپور میں موجود ہے یہ مرثیہ ۱۰۱ بند کا ہے۔ اس مرثیہ کا مطلع اولیٰ شرف ازل سے جو ازواج مرتضیٰ کو ملا اور دوسرا مطلع تحریر ان شکست دل رسول خدا ہے مرزا دبیر پر تحقیق و تنقید کرنے والوں اور اصناف سخن سے مرثیہ کا ذوق رکھنے والوں کو اس مرثیہ سے ایک شاہراہ مل سکتی ہے۔ (سید دلشاد حسین زیدپوری)

(جگہ کی تنگی کی وجہ سے ۱۰۱ بندوں میں سے بعض بندوں کو حذف کرنا پڑا ——— ادارہ)

شرف ازل سے جو ازواج مرتضیٰ کو ملا — کہاں وہ مرتبہ ناموس اوصیا کو ملا
جو کچھ شرف تھا وہ سب اشرف النسا کو ملا — ترا جو مرتبہ کو یہ رتبہ نہ آسیا کو ملا
مگر یہ درجہ بھی حصہ میں کس کے آیا ہے
جو بعد فاطمہ ام البنینؑ نے پایا ہے

نہ کیوں بتول کی ہو ہمنشیں یہ عرش وقار — وہ ماں حسینؑ کی یہ مادر علم بردار
کیا حسینؑ کو اُمت پہ فاطمہؑ نے نثار — حسینؑ پر کئے قربان اس نے بیٹے چار
امام فاطمہؑ کے نور عین کو سمجھی
پسر حسینؑ کو آقا حسینؑ کو سمجھی

دم فنا جو علیؑ نے اسے یہ دی تھی خبر — کہ ہوں گے فدیۂ شبیرؑ تیرے چار پسر
وہ اپنے بیٹوں کی تعظیم کرتی تھی اُٹھ کر — پسر جو پوچھتے تھے تم میں فدا ہم پر
نہ کیوں میں فخر کروں فخر والدین ہو تم
غلام فاطمہؑ ہو فدیۂ حسینؑ ہو تم

رہے مدینہ میں جب تک امام ہر دوسرا — مثال فاطمہؑ ام البنین تھی شیدا
گیا جو کوفہ کو فرزند فاطمہ زہراؑ — رہی یہ شام و سحر صرف خدمت صغرا
بنا کے ہاتھ سے اپنے اُسے دوا دیتی
دوا پلا کے شفا کی اُسے دُعا دیتی

شبیہ فاطمہؑ تھی جو حسینؑ کی دختر — یہ بوسہ اس کے کف پا کا لیتی تھی اکثر
بخار سے کف پا گرم دیکھتی تھی اگر — تو اشک گرم سے پاشویہ کرتی تھی رو کر

جو شب کو فاطمہؑ بیمار سویا کرتی تھی
تو مثل شمع یہ بالیں پہ رویا کرتی تھی

مگر وہ پوچھتی تھی ایک ایک سے ہر چند — نہ تھی تھی خبر بادشاہ پست و بلند
گیا تھا لشکر کوفہ بسکہ ظلم پسند — یہاں تو راہ تھی بند اور واں تھا پانی بند
کوئی بھی حال نہ شبیرؑ کا سناتا تھا
نہ آنے پاتا تھا کوئی نہ جانے پاتا تھا

یہاں حسینؑ کا تھا انتظار شام و پگاہ — وہاں حسینؑ پہ یہ تھی جفا معاذ اللہ
سپاہ کشتۂ بیداد اہل بیت تباہ — حرم میں آتش اور دل میں فاطمہؑ کی آہ
بھرے عزیزوں کے داغوں سے سینہ و دل تھے
حسینؑ ایک تھے اور چار لاکھ قاتل تھے

اگرچہ تھے بدن و دل پہ زخم سرتاسر — مگر حسینؑ ہوئے چار زخموں سے مضطر
وہ دو تو زخم بدن پر تھے دو کلیجہ پر — ادھر تو کانپتا تھا جسم اور ادھر کو جگر
یہ چار زخم تھے یا نشتر رگ جاں تھے
دو آشکار تھے یہ زخم اور دو پنہاں تھے

کروں کلیجہ کے دو زخموں کا بیان میں کیا — وہ ایک زخم پسر تھا نہ دے کسی کو خدا
مجھے جانتے ہو زخم دوسرا کیا تھا — وہ داغ مرگ علمدار تھا پیام قضا
تڑپ تڑپ کے ہوا دو دے جگر ٹکڑے
جگر کے بعد ہوئی شاہ کی کمر ٹکڑے

جراحت جگر شاہ کا تو حال سنا — رہے دو زخم بدن ماجرا سنو ان کا
وہ ایک تیر سہ شعبہ تھا جو جبیں پہ لگا — جبیں پہ تیر کا روزن پڑا دم سے سوا
فلک کو دیکھ کے شبیرؑ آہ کرتے تھے
خدا کو درد پر اپنے گواہ کرتے تھے

بیان زخم دگر کیا کروں خدا کی پناہ — سنان ابن انس کی سنان و سینۂ شاہ
وہ اک دغا جب نکل آیا تھا شہ کی پشت سے آہ — ہوا جو درد بہت دل میں بولے بسم اللہ
سنان ابن انس نیزہ کی کشاکش میں
اور ابن فاطمہؑ قبلہ کی سمت کو غش میں

ادھر تو ہوتی تھی پامال دین کی فاش اسام — اُدھر شہیدوں کا اسباب لوٹ رہا تھا تمام
کہیں تو آگ سے جلتے تھے شاہ دیں کے خیام — کہیں لباس حرم لوٹتا تھا لشکر شام

کسی کو نیزہ کسی کو طمانچہ مارتے تھے
حرم حسینؑ کے سب یا علیؑ پکارتے تھے

غرضکہ عصر سے تا وقت شام واویلا — جلے بھی اور لٹے بھی خیام آل عبا
حرم کو لا کے نظر بند ظالموں نے کیا — خوشی کی نوبتیں بجتی تھیں فوج میں ہر جا
مگر یہ آتی تھی آواز شادیانے سے
ہزار حیف اٹھے پنجتن زمانے سے

وہ شب سیاہ تھی مانند روئے شمر بدتر — نہ آسمان پہ تارے تھے نام کو نہ قمر
زمیں کی سیر کریں انجم و قمر کیونکر — حسینؑ بے کفن اور اہل بیت سب بے چادر
سر حسینؑ کا بالائے نیزہ مسکن تھا
شب سیاہ میں یہ ماہتاب روشن تھا

حرم کے پیش نظر ہر طرف تھا گلشن داغ — ادھر جلا ہوا خیمہ ادھر کٹا ہوا باغ
صدائے شمر تھی ہر کام ہو چکا فراغ — چراغ فاطمہؑ گل ہو چکا جلا دیوار
نہ کوئی تذکرۂ دفن شاہ پاک کرو
بس اپنی فوج کے مردے سپرد خاک کرو

ہوئے تھے قتل جو کچھ ساکنان کوفہ و شام — وہ دفن ہو گئے مشعل کی روشنی میں تمام
امام بے کفن و گور اور فوج اسلام — کفن کو پھاڑ رہے تھے رسولؐ خیر انام
وہاں لعینوں کی قبروں پہ تو اٹھ جلا تھا
یہاں شہیدوں کا کوئی نہ رونے والا تھا

محرران شکست دل رسولؐ خدا — خبر شکست سے لکھتے ہیں حال شب کا
بلا کے منشیوں کو ابن سعد نے یہ کہا — کہ فتح نامے لکھو جلد دیر سے کیا
حقیقت اپنی جدال و قتال کی لکھنا
شکست فاتح خیبر کے فعل کی لکھنا

مدینہ و یمن و روم و شام و مصر و حلب — ہوں ملک ملک میں ارسال فتح نامے اب
ہر ایک نامہ میں ہو مندرج یہی مطلب — حسینؑ قتل ہوئے بے ردا ہوئی زینبؑ
نگوں امامت سرور کا تخت و تاج ہوا
جو پوچھو تخت کا مالک یزید آج ہوا

مری طرف سے لکھو عرضداشت بہر یزید — کہ مرے ہوا ترے دشمنوں سے حسینؑ شہید
یہ نذر فتح کی دوں گا سر امام سعید — ہیں چند خورتیں اور لڑکیاں بقید اسیر

تمہیں نے تو علی اصغرؑ کو بھی اماں بخشی
یہ تیرے ہاتھ ہے سیدانیوں کی جاں بخشی

جدا عریضہ لکھو اک برائے ابن زیاد — کہ نام پنجتن اب مٹ گیا مُبارکباد
جو مجھ سے وعدے کئے تھے ذرا وہ رکھیو یاد — کیا ہے میں نے تجھے خوش تو مجھکو کیجیو شاد
نہ لایا دھیان میں خیر النسا کے رونے کو
نہال فاطمہؑ کاٹے نہال ہونے کو

مگر مدینہ کے خط میں مُبالغہ ہو رقم — خیال جنگ سے پہلے یہ ہم کو تھا ہر دم
کہ دو مہینہ لڑیں گے حسینؑ کم سے کم — بہادران عرب ہیں شریک شاہِ اُمم
علیؑ کے سینہ کا ہے زور ان کے سینوں میں
سر حسینؑ کٹے گا کئی مہینوں میں

مگر ہوئی جو لڑائی بروز عاشورا — سحر تھی جمعہ کا دن تھا یہ محرم تھا
نہ دو مہینے لگے اور نہ ایک دن گزرا — شہید لشکر شبیرؑ دوپہر میں ہوا
تمام ظہر تلک شہ کے نورِ عین ہوئے
شہید چار گھڑی دن رہے حسینؑ ہوئے

نمازِ عصر پڑھی کاٹ کر سرِ شبیرؑ — حرم کو لوٹ کے مغرب کی پھر کہی تکبیر
ہماری فوج میں سیدانیاں تو سب ہیں اسیر — خدا کے شیر کا پوتا ہے بستۂ زنجیر
مدد کو اہلِ حرم کی علیؑ نہیں آتے
پکارتے ہیں نبیؐ کو نبیؐ نہیں آتے

غرضکہ نامے کئے منشیوں نے سب ترقیم — لفافے کر کے رکھے پیش ابن سعد لئیم
عمر نے صبح کئے قاصدوں کو سب تقسیم — کمر میں نامے رکھے قاصدوں نے کی تسلیم
خط مدینہ لئے اک شتر سوار چلا
مگر حسینؑ کے ماتم میں اشکبار چلا

گیا مدینہ کی مسجد میں قاصد ناچار — وطن میں آمد قاصد کا غل ہوا اک بار
گھروں سے جانب مسجد چلے صغار و کبار — زباں سے کہتا تھا ہے حسینؑ قاصد زار
نبیؐ کی قبر کا گنبد تمام ہلتا ہے
ستون مسجد خیر الانام ہلتا ہے

کسی نے فاطمہؑ صغرا سے یہ کہا آکر — مبارک آپ کو پردیسیوں کی آئی خبر
ابھی ابھی کوئی آیا ہے شہ کا نامہ بر — رسولؐ پاک کی مسجد میں کھولتا ہے کمر

خدا نے چاہا تو اکبرؑ بھی یونہی آتے ہیں
خبر حسینؑ کی سب پوچھنے کو جاتے ہیں

یہ حال سنتے ہی اٹھ بیٹھی خود وہ آزادی — کہا بس اب ہوئی صحت گئی یہ بیماری
میں آج سمجھی کہ میں بھی پدر کی ہوں پیاری — یہ خالی آیا ہے یا ساتھ ہے کچھ اسواری
خدا کرے کہ سواری بھی ساتھ لایا ہو
ہو بیاہ ابن حسنؑ کا ہمیں بلایا ہو

وہ بولی یہ نہیں دریافت جو میں عرض کروں — کسی کو بھیجئے پوچھ آئے نامہ کا مضموں
پکاریں حضرت ام البنیں میں جاتی ہوں — کہا یہ فاطمہ صغرا نے میں بھی ساتھ چلوں
وہ بولی داری جلا تم میں اتنی طاقت ہے
میں پوچھ آتی ہوں بابا ترا سلامت ہے

یہ کہہ کے اوڑھ لی چادر اٹھایا اپنا عصا — روانہ ہوئی طرف مسجد رسول خدا
زنان ہاشمیہ ساتھ تھیں برہنہ پا — قریب پہونچیں جو مسجد کے دیکھتی ہیں کیا
وہ کون شخص ہے جس کا کہ حال غیر نہیں
پکاری خیر ہو پردیسیوں کی خیر نہیں

ابھی وہ خط لئے منبر پہ نامہ بر تھا گیا — پڑھا تھا ایک ہی فقرہ کہ حشر تھا برپا
کہ ناگہاں در مسجد سے غلغلہ یہ اٹھا — عزیز دادہ دوا تی ہے ثانی زہرا
زنان ہاشمیہ نے جو اہتمام کیا
تو نامہ بر نے بھی تعظیم کی سلام کیا

عصا پہ ہاتھ کو رکھ کر کھڑی ہوئی وہ آہ — کہا کہ بھائی یہ خط پیچھے پڑھیو خاطر خواہ
زباں سے پہلے یہ کہدے کہ خیر سے ہیں شاہ — وہ رو کے کہنے لگا لا الہ الا اللہ
بہت حسینؑ کی عاشق ہو اور شیدا ہو
مگر جہاں میں اب تم بجائے زہرا ہو

پکاری وہ کہ بھلا میں کہاں بتولؑ کہاں — میں خادمہ ہوں وہ مخدومہ زمین و زماں
جو پوچھا اسم شریف آپ نے کیا یہ بیاں — علیؑ کی بیوہ ہوں عباسؑ نامدار کی ماں
ابھی نہ ماں ہوں میں اس کی نہ وہ پسر میرا
جو کچھ حسینؑ کے کام آئے ہے جگر میرا

ہے بات کرنا بھی نامحرموں سے مجھکو عار — علیؑ کی لونڈیوں کا یہ چلن نہیں زنہار
مجھے حسینؑ کی الفت نے کر دیا ناچار — نکل پڑی میں ردا اوڑھ کر سر بازار

خبر حسینؑ کی کہہ آرزو میں ہوں جس کی
قرار دل کو نہیں جستجو میں ہوں جس کی

میں ہول کھاتی ہوں بھائی تو ہو گریباں چاک — بہ شکل ماتمیاں سر پہ ڈالے ہے تو خاک
وہ بولا کم ہے جو کچھ غم کروں میں اے غمناک — ہوئی حسینؑ پہ بیداد لشکر سفاک
جگر جو سنگ کا فولاد کی زبان ہوئے
تو ایک پیاس کا اُس پیاسے کی بیان ہوئے

پکاری مادر عباسؑ جان کی تو ہے خیر — وہ بولا کہتا ہوں ٹھہرا لوں دل کو حال ہو غیر
وہ بیکسی وہ غریبی وہ قتل گاہ کی سیر — نہ میسرہ پہ حبیب اور نہ میمنہ پہ زہیر
نگاہ کرتے تھے دریا کو پیاس سے شبیرؑ
زبان چاٹتے تھے اپنی پیاس سے شبیرؑ

وہ لاکھ خنجر خونخوار اور ایک حسینؑ — زمانہ سر کا خریدار اور ایک حسینؑ
ہزاروں تیر جفا کا دار اور ایک حسینؑ — ہجوم صدمہ و آزار اور ایک حسینؑ
نہ ایک پانی کا قطرہ دیا ہے اعدا نے
جسے پلائی تھی بتیس دھار زہرا نے

میں کون کون سے صدمے سناؤں اے غمناک — نہ تھا کوئی کہ جو تھامے رکاب سید پاک
بہن حسینؑ کی خیمہ سے نکلی دامن چاک — وہ دونوں ہاتھوں سے بالوں پہ ڈالتی تھی خاک
عدو کی فوج میں اُس وقت دُکھ دیا سب نے
جب اپنے بھائی کی تھامی رکاب زینبؑ نے

یہ اُس کا کہنا کہ ام البنین کو رعشہ ہوا — پکاری غصہ سے عباسؑ کو ہوا کیا تھا
رکاب تھامنے کو ننگ و عار کچھ سمجھا — یہاں اُٹھاتا تھا نعلین سید الشہدا
غرور کی تو مرے نسل میں نہ عادت تھی
رکاب تھامنا تو فخر تھا سعادت تھی

پکاری سوئے نجف مڑ کے یا علیؑ فریاد — لو خوب آپ کے عباسؑ نے کیا دل شاد
اسی کو اہل وفا آپ کرتے تھے ارشاد — حقوق پالنے کے میرے کر دیئے برباد
کچھ آپ سنتے ہیں یہ نامہ بر جو کہتا ہے
غلام خدمت آقا میں یوں ہی رہتا ہے

وہ نامہ بر یہ پکارا سنیں تو آپ ذرا — خدا گواہ کہ عباسؑ پر ہے ختم وفا
یہ دوپہر کی سواری کا میں نے ذکر کیا — سوار ہونے لگے تھے جو صبح کو آقا

علم تھا طبل تھا جھرائی تھے سواری میں
تھا دا نعل تھا حاضر رکا بداری میں

عنان کو تھامے ہوئے اکبرِ خجستہ خصال — چچا کے فرق پہ قاسم ہلاتے تھے رومال
جلو میں فوجِ حسینی تھی پشت پر اقبال — سحر کو تو یہ تجمل تھا اور وقت زوال
نہ لشکر ہے نہ سپاہ ہے نہ کثرت الناس ہے
نہ قاسمؑ نہ علیؑ اکبر ہے نہ عباسؑ ہے

وداع ہو کے نبیؐ زادیوں سے وہ مولا — کھڑا تھا ڈیوڑھی پہ تنہا وہ بیکس و تنہا
رکاب تھامنے کو تھا نہ کوئی واویلا — حسینؑ دیکھتے تھے سوئے مقتل و دریا
بلاتے تھے علی اکبرؑ کو اور روتے تھے
پکارتے تھے برادر کو اور روتے تھے

نہ کر تو شکوۂ عباسؑ اے حمیدہ صفات — رکاب تھامے وہ کیونکر کٹے ہوں جس کے ہات
پڑا تھا بے کفن و گور وہ کنارِ فرات — صدا یہ لاش سے آتی تھی اے شہِ خوشذات
جو ہو رضا یہ شہنشاہ کربلائی کی
رکاب تھاموں کٹے ہاتھوں سے میں بھائی کی

حرم پہ قرق جو پانی کا ساتویں سے ہوا — نویں کو چاہِ کنوئیں کھودے اس نے خود تنہا
بنا وہ دسویں کو بانیِ سکینہؑ کا سقا — ملا نہ پیاسوں کو پانی قصور اس کا کیا
امید زندگی شاہ بحر و بر ٹوٹی
اُدھر دم اس کا اِدھر شاہ کی کمر ٹوٹی

یہ سن کے خوش ہوئیں ام البنین اور یہ کہا — یہ ہیں ہے یا کہ تفاوت ہے کچھ قسم تو کھا
وہ بولا جیسی قسم چاہو مجھ سے لو بخدا — دروغ گو نہیں قاصد ہوں میں شہیدوں کا
جو کچھ میں کہتا ہوں تجھ دل ملول کے آگے
خدا کے آگے کہوں اور رسولؐ کے آگے

دیا تھا شمر نے اس کو پیامِ سالاری — نہ ترک اس نے کی شبیرؑ کی علمداری
تمہارے لال پہ جب حالِ نزع تھا طاری — تو اس نے شہ سے یہ پوچھا بہ منت و زاری
ہوئے غلام سے یا شاہ کربلا راضی
حسینؑ بولے میں راضی مرا خدا راضی

سجود شکر بجا لائی پھر تو وہ بے آس — کہا میں خوش ہوئی عباسؑ آفریں عباسؑ
تمہاری قبر رہے سر دشہ کے رتبہ شناس — خدا ہو میوۂ طوبیٰ تو خلعتِ ہو میں لباس

بہشت میں غم محشر سے بے ہراس رہو
غلام سبط نبیؐ ہو انھیں کے پاس رہو

میں شرخود ہوئی شبیر کے تو کام آیا — جو کچھ کہ تم پہ مرا حق تھا میں نے بھر پایا
ہزار شکر یہ مژدہ خدا نے سنوایا — علیؑ کی پوتی کا سقہ بنا مرا جایا
خدا گواہ کہ تم نے مجھے نہال کیا
لو اپنا دودھ بھی ماں نے تمھیں حلال کیا

کیا خطاب یہ قاصد سے تب بہ حال تباہ — لے اب سنا خبر بادشاہ عرش پناہ
وہ بولا حال سنو اپنے تین بیٹوں کا آہ — گیا جہاں سے پُر ارمان تیرا عبد اللہ
غریب مر گیا برچھی کلیجہ پر کھا کے
وہ بولی صدقے کلیجہ پہ ابن زہراؑ کے

خبر حسینؑ کی اب دے مجھے برائے حسینؑ — وہ بولا خون بھی تیرا ہوا فدائے حسینؑ
پکاری وہ کہ یہ قربان خاکپائے حسینؑ — سعادت اُس کی تھی اب کہہ تو ماجرائے حسینؑ
وہ بولا خون میں جعفر بھی تیرا لال ہوا
گلا بھی کٹ گیا لاشہ بھی پائمال ہوا

یہ بات سُن کے ہوئی غصہ زوجۂ حیدرؑ — کہا سوال دگر قاصدا جواب دگر
میں تجھ سے پوچھتی ہوں ابن فاطمہؑ کی خبر — تو حال عون کا کہتا ہے قصۂ جعفر
میں کون بیٹوں کی ماں اور کس کے چار پسر
فدا حسینؑ پہ ایسے مرے ہزار پسر

جگر پہ مار کے ہاتھ اپنا نامہ بر نے کہا — جو حال سننا ہو بی بی حسینؑ بیکس کا
تو اب کھڑی نہ رہو بیٹھ جاؤ رکھ دو عصا — زنان ہاشمیہ کو بٹھاؤ گرد ذرا
کلیجہ تھام لو تم اپنا دونوں ہاتھوں سے
کہ اب غش آئے گا یاں سب کو میری باتوں سے

علیؑ کی زوجہ کو حلقہ میں بی بیوں نے لیا — اور ان کو گود میں سب لے کے بیٹھیں واویلا
ہر اک کو فکر تھی یارب کہے گا قاصد کیا — عمامہ قاصد مغموم نے بھی پھینک دیا
طمانچے منھ پہ لگا مارنے برائے حسینؑ
زمیں پہ گر پڑا منبر سے کہہ کے ہائے حسینؑ

اوڑا کے خاک کہا اے ضعیفہ ہو آگاہ — ہزاروں چھ صد و پنجاہ زخم اک تن شاہ
اور ایک حلق پہ ہفتاد زخم خنجر آہ — چڑھا حسینؑ کے سینہ پہ قاتل بدخواہ

سزا ہم تو اُس بدگمان نے کاٹا
غضب ہے ہاتھوں کو پھر ساربان نے کاٹا

یہ سُن کے غش ہوئی اُم البنین عالیجاہ — اُٹھا یہ شور کہ فریاد یا رسولؐ اللہ
ہوا جو غش سے افاقہ علیؑ کی زوجہ کو آہ — تو پوچھا حال سے زینبؑ کے بھی تو ہو آگاہ
وہ ساتھ مر گئی بھائی کے یا اسیر ہوئی
دیا حسینؑ کے مرقد پہ وہ فقیر ہوئی

سر اپنا پیٹ کے وہ نامہ بر یہ چلّایا — حسینؑ نے تو کفن بھی ابھی نہیں پایا
دسوگل زادیوں پہ سخت حادثہ آیا — برہنہ سر ہیں اُٹھا جب سے بھائی کا سایا
گلے میں طوق ہے عابدؑ کے شدت تپ میں
ہیں زخم نیزوں کی نوکوں کے پشت زینبؑ میں

قدم اٹھا نہیں سکتا ہے ضعف سے سجادؑ — زمیں پہ گرتا ہے ہر دم وہ بیکس و ناشاد
سیاہ شام یہ اُس وقت کرتی ہے بیداد — سناں چبھوتے ہیں آ آ کے تن میں سب جلّاد
ہر ایک صدمہ پہ صدمہ اُسے دکھاتا ہے
کسی کو رحم نہیں ناتواں پہ آتا ہے

پکاری چیخ کے اُم البنین جادو کو — ہے خاک پر وہ پہ بے پردہ جبکہ زینبؑ ہو
زنانِ ہاشمیہ سے کہا یہ پھر رو رو — مرا حسینؑ بھی بن ماں کا بیٹا ہے لو گو
بتاؤ سوگ میں بیٹے کے ماں ہے کیا کرتی
بتول ہوتی تو کس طرح سے عزا کرتی

زنانِ ہاشمیہ سُن کے یہ اُٹھیں غمناک — ملی کسی نے تو اُم البنین کے منہ پر خاک
کیا کسی نے گریبان اس غریب کا چاک — لے آئی گھر سے کوئی اپنے ماتمی پوشاک
خبر یہ اتنے میں پہونچی یہاں یہ ماتم ہے
وہاں حسینؑ کی بیٹی کا ہونٹوں پر دم ہے

پڑی تھی ڈیوڑھی پہ بے ہوش فاطمہ صغرا — یہ سُن کے گھر کو چلی خاک اُڑاتی وہ دُکھیا
سر اپنا پیٹتا قاصد بھی ساتھ ساتھ چلا — یہاں مریض کی آنکھیں تھیں سوئے مسجد وا
ہوائی اوڑتی تھی چہرہ پہ تھرتھراتی تھی
کبھی کھڑی تو کبھی در پہ بیٹھ جاتی تھی

یہ دیکھا دور سے صغرا نے اتنے میں ناگاہ — کہ روتی آتی ہیں اُم البنین عالیجاہ
جبیں پہ خاک ملے ایک شخص ہے ہمراہ — ہے سب میں مل کر یہی قاصد حسینؑ ہمراہ

خبر حسینؑ کے مرنے کی آج آئی ہے
دوہائی ہے شہ لولاک کی دوہائی ہے

پکاری فاطمہ صغرا بتاؤ دادی جان
ہے خیر ہے مرا پردیسی باپ اور مری ماں
وہ بولی خیر کہاں گھر کا گھر ہوا ویران
سفر میں لٹ گیا بالکل علیؑ کا نام و نشان
تو چھوٹی باپ سے اور میں پسر سے چھوٹ گئی
ہماری اور تری آس آج ٹوٹ گئی

قریب آن کے قاصد نے بھی کیا مجرا
اٹھا کے لایا تھا جو خاک مشہد شہدا
وہ خاک سرخ دی صغرا کو اور یہ رو کے کہا
ترا مسیح ہوا قتل پہونچی خاک شفا
لگاؤ آنکھوں سے یہ خاک پاک ہے صغرا
ابوتراب کے بیٹے کی خاک ہے صغرا

یہ کہہ کے سونگھی جو وہ خاک قتل گاہ حسینؑ
سر اپنا خاک پہ دے پٹکا ہو گئی بے چین
منھ اپنا ڈھانپ کے کرتی تھی وہ یہ رو کر بین
اور آس پاس تھیں ہمجولیاں بہ شیون و شین
زنان ہاشمیہ رو رو رہی تھیں چلا کے
بپا قیامت کبرا تھی گھر میں صغرا کے

یہ نوحہ کرتی تھی رو رو کے بے پدر صغرا
میں کس کے آنے کے اب دن گنوں گی اے بابا
میں کس کی پوچھوں گی اب خیر و عافیت مولا
مجھے بھی پاس بلا لو سکینہؑ کا صدقا
مریض بیٹی سے ہر طرح منھ کو موڑ گئے
گئے تو چھوڑ گئے اب تو آس توڑ گئے

یہ کیا ستم ہے کہ اب تک تمھیں کفن نہ ملا
تمھارا مردہ اور اس قابل آہ و واویلا
سر آپ کا ہے سناں پر زمیں پہ تن ہے پڑا
تمھاری لاش کے صدقے تمھارے سر کے فدا
تمھارے حلق پہ شمشیر بیدریغ چلی
میں اس گلے کے تصدق کہ جس پہ تیغ چلی

نثار آپ کی اس بیکسی پہ ہو صغرا
نہ تین روز تھیں ایک قطرہ آب ملا
اور اس پہ آہ یہ کی بے حیا نے جور و جفا
گلوئے خشک کو ظالم نے تیغ سے کاٹا
ہزار حیف یہ صدمہ اٹھایا حضرتؑ نے
کہ مرتے مرتے نہ پانی بھی پایا حضرتؑ نے

جوانا مرگ برادر مرے علی اکبرؑ
تمھاری مرگ جوانی پہ صدقے یہ خواہر
صغیر بھائی مرے بے زباں علی اصغرؑ
بہن نثار ہو ننھے سے تیرے لاشہ پر

کہاں سے چھوٹی سی میت تمہاری پاؤں میں
کہ سہرہ باندھ کے گہوارہ میں جھلاؤں میں

یہ بین کرتے ہی وحشت ہوئی جو اس کو سوا — سر اپنا پیٹتی باہر کو دوڑی ننگے پا
لپٹ کے دادی پکاری کدھر کدھر صغرا — وہ بولی رو کے میں جاتی ہوں سوئے کرب و بلا
نہ روکو صاحبو جنگل کی خاک اڑانے دو
پدر کے لاشہ پہ جاتی ہوں مجھکو جانے دو

میں جا کے دیکھوں گی لاش امام نیک خصال — سنا ہے خاک پہ صغرا پڑے ہیں خون میں لال
میں چھوٹے بھائی کے سلجھاؤں گی جھنڈولے بال — اسیر کنبہ کا پوچھوں گی قید میں احوال
نہ جب تلک شہ مظلوم دفن ہو لیں گے
ہم اپنے باپ کے لاشہ پہ رو لیں گے

پکاری مادر سلمہ سنو تو اے صغرا — ہوئے ہیں دن کئی میں نے یہ خواب میں دیکھا
کہ نکلی ایک کفن لے کے قبر سے زہرا — پکاری میں کہ یہ کیا حال ہے تو رو کے کہا
حسین مر گیا دنیا سے خاک اڑاتی ہوں
اب اس کی لاش کو میں دفن کرنے جاتی ہوں

مزار فاطمہ سے آئی یہ صدا ناگاہ — کہ اے حسین مسافر کے رونے والو واہ
حسین کے لئے روتے ہو بیٹی کے ہمراہ — میں کیا حسین کی کوئی نہیں ہوں لوگو آہ
دیا نہ مجھکو مرے نور عین کا پرسا
میں بیٹی ہوتی تو دیتی حسین کا پرسا

سخی یہ جبکہ فغان بتول نیک صفات — کہی مریض نے سب لڑکیوں سے رو کے یہ بات
سکینہ ہوتی وہ بابا کو روتی میرے ساتھ — چلو بتول کے مرقد پہ تھام لو مرا ہاتھ
اب ان کو جا کے ہم ان کے پسر کا پرسا دیں
مریض پوتی کو دادی پدر کا پرسا دیں

یہ سن کے اور بھی مضطر ہوئی وہ زار و حزیں — دبیر ناطقہ کو طاقت کلام نہیں
دعا یہ مانگ کہ اے رب آسمان و زمین — سوا ہو روز بروز اوج ماتم شہ دیں

ہمارا ہاتھ ہو اور شاہدیں کا ماتم ہو
ہمارا دل ہو اور ابن بتول کا غم ہو

سلام

جناب مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہ

حشر میں جوہری اشک عزا داد ملے
ایک اک اشک کے بدلے در شہوار ملے

شیر خاتون قیامت کی جسے دھاد ملے
مجرئ قہر ہے اُس حلق سے تلوار ملے

متفق حُبِّ علیؑ پر ہوں جو سب اہلِ جہاں
ایک بھی پھر نہ قیامت میں گنہگار ملے

حشر میں نذرِ غمِ شاہ کا لا ہو اخوب
جس نے یاں اشک دیئے واں در شہوار ملے

حالِ صغرا نے جو پوچھا تو یہ زینبؑ نے کہا
دکھ پہ دکھ غم پہ غم آزاد پہ آزاد ملے

دی جگہ آبلوں میں تا نہ خلش غیر کو ہو
پائے سجادؑ کو رستے میں جہاں خار ملے

یوں تو ایک ایک سے رخصت ہوئے مل مل کے حسینؑ
پر سکینہؑ کے گلے رو رو کے کئی بار ملے

بولے سجادؑ سپاہِ پسرِ حیدرؑ کو
جام کوثر کے ملے خلد کے گلزار ملے

شکوہ لازم نہیں مقسوم پہ اپنا اپنا
بیڑیاں ہم کو ملیں طوق ملا خار ملے

بانو کہتی تھیں تیرا فاتحہ دلواؤں گی
دودھ کے کوزے جنے اصغرِ دلدار ملے

لاشِ اکبرؑ پہ یہ چلاتے تھے رو رو کے حسینؑ
ہو نہ بینائی تو کیا لذتِ دیدار ملے

شام تک راہ میں عابدؑ کو تمنا تھی یہی
دم میں لے لوں جو کہیں سایہ دیوار ملے

کیوں نہ گل چاک گریباں ہوں زمیں سے پیدا
خاک میں فاطمہ زہراؑ کا جو گلزار ملے

شہ سے صغرا نے کہا یہ دمِ تسلیم و وداع
جیتے جی خاک میں اے کاش یہ بیمار ملے

لونڈیوں کو بھی لیا قبلۂ حاجات نے ساتھ
اک ہمیں دردِ جدائی کے سزاوار ملے

دی دعا ماں نے یہ عباسؑ کو ہنگامِ سفر
جا تجھے مرتبہ جعفرِ طیار ملے

روتی ہیں گنجِ شہیداں میں یہ کہہ کر زہراؑ
ہیں اسی خاک میں میرے دُرِ شہوار ملے

اب تلک تربتِ صغرا سے یہ آتی ہے ندا
ایسے بچھڑے کہ نہ پھر سیدِ ابرار ملے

ذرۂ خاکِ اجل کے لئے پاؤں جو دبیر
آنکھ کھل جائے کہ اب طالعِ بیدار ملے

نوحہ جات

مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہ

مجرائی کہا شاہ نے یارا نہیں اصغر
چھوڑیں تمھیں جنگل میں گوارا نہیں اصغر

عباس ہوئے قتل سدھارے علی اکبر
تم بھی گئے اب کوئی ہمارا نہیں اصغر

گہوارے میں گھر جا کے جو میت کو لٹایا
ماں بولی کہ اب ضبط کا یارا نہیں اصغر

اے لال مرے کس کی نظر لگ گئی تم کو
دنیا کا جو اب تم کو نظارہ نہیں اصغر

میت کو بھی چھاتی سے لگائے ہوئے رکھوں
پر زندوں میں مردے کا گزارا نہیں اصغر

بیکس کہوں، شہ کہوں، یا بے کفن اے لال
نام اتنے ہیں اک نام تمھارا نہیں اصغر

پھر لاش کو لپٹا کے کلیجے سے یہ بولیں
واللہ ترا ہجر گوارا نہیں اصغر

ظالم نے کلیجے پہ مرے تیغ پھرائی
یہ تیر گلے پر ترے مارا نہیں اصغر

کیا جھولا جھلاؤں تمھیں ہو خواب اجل میں
تابوت ہے گہوارہ تمھارا نہیں اصغر

نے دودھ بڑھایا نہ تری سالگرہ کی
ٹھلا کوئی ارمان ہمارا نہیں اصغر

کرنا نہ گلہ تیرے ماں نے نہ بچایا
کیا میرا گنہ تم نے پکارا نہیں اصغر

پانی کو ترستا ہوا بے شیر جہاں سے
تم سا کوئی کم عمر سدھارا نہیں اصغر

نہلاؤں تری چھوٹی سی میت کو میں کیونکر
کوثر کا تو نزدیک کنارا نہیں اصغر

ناگاہ صدا فاطمہ زہرا کی یہ آئی
کیا تیرے برابر مجھے پیارا نہیں اصغر

تھا درد یہ بانو کا دبیر جگر افگار
تم مر گئے اب کوئی ہمارا نہیں اصغر

بتول کہتی ہے رو کر سدا حسین حسین

کہے نہ مجرئی کیوں دائما حسین حسین
بتول کہتی ہے رو کر سدا حسین حسین

ہر اک مرض کی سلامی دوا حسین حسین
برائے دیدۂ حق بیں ضیا حسین حسین

کہے جو مجرئی وقت فنا حسین حسین
صدا امزاد سے نکلے سدا حسین حسین

نسیم غنچہ تسنیم زیب باغ نعیم
حواس خمسہ زہرا قرار شیر خدا
ہر اک نبی نے کیا ورد پنجتن کا نام
نہ پوچھو حلت اصغر کا حال اے یارو
زبان دل سے بوقت فنا بھی اصغر نے
یہ اپنی بیوہ کو عباس نے وصیت کی
مرا شہید مرا بے گنہ مرا سید
کہے یہ فاطمہ زہرا نے بین آ کے مقتل میں
پڑا ہے بے کفن و بے نماز میت آہ
کہوں میں بے کفن اس کو کہ بے وطن یارب

ہوا گلشن صبر و رضا حسین حسین
امام خامس آل عبا حسین حسین
بہت سا رویا مگر جب کہا حسین حسین
کہ کیسے پیارے اس نے کہا حسین حسین
بجائے سورۂ یٰسین سنا حسین حسین
تو ورد کیجو صبح و مسا حسین حسین
مرا امام مرا مقتدا حسین حسین
کہاں پڑا ہے مرا دلربا حسین حسین
غریب و بے کس و بے آشنا حسین حسین
شہید کہہ کے اسے روؤں یا حسین حسین

دبیر خوف سوال و جواب پھر کیا ہو
جواب لے میں گر ہو لکھا حسین حسین

نوحہ در حال حضرت علی اکبرؑ

(ماں کی زبانی)

کہا یہ تو نے میں قربان میرے نامراد اکبرؑ
کہاں ڈھونڈوں کدھر جاؤں کہاں سے تم کو لے آؤں
دلھن اب کس کی لاؤں گی کسے دولھا بناؤں گی
جبیں پر خون انگوٹھی منھ میں پھل برچھی کا سینے میں
جہاں میں یاد فرماؤ نہ دردماں کو پھراؤ
جگر پر ہاتھ دھرتے ہو تڑپ کر آہ بھرتے ہو
اٹھو ہاتھوں کو پھیلاؤ انھوں سے لپٹ جاؤ
جو مرضی ہو جوانان وطن کو یاں بلا بھیجو
دبیر اک حشر تھا برپا یہی بانو کی زاری تھی

جوانی میں ہوئے بیجان میرے نامراد اکبرؑ
چھوبھی کے دل پدر کی جان میرے نامراد اکبرؑ
مرے بن بیاہے پر ارمان میرے نامراد اکبرؑ
نہ بھولے گی کبھی یہ شان میرے نامراد اکبرؑ
مری مشکل کرو آسان میرے نامراد اکبرؑ
یہاں برچھی ہے یا پیکان میرے نامراد اکبرؑ
غریبوں پر کرو احسان میرے نامراد اکبرؑ
سوم کو سب پڑھیں قرآن میرے نامراد اکبرؑ
مرے غازی مرے ذیشان میرے نامراد اکبرؑ

نوحہ امام بہ زبان جناب زینبؑ

کہتی تھی شہ کی بہن ہائے حسین حسین
ہائے مرے بے سپاہ ہائے مرے بے گناہ
اختر برج رسول گوہر درج بتول

بے کفن و بے وطن ہائے حسین غریب
ہائے مرے خستہ تن ہائے حسین غریب
نائب خیبر شکن ہائے حسین غریب

پانچ گلے ایک تیغ ہائے غضب داد و تیغ
ذبح ہوئے پنجتن ہائے حسینؑ غریب

قبلۂ اہل ولا فخر ذبیح خدا
یوسف گل پیرہن ہائے حسینؑ غریب

سینہ پہ شمر لعیں حلق پہ شمشیر کیں
تجھ پہ یہ رنج و محن ہائے حسینؑ غریب

رسم ہے وقت فنا دیتے ہیں آب و غذا
تم مرے تشنہ دہن ہائے حسینؑ غریب

بھائی ترا گھر جلا بھائی مرا سر کٹا
بچے ہیں عریاں بدن ہائے حسینؑ غریب

دیکھو تو زہراؑ کے لال کھولے ہیں اماں نے بال
حوریں ہیں سب نوحہ زن ہائے حسینؑ غریب

نانا نبیؐ روتے ہیں بابا علیؑ روتے ہیں
کہتے ہیں بھائی حسنؑ ہائے حسینؑ غریب

بھائی کی بیوہ حقیر بھائی کا بیٹا اسیر
شانوں میں ہے رسن ہائے حسینؑ غریب

پیاس کا صدمہ سہا کچھ نہ زبانی کہا
فاطمہؑ کے کم سخن ہائے حسینؑ غریب

آگے کہے کیا دبیر ہلتا ہے عرش قدیر
کہتی ہے شبر کی بہن ہائے حسینؑ غریب

نوحہ بہ زبانی جناب سیدہؑ

یہ رن میں کہتی تھی زہراؑ حسینؑ من حسینؑ من
مرے بیکس مرے تنہا حسینؑ من حسینؑ من

غریب و بے وطن میرے یتیم و بے وطن میرے
شہید و خستہ تن میرے حسینؑ من حسینؑ من

سکینہؑ غش میں تھی پیارے طمانچے شمر نے مارے
حرم سرننگے ہیں سارے حسینؑ من حسینؑ من

ملا پانی نہ دریا سے گیا پی کر نہ دریا سے
مرے بھوکے مرے پیاسے حسینؑ من حسینؑ من

مرے غازی مرے عابدؑ مرے صفدر مرے زاہد
مرے صابر مرے سجادؑ حسینؑ من حسینؑ من

نہ بیکس تجھ سا ہوئے گا ترا غم ہوش کھوئے گا
زمانہ تجھ کو روئے گا حسینؑ من حسینؑ من

تمہاری لاش گر پاؤں گلے سے اپنے لپٹاؤں
کدھر ڈھونڈوں کدھر جاؤں حسینؑ من حسینؑ من

یہاں رونے کو آئی ہے نبیؐ کو ساتھ لائی ہے
دہائی ہے دہائی ہے حسینؑ من حسینؑ من

چڑھا جلاد سینے پر پڑا حلقوم پہ خنجر
ہوا تو ظلم سے بے سر حسینؑ من حسینؑ من

قضا پردیس میں آئی نہ تم نے قبر بھی پائی
یہ مظلومی یہ تنہائی حسینؑ من حسینؑ من

دبیر آگے کہوں کیا میں قیامت دن میں تھی برپا
یہی فرماتی تھی زہراؑ حسینؑ من حسینؑ من

سلام

جناب اوج اعلی اللہ مقامہ

ہم اوجِ فلک آج اپنا سخن ہے
کہ مدحِ رواقِ امامِ زمن ہے

مرے دل میں داغِ غمِ پنجتنؑ ہے
صِلا اس کا خلدِ بریں کا چمن ہے

ہوئے جلوہ افگن جو عباسؑ رن میں
اُٹھا غُل یہ فرزندِ خیبر شکن ہے

زمیں تھرتھراتی ہے رعب ایسا
یہاں گردِ رستم کا بھی بانکپن ہے

سرِ شاہ کہتا تھا دیکھو نہ ان کو
پیمبرؐ کا کنبہ اسیرِ رسن ہے

جسے حلۂ خلد پہنائے حق نے
غضب ہے کہ وہ خاکپہ بے کفن ہے

کہا شہ نے زینبؑ سے یہ کربلا میں
یہی تا قیامت ہمارا وطن ہے

سکینہ کی تربت پہ بانو نے لکھا
یہ قبرِ اسیرِ غریب الوطن ہے

خدا جس کا بندوں سے طالب ہو اے اوج
وہ گنجینۂ اُلفتِ پنجتنؑ ہے

سلام

(جناب رفیع اعلی اللہ مقامہ خلف مرزا اوج مرحوم)

جیتے جی منظور ہے جنت کا منظر دیکھنا
جلوۂ حق روضۂ پُر نورِ سرور دیکھنا

عشق والو شانِ معراجِ پیمبرؐ دیکھنا
قاب قوسین و نبیؐ اللہ اکبر دیکھنا

حشر کے دن مدحتِ حیدرؑ سے ہوگا یہ وقار
میری خاطر خود کھلے گا خلد کا در دیکھنا

تیرے صدقے اے خدائی کرو فرمائے رسولؐ
میری جانب بھی ذرا اے بندہ پرور دیکھنا

گھبرلیں گے ڈھونڈھ کر ساقی کو پیاسے حشر میں
جمگھٹے ہوں گے لبِ تسنیم و کوثر دیکھنا

اُن پہ عاشق تھی زلیخا اُن پہ عاشق ہے خدا
حُسنِ یوسف دیکھ کر حُسنِ پیمبرؐ دیکھنا

توڑتے ہیں کس طرح کعبہ میں بُت دستِ خدا
پائے حیدرؑ دیکھنا دوشِ پیمبرؐ دیکھنا

ہو رہا ہے عاشق و معشوق میں رازونیاز
کون ہے پردے کے اندر کون باہر دیکھنا

یا علیؑ تجھ سا جو ساقی ہوئے گا اور مجھ سا رند
اپنے میکش کو پلا کر جام کوثر دیکھنا

بوترابی ہوں میری مٹی بھی ہوگی خاکِ پاک
آئیں گے جس دم مرے مرقد میں حیدرؑ دیکھنا

پڑھتے ہیں کیونکر نماز آخری سبطِ رسولؐ
سر ہے سجدے میں تہہ محرابِ خنجر دیکھنا

روزِ محشر دوزخ و جنت سے کیا مطلب رفیعؔ
ہم فقیروں کا درِ حیدرؑ پہ بستر دیکھنا

حضرت دبیر اعلی اللہ مقامہ

نتیجہ فکر بلند جناب ڈاکٹر رفیق حسین صاحب رفیق سابق سول سرجن قیصر ہند

دلِ فدائے حسینؑ است در کنارِ دبیر

مرا شعورِ سخن کیوں نہ ہو نثارِ دبیر
مجھے رفیقؔ نے بخشی ہے رہگذارِ دبیر

کروں گا پیش میں تصویر کا رزارِ دبیر
جو مل گیا مری فکروں کو اختیارِ دبیر

سُناؤں آپ کو میں ذکرِ نور بارِ دبیر
نظر میں آپ کی پھرنے لگے وقارِ دبیر

یہ مختصر سی ہے ان کے کمال کی تعریف
اساتذۂ معظم میں ہے شمارِ دبیر

تھا اختیار ہر اک شعبۂ سخن پہ مگر
ہے صنفِ مرثیہ گوئی میں شاہکارِ دبیر

کلام ان کا نہ کیونکر رُلائے دنیا کو
دلِ فدائے حسینؑ است در کنارِ دبیر

غمِ حسینؑ کے ہمراہ وہ بھی زندہ تھے
کلام ارفع و اعلیٰ ہے افتخارِ دبیر

جہاں میں بڑھتے گئے جیسے جیسے جاہ و کمال
انھیں کے ساتھ بڑھا اور انکسارِ دبیر

کلام تابعِ قولِ رسولؐ و قولِ خدا
زمانے بھر کو نہ کیونکر ہوا اعتبارِ دبیر

وہ تا حیات رہے سوگوارِ سبطِ نبیؐ
جنابِ فاطمہ زہراؑ میں سوگوارِ دبیر

بنے جو زینتِ ہر مجلسِ عزائے حسینؑ
کلام ایسا نہ کیونکر ہوا افتخارِ دبیر

کمال آپ کو ہے علمِ دیں میں بھی حاصل
الگ ہے مرثیہ گویوں سے رہگذارِ دبیر

ہے اُن کی مرثیہ گوئی میں دین کی تبلیغ
کھلا ہے گلشنِ ایماں میں لالہ زارِ دبیر

غلط نہیں جو کہوں میں بہ فیضِ مدحِ حسینؑ
حسینؑ والوں کے اوپر ہے اختیارِ دبیر

حمایتِ غمِ شہ میں یزیدیت کے خلاف
ہمیشہ چلتی ہی رہتی تھی ذوالفقارِ دبیر

تھے علمِ دیں میں جو کامل تو زہد میں یکتا
سخاوتوں سے سنورتا رہا شعارِ دبیر

جنابِ اوج نے کب کمال اُن سے کیا
رفیع اوج کے بیٹے تھے نورِ دیدہ دبیر

ہزار حیف کہ ذاکر رفیع کے فرزند
جو علمِ دیں میں تھے ہر طرح یادگارِ دبیر

ہوئے حیات میں والد کی راہیِ جنت
ہوئے رفیع سے پہلے ہی ہمکنارِ دبیر

جنابِ صادق و گوہر جئیں ہزار برس
انھیں کے دم سے ہے آباد اب مزارِ دبیر

چمن دبیر کا پھولے پھلے قیامت تک
دعا رفیق کی تجھ سے ہے کردگارِ دبیر

شہنشاہِ اقلیمِ بلاغت مرزا دبیر مرحوم

از
شاعرِ ملت جناب باقر رضوی امانت خانی

تھا گُلِ افکار سے بھرپور دامانِ دبیر
بن گیا تھا مرثیہ گویا گلستانِ دبیر

دیکھتی تھی شاہِ دیں کو چشمِ گریانِ دبیر
تھے حسینؑ ابن علیؑ خود نوحِ طوفانِ دبیر

حُبِّ اہلبیتؑ تھی شمعِ شبستانِ دبیر
الفتِ شیرِ خدا تھی جانِ ایمانِ دبیر

کیوں ہوا باندھیں نہ یہ دنیائے شعر و فکر میں
نام ہے شبیرؑ کا نقشِ سلیمانِ دبیر

پھول ہیں جس میں فصاحت کے وہ ہے باغِ انیس
گُلِ بلاغت کے ہیں جس میں وہ گلستانِ دبیر

اُس کو تھا معلوم کہتے ہیں کسے وزنِ سخن
تولتی تھی گوہرِ اشعار. میزانِ دبیر

خوبصورت تھیں جو تشبیہیں کنیزیں بن گئیں
ہو گئے تھے استعارے دربہ دربانِ دبیر

مرثیے ہیں ہے رقم تاریکیٔ زنداں کا حال
مجلسِ شہؑ میں یہ ہے شمع فروزانِ دبیر

مُسکرا تا تیر کھا کر اصغرؑ معصوم کا
دیکھتی تھی مرثیے میں چشمِ گریانِ دبیر

نصِ حیدرؑ، فیضِ سرورؐ، فضلِ ربِّ العالمین
تھا یہی بس شاعری کا ساز و سامانِ دبیر

گوشِ دل سے سنتے تھے مَن کُنتُ مولاؑ کی صدا
خم کا میداں کیوں نہ ہو میدانِ عرفانِ دبیر

انتقامِ اصغرؑ بے شیر یوں لیتے رہے
تاکتا تھا حرملہ کا نام. پیکانِ دبیر

جب دکھایا مرثیے میں جلتے خیموں کا سماں
ہو گئی موسومِ غمِ شامِ غریبانِ دبیر

وسعتِ میدانِ مدحِ مرتضیٰؑ اتنی بڑھی
کرتا تھا میدانِ خم سے بات میدانِ دبیر

دل کی حالت تھی، تصور میں علی اصغرؑ کے یوں
سوختہ جھولا تھا گویا قلبِ سوزانِ دبیر

کتب شاعر میں آنسو لکھے تھے نام حسینؑ
یا علیؑ پڑھنا سکھاتا تھا دبستانِ دبیر

ان کا میزانِ سخن میں وزن رکھتا ہے کلام
کیوں نہ ہو. اردو زباں پر بارِ احسانِ دبیر

خلد سے اب بھی صدا دیتی ہے یہ روحِ انیس
میں ہی کر سکتی ہوں بس اندازۂ شانِ دبیر

شاہِ اقلیمِ بلاغت وہ تھے باقر بالیقیں
یہ قصیدہ ہو نہیں سکتا ہے شایانِ دبیر

عمر انصاری

موازنۂ میر انیس و مرزا دبیر

یہ بھی پیارے ہیں وہ بھی پیارے ہیں — دونوں اُستادِ فن ہمارے ہیں
نام جن کا کہ ہے انیس و دبیر — آسمانِ ادب کے تارے ہیں
یوں تو تارے ہیں بے شمار مگر — سب سے روشن یہ دو ستارے ہیں
کس کو کہیے قمر، کسے خورشید — دونوں ہی نُور کے منارے ہیں

پُوچھئے اُس سے کچھ مقام اِن کا — جس عروسِ سخن کے مارے ہیں
یہ اگر اُس کا اک سراپا ہیں — رُوپ وہ بھی اُسی کا دھارے ہیں
اُس کی آنکھوں کی ہیں جو یہ تشبیہ — اُس کی نظروں کے وہ اشارے ہیں
ہیں جو اُس کے لبوں کا یہ ارشاد — اُس کے عارض کے وہ نظارے ہیں
آبرو یہ جو اُس کے ابرو کی — گیسوؤں کے وہی سہارے ہیں
یہ اگر اک حسیں کنایہ ہیں — وہ بھی کیا خوب استعارے ہیں

ہیں زباں کی یہ دل نشیں موجیں — اور بیاں کے وہ بہتے دھارے ہیں
وہ صنائع ہوں یا بدائع ہوں — دونوں پر دونوں کے اجارے ہیں
ہوں فصاحت کے یا بلاغت کے — باغ دونوں کے یہ سنوارے ہیں
اوب ان کا مہِ دو ہفتہ ہے — اور یہ دونوں ماہ پارے ہیں

کس کو ترجیح دیجیے کس پر — دونوں اک دوسرے کے پیارے ہیں
ایک دل، اک نگاہ، اک موضوع — ایک ہی غم کے دونوں مارے ہیں
ایک ہی درد دل میں دونوں کے — یہ اُنھیں، وہ اِنھیں پکارے ہیں
ہیں جوان کے لئے وہ اک آہٹ — وہ بھی ان کے بڑے سہارے ہیں
یہ زمیں کے اگر ہیں لالہ و گُل — آسماں کے وہ چاند تارے ہیں
یہ چہیتے اگر امام کے ہیں — وہ بھی سرکار ہی کے پیارے ہیں
اک نے کاٹی ہیں جاگ کر راتیں — اک نے رو رو کے دن گزارے ہیں

وادیٔ شعر میں انیسؔ و دبیرؔ
ایک دریا کے دو کنارے ہیں

تاجدار سخن جناب دبیرؑ

(جناب ضیاء رضوی)

فن سخن میں تھے وہ نغز گو جناب دبیر
سوا انیس کے جن کا نہ تھا کوئی بھی نظیر

شعاعیں آج بھی ان کے کلام کی ہیں عیاں
تھے آسمان سخن کے وہ آفتاب منیر

وہ بحر آب زلال کلام ہے ان کا
لبوں کو کرتے ہیں تر آج بھی صغیر و کبیر

اضافتوں کی ہے تکرار گو کہیں بسیاری
مگر تخیل اعلیٰ ہر ایک عرش نظیر

غرابتوں کی ہیں گو جھلکیاں سر قرطاس
مگر مودت قربیٰ کی لفظوں میں تاثیر

ظہور مہر کا جس بند میں بیاں ہے نظام
ہے میرے قول کی اس میں ثبوت کی تنویر

یہ سب سہی پہ وہ پیچیدہ معنی دلکش
ہو جیسے چہرۂ زیبا پہ زلف کی زنجیر

وہ کون صاحب عصمت ہے آج اس فن میں
کبھی نہ جس سے ہو اس صنع میں کوئی تقصیر

بیان حسن سخن سے وہ روشنی بخشی
کہ مرثیوں کی چمک اٹھی دہر میں تقدیر

اگر فقیہوں نے بخشا فروغ اس دیں کو
تو شاعروں نے بتایا ہے اس کو مہر منیر

دیا انیس نے گر تاج زر نگار اسے
دبیر نے گہر فن کا بخشا اسکو سریر

قلم سے کی وہ ستائش کی آئینہ بندی
کہ فقط ہیں آل نبیؐ کی ہے تصویر

عزیز پارۂ گر مصطفیٰ نہ ہو کیونکر
تمام عمر رہا تو ثنا گر شبیرؑ

نہیں ہے آج پہ توصیف آل کے باعث
ہر ایک شیعہ کے سینے میں ہے تری توقیر

ثنائے آل نبیؐ پر وہ کی گل افشانی
صلے میں جس کے ملی تجھکو خلد کی جاگیر

صنم کدے میں جو سنتے ترے نوا کا فسوں
بتوں میں ہوتا ہر اک سمت نعرۂ تکبیر

دکھائی ایسی ہر اک بند میں جگر کاوی
ہر ایک [illegible] مقتل کی خوں بھری تصویر

ہیں اس طرح سر کاغذ حروف کو مرکز
کھچی ہوں فوج میں جس طرح [illegible]

تو وہ مفسر قرآن معنی مدحت
ہر ایک مرثیہ تیرا ہے [illegible]

جمال معنی سے کیا کیا اٹھائی تو نے نقاب
ہے دست فن ترا دست [illegible] رب قدیر

عزیز رکھیں تکیوں مرثیوں کو ہم اے ضیا
ہوئی انھیں سے عزائے حسینؑ کی تعمیر

پیغام

(ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی سابق صدر شعبۂ اُردو لکھنؤ یونیورسٹی)

مکرمی۔ آپ کا عنایت نامہ موصول ہوا۔ یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ آپ امسال سرفراز کا دبیر نمبر شائع کرا رہے ہیں۔ دبیر پر جس تفصیل کے ساتھ تحقیقی کام ہونا چاہیے وہ ابھی تک نہیں ہوا ہے۔ اُن کے بہت سے مراثی بھی ابھی تک شائع نہیں ہوئے۔ اگر اُن کے تمام مراثی موجودہ معیار کے مطابق تدوین کر کے شائع ہو جائیں تو یہ ہمارے اُردو ادب کی بڑی اہم خدمت ہوگی۔

آپ کو بخوبی معلوم ہے کہ انیس و دبیر ہماری صنفِ مرثیہ نگاری کے آفتاب و ماہتاب ہیں۔ خود دبیر کا یہ احسان کیا کم ہے کہ اُنھیں کے مقابلے میں آکر انیس انیس ہوئے۔ جو زور و شور، طنطنہ اور رزمیہ انداز دبیر نے اختیار کیا اُسی نے مرثیے کو اُردو شاعری میں بلند مقام دلوایا۔ اس سے دبیر کی خدمت زبان و ادب کا کما حقہ جائزہ لینا ہمارے ناقدین کے لئے ازبس ضروری ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ ہمارے طلبہ کے نصابات میں عموماً انیس و دبیر کے مرثیے ضرور شامل کئے جاتے ہیں لیکن مرثیے طویل ہونے کے باعث پورے پورے شامل نہیں ہو سکتے اس لئے بڑی ضرورت ہے کہ دبیر کے مراثی کا ایک اچھا انتخاب بھی شائع کیا جائے تاکہ طلبہ اُس سے مستفید ہو سکیں۔

خیر اندیش
نورالحسن ہاشمی
۱۱ر نومبر ۱۹۷۶ء

بخدمت کاظم علی خاں صاحب
دکھوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ

سرفراز لکھنؤ
ہفتہ وار
جلد ۵۵ ۱۷ دسمبر ۱۹۷۲ء نمبر ۱

سرفراز کا دبیر نمبر

فروری ۱۹۷۲ء میں انیس نمبر شائع کرنے کے بعد ہمارا قصد تھا کہ جلد سے جلد دبیر نمبر بھی نکال دیا جائے لیکن معلوم ہوا کہ دبیر پر لکھنے والوں کی اتنی کمی ہے کہ ہماری کوشش کے باوجود بھی بہ آسانی اس سلسلہ میں مضامین فراہم نہ ہو سکے۔ اب خدا خدا کر کے ۷۲ء میں ہمارا یہ برسوں پرانا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکا۔ ہمیں یہ اعتراف کرنے میں ذرہ برابر باک نہیں کہ اگر جناب مرزا کاظم علی خاں صاحب جو ادبیات میں حد درجہ انہماک و شغف رکھتے ہیں بس سلسلہ میں ہم سے تعاون نہ کرتے تو مرزا دبیر پر اتنا بھاری بھرکم نمبر ہرگز نہیں نکل سکتا تھا۔ نہ صرف موصوف نے خود اپنا مضمون مرحمت فرمایا بلکہ دوسرے ممتاز اہل قلم سے مضامین بھی حاصل کرنے کی سعی فرمائی۔

اب ہم یہ دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ میر انیس نمبر کے بعد ہماری یہ دوسری خدمت جو دبیر نمبر کی شکل میں پیش کی جا رہی ہے ادبی و معنوی اعتبار سے انیس نمبر سے کمتر نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ انیس نمبر کی ضخامت دبیر نمبر سے کہیں زیادہ تھی مگر مقالوں اور مضمونوں کے اعتبار سے دبیر نمبر کو بھی سرفراز کا ایک شاہکار ہی سمجھا جا سکتا ہے اس لئے کہ دبیر پر ابھی تک ہندوستان میں کسی دوسرے جریدے نے اپنا کوئی اسپیشل نمبر شائع نہیں کیا ہے۔ یہ پہلی کوشش ہے جو سرفراز ارباب ادب کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ اس میں جتنے مضامین شامل کئے گئے ہیں وہ بلند پایہ ادیبوں کی کاوش فکر کا نتیجہ ہے جس کی وجہ سے اس نمبر کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔ پاکستان میں ماہ نو نے ضرور دبیر نمبر شائع کیا ہے مگر ہندوستان میں دبیر نمبر کے شائع کرنے کا فخر سرفراز ہی کو حاصل ہے۔ ہم نے ماہ نو کے بعض مضامین کو بھی اس نمبر میں شامل کر لیا ہے جس کے لیے ہم پاکستانی معاصر کے شکر گزار ہیں۔

اردو صحافت میں اسپیشل نمبروں کے شائع کرنے کی اولیت کا شرف سرفراز ہی کو حاصل ہے۔ وہ اپنے یوم تاسیس ہی سے اسپیشل نمبر نکالتا رہا ہے۔ مگر ابتدا کے برسوں تک اس کے نمبر بس چند صفحات ہی پر مشتمل ہوتے تھے۔ ان کا سائز بھی کتابی سائز سے بہت بڑا ہوتا تھا جس کی وجہ سے اس کی علیحدہ جلد بندی نہیں کرائی جا سکتی تھی اور اس طرح ان کی عمر بھی اتنی ہی کم ہوتی تھی جتنی عموماً سرفراز کے ہفتہ وار یا روزانہ پرچوں کی ہوا کرتی تھی۔

لیکن ۱۹۵۲ء سے جب کہ ہمارا تعلق سرفراز سے دوبارہ از سر نو قائم ہوا۔ حسن اتفاق سے اسی زمانہ میں جناب سید انصار حسین صاحب رضوی بھی منیجر کے عہدہ پر آ گئے۔ ایڈیٹر اور منیجر دونوں نے یک دلی ہو کر سرفراز کے خزاں دیدہ شجر کی آبیاری بڑی تندہی سے کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت سے سرفراز بالالتزام وقت پر نکل رہا ہے اس کی صورت اور معنوی حیثیتوں میں اضافہ ہوا ہے جس کی وجہ سے اخبار کی کھوئی ہوئی ساکھ پھر بحال ہو گئی اور افراد قوم کو یقین ہو گیا کہ سرفراز کی بنیادیں بڑی گہرائی تک پہونچ چکی ہیں اور وہ ان اخبارات کے زمرہ میں نہیں آتا جو وقتی جوش کے ماتحت نکالے جاتے ہیں اور چند دن ایک پھول کی طرح اپنا بہار جانفزا دکھا کر ہمیشہ کے لیے کھلا جاتے ہیں۔

جس طرح سرفراز نے اسپیشل نمبروں کے نکالنے کی پہل کی اسی طرح ہم نے اپنے اس ۲۴ سالہ دور میں مختلف موضوعات پر بڑے بڑے ضخیم نمبر نکالنے کی شاہراہ قائم کی۔ ان نمبروں نے یقیناً سرفراز کی مقبولیت و محبوبیت میں حیرت ناک اضافہ کیا ہے خصوصاً اس کے دو اسپیشل نمبر جو محرم اور رجب کے مہینوں میں محرم نمبر اور رجب نمبر کے نام سے نکالے جاتے ہیں اتنے مقبول ہیں کہ ناظرین کو سال بھر تک ان نمبروں کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ اور وہ حرزِ جان سمجھ کر انھیں اپنے پاس محفوظ رکھتے ہیں۔

سرفراز نے بعض شخصیتوں کے متعلق بھی مخصوص نمبر نکالے ہیں لیکن ہمیں دلی صدمہ ہے کہ فخرِ قوم مولوی سید کلب عباس نمبر اب تک شایع نہ ہو سکا۔ مولانا مرحوم کے انتقال کے بعد ہم نے بہت جلد مضامین فراہم کر کے انھیں ایڈٹ کر دیا تھا اور بروقت مینجر صاحب سرفراز نے ان کی کتابت بھی کرا لی تھی مگر بعض افسوسناک مجبوریوں کی وجہ سے کاپیاں نہ چھپ سکیں۔ حتیٰ کہ عرصہ تک وہ رکھے رکھے تقریباً بیکار بھی ہو چکی تھیں۔ اس کے بعد پھر امید بندھی کہ اب امروز فردا میں اس کی اشاعت کا بندوبست ہو جائے گا۔ اس لئے ان مضامین کو از سرِ نو کتابت کرایا گیا مگر پھر یہ امید ناامیدی میں بدل گئی اور اگر جلد اس کی اشاعت کا انتظام نہ ہو سکا تو شاید یہ دوسری مرتبہ کی کتابت بھی خراب ہو جائے گی۔

اس کی طباعت و اشاعت میں سب سے بڑی رکاوٹ پیسہ کی ہے اور

بے زری کرد ز من آنچہ ز تلوار نہ کرد

چنانچہ سرفراز مینجنگ بورڈ اپنی دلی خواہش کے باوجود اس پر قادر نہ ہو سکا۔ اس لئے کہ کتابت اور لوازمات طباعت کے نرخ اتنے بڑھ گئے ہیں کہ پہلے جو کام ایک روپیہ میں ہو جاتا تھا وہ اب دس روپیہ میں بھی نہیں ہو پاتا۔

بعض حضرات فخرِ قوم نمبر میں تکلیف دہ تعویق و تاخیر کا ذمہ دار ایڈیٹر کو قرار دیتے ہیں جیسے کہ مالیات کا سیاہ و سفید ایڈیٹر و مینجر ہی کے اختیار میں ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ سرفراز کا ایک مینجنگ بورڈ ہے جس کا اپنا صدر و سکریٹری بھی ہوتا ہے۔ عملہ سرفراز اپنے بورڈ کی ہدایات پر عمل کرتا ہے۔ ایڈیٹر کا فرض تو صرف اتنا ہی تھا کہ وہ مناسب وقت کے اندر فخرِ قوم نمبر کو مرتب کر دے اور مینجر اس کی کتابت کا انتظام کر دیں۔ چنانچہ یہ دونوں کام ایک مرتبہ نہیں دو مرتبہ پایۂ تکمیل کو پہونچا دیئے گئے۔ بہرحال ہمیں خود اس بات کا رنج ہے کہ اس مجوزہ نمبر کے اب تک شایع نہ ہونے کی وجہ سے سرفراز کی سبکی ہوئی اور اس کی ساکھ کو ٹھیس پہونچی۔ مگر اس میں ہم بھی مجبور ہیں اور بورڈ بھی۔

بہرحال سال میں یہ دو فریضے ہمارے اوپر عائد ہوتے ہیں ایک محرم نمبر اور دوسرے رجب نمبر۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم ان دونوں فریضوں کو گزشتہ ۲۴ سال سے بہ احسن الوجوہ انجام دے رہے ہیں اور اب مرزا دبیر نمبر بھی شایع کر کے ہم نے ایک بڑی کمی کو پورا کر دیا ہے۔ شاید یہ ہماری عمر کی ایک آخری اہم خدمت ہے اس لئے کہ اب ہمارا سن ۷۵ سال سے تجاوز کر چکا ہے اور سوائے دل و دماغ کے ہمارے تمام اعضاء و جوارح بیکار ہو چکے ہیں اور ہر لمحہ ہمارے کانوں میں "الرحیل الرحیل" کی صدائیں آتی رہتی ہیں۔

مرزا دبیر نمبر اگرچہ میر انیس نمبر سے ضخامت میں کم ہے لیکن بہ قات کمتر بہ قیمت بہتر کے مصداق مضامین کے اعتبار سے بہت زیادہ وزنی اور بھاری بھرکم ہے۔ یقین ہے کہ ہمارے گزشتہ تمام نمبروں کی طرح یہ نمبر بھی بہ نظرِ پسندیدگی دیکھا جائے گا۔

آہ علی یاور جنگ

یہ خبر اخبارات میں پڑھ کر سخت صدمہ ہوا کہ ہندستان کا

ایک سچے اور شیعہ فرقہ کی ممتاز و معزز شخصیت جناب نواب علی یاور جنگ بہادر گورنر حیدرآباد کا انتقال ۱۱ دسمبر ۱۹۴۴ء کو بمبئی میں ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم ۱۹ فروری ۱۸۹۵ء کو پیدا ہوئے اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں اپنی تعلیم کی تکمیل کی۔ وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہنے کے بعد نظام کی کابینہ میں کچھ عرصہ دستوری امور کے وزیر رہے۔ پھر ۱۹۴۲ء میں نظام حکومت سے الحاق کے مسئلہ پر اختلاف کی بنیاد پر مستعفی ہو گئے۔ پھر حکومت ہند میں آپ نے سیاسی اور تعلیمی میدانوں میں بڑی قیمتی خدمات انجام دیں۔

آپ تین سال تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے اور اسی دوران میں بعض فرقہ پرستانہ ذہنیت رکھنے والے طلبا اور دوسرے عناصر نے باغیانہ رویہ اختیار کر لیا۔ حتیٰ کہ ایک میٹنگ میں انھوں نے حملہ کر دیا جس میں علی یاور جنگ بہادر زخمی بھی ہوئے اس سرکشانہ رویہ میں پولیس نے آکر قابو حاصل کیا۔ اس وقت تمام مسلم پریس مرحوم کے خلاف اعتراضات و سب و شتم کی مہم جاری کئے ہوئے تھا بس ایک سرفراز تھا جو برابر ان کی حمایت و مدافعت کرتا رہا۔ انتقال کے وقت وزیر اعظم اندرا گاندھی اور وزیر اعلیٰ مسٹر ایس بی چاون ان کے بستر مرگ کے پاس موجود تھے۔

نعش دو گھنٹہ تک دیدار عام کے لیے راج بھون میں رکھنے کے بعد بذریعہ ہوائی جہاز حیدرآباد لے جائی گئی جہاں میت کو آپ کے آبائی قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔

علی یاور جنگ بہادر ہندستان ہی کے لیے قابل فخر نہ تھے بلکہ وہ شیعہ فرقے کے لیے بڑے افتخار کا سبب تھے آپ کے انتقال سے ہندستانی قوم اور شیعہ فرقہ میں جو جگہ خالی ہوئی ہے وہ مشکل ہی سے پُر ہو سکے گی۔

خدا مرحوم کو بہ محمد و آل محمد اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

حسینیہ آغا باقر کی جدید تعمیر

امام باڑہ آغا باقر مرحوم لکھنؤ کا ایک قدیم اور مقبول امام باڑہ ہے جس کی تعمیر شجاع الدولہ بہادر کے عہد میں آغا باقر خاں اصفہانی نے اپنے بھتیجے آغا اسمٰعیل دلاور جنگ کی خواہش پر کرائی تھی جو شجاع الدولہ بہادر کی فوج میں پانچ ہزار سواروں کے افسر اعلیٰ تھے۔ لہٰذا یہ امام باڑہ چوک کی ترکاری منڈی کے قریب چوڑی دیوار کے بہت سے مکانات حاصل کر کے ایک وسیع و عریض قطعہ آراضی پر بنوایا تھا۔ شروع میں یہ امام باڑہ کتنا خوبصورت اور شاندار ہوگا اس کا اندازہ صرف اس ایک بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ محمد علی شاہ بادشاہ اودھ نے تین آباد کے نام سے جو حسین و دلکش اور عظیم الشان امام باڑہ بنوایا وہ اسی امام باڑہ کا نقش ثانی تھا لیکن نشیب و فراز زمانہ کے ہاتھوں وہ عالی شان امام باڑہ اپنی حالت پر باقی نہ رہا۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد انگریزوں نے امام باڑہ آصف الدولہ کو فوجی قلعہ کی حیثیت دے دی اور اس میں گورا فوج اتار دی گئی اور اس قلعہ کی حفاظت کی خاطر پانچ پانچ سو گز تک کی تمام عمارتوں کو کھدوا کر میدان بنا دیا۔ آغا باقر کا یہ عالیشان امام باڑہ بھی اس توڑ پھوڑ کی نذر ہو گیا اور وہ حرف مکرر کی طرح صفحہ ارض سے مٹا دیا گیا۔

اسی امام باڑہ میں شاہ عالم شہنشاہ دہلی کے پوتے مرزا کاظم بخش خلف مرزا سلیمان شکوہ بھی دفن ہوئے تھے۔ اس مناسبت سے کہ اس میں ان کے والد مدفون ہوئے۔ ہیں دہلی کے شہزادہ مرزا حیدر شکوہ نے اس قطعہ آراضی کو حاصل کر کے انجینیر صاحب کی اجازت سے امام باڑہ کی دوبارہ تعمیر کرا دی۔ مگر اب کی یہ عمارت بالکل سیدھی سادی بنائی گئی تھی۔ قطعہ آراضی کے بیچوں بیچ نالی دار

ٹین کا ایک بنگلہ ڈلوا دیا گیا تھا۔ اس میں ایک خوشنما سوری کی بنی لگی ہوئی تھی۔

پھر حالات زمانہ کے باعث امام باڑہ کی آراضی اور مکان مسکو بزرقرضہ کی ادائی میں ۱۸۸۲ء میں نیلام کرایا۔ دوسری مرتبہ اسکی تعمیر جناب راجہ شعبان علی خاں صاحب مرحوم تعلقدار سلیم پور نے کرائی پھر تیسری بار اسے ۱۸۸۸ء کے لگ بھگ راجہ امیر حسن خاں صاحب والی محمود آباد نے بنوایا۔ اس کے بعد چوتھی مرتبہ تقریباً ۱۹۰۴ء میں اس کی تعمیر .....

..... بمبئی کے ایک بوہرہ سیٹھ نے کرائی اور اب ۱۹۷۹ء کے اواخر میں لکھنؤ کے ایک مقبول و مشہور ڈاکٹر جناب سید علی رضا صاحب رضوی (قطب پور ڈاکٹر) نے اپنے والد مرحوم جناب سید معظم علی صاحب رضوی کو اس امام باڑہ میں دفن کیا اور ان کی قبر کو سفید اور رنگین ٹائل سے بڑا خوبصورت بنوایا اور اس خیال سے کہ ان کے والد مرحوم کی روح پر فتوح کو دائمی طور پر ثواب پہونچتا رہے اس امام باڑہ کو تقریباً از سر نو تعمیر کرایا۔ ٹین کا سائبان ہٹا کر ۱۰۰ × ۵۰ فٹ کا سلیب لگوایا اور مشرقی و مغربی کی صحنچیوں کا رقبہ ۷ × ۱۰ فیٹ رکھا گیا۔

اندر کا ہال بھی بڑا قابل دید ہو گیا ہے۔ روکار بھی بہت خوبصورت بنوایا گیا ہے جس کا اس سے پہلے وجود نہ تھا۔ سنہری برجیاں قائم کی گئی ہیں اور اگلے حصہ پر بڑا دیدہ زیب ڈاٹن بنوایا گیا ہے جو خود ڈاکٹر صاحب موصوف کی جدت پسند طبیعت کی اختراع ہے۔ ادھر ادھر برجیوں پر رنگین روشنی کے بلب لگائے گئے ہیں جو رات کی تاریکی میں امام باڑہ کی بہار کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ زائرین کی سہولت کے خیال سے صحن کے ایک کونے میں بہت اچھا حمام بھی تعمیر کرا دیئے گئے ہیں جن کی پہلے بہت کمی تھی۔ دروازوں پر آہنی کیواڑ لگوا دیئے گئے ہیں۔

غرضکہ یہ امام باڑہ پہلے کی بہ نسبت اب بہت پائدار اور خوشنما ہو گیا ہے جو انشاء اللہ مدت تک قائم و باقی رہے گا۔

خدا جناب ڈاکٹر رضوی صاحب کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے اس امام باڑہ کی تعمیر کرا کے اور اسے لائق دید حیثیت میں منتقل کر کے اپنے والد مرحوم کے لئے ایک خیر جاریہ کا انتظام فرما دیا۔ اب جب تک یہ عمارت قائم رہے گی ڈاکٹر صاحب موصوف کا نام زندہ رہے گا اور ان کے والد مرحوم کو ہمیشہ ہمیشہ ثواب پہونچتا رہے گا۔

یہ امام باڑہ نواب شجاع الدولہ بہادر کے عہد معدلت عہد سے بہت مقبول اور مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔

یہ امام باڑہ حسینیہ آصفی سے بھی پرانا ہے جبکہ لکھنؤ میں اس سے پہلے ایک اور امام باڑہ حسین گنج کے قریب محلہ باغ بی بی آئینہ میں آغا ابو طالب خاں صاحب مرحوم نے بنوا دیا تھا جسے لکھنؤ کا پہلا عزاخانہ ہونے کا شرف حاصل تھا اس کے بعد آغا باقر خاں صاحب کے امام باڑہ کی تعمیر کی نوبت آئی جسے انھوں نے اپنے بھتیجے آغا اسمٰعیل خاں پنج ہزاری کی خواہش پر منڈی میں مارکیٹ کی جانب مشرق متصل مسافر خانہ تعمیر کرایا جو ایسی نیک نیتی اور خوش اعتقادی کے ساتھ بنوایا تھا جس کی مقبولیت میں اتنے طویل زمانہ کے بعد کوئی کمی نہیں آئی ہے بلکہ اس میں دن رات حاجت مند اپنی حاجت براری کے لیے دعا مانگنے آتے رہتے ہیں۔ اور ان کی مرادیں پوری ہوتی رہتی ہیں۔

امام باڑہ کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس میں اب تک برابر مومنین کی میتیں دفن ہوتی رہتی ہیں۔ حتیٰ کہ اردو کے مایۂ ناز شاعر مرزا سودا بھی اسی امام باڑہ میں مدفون ہیں جن کا انتقال ستر سال کی عمر میں ۱۱۹۵ھ میں ہوا اور جن کی تاریخ وفات مصحفی نے حسب ذیل مصرعے نکالی تھی:

سودا کجا و آں سخن دل فریب او

مگر اب ان کی قبر کا نشان بھی مٹ چکا ہے۔

عرض مرتب

۱۷ دسمبر ۱۹۷۶ء کو منظر عام پر آنے والا ہفت روزہ سرفراز لکھنؤ کا مرزا دبیر نمبر کسی ہندستانی جریدے کا شایع ہونے والا پہلا دبیر نمبر ہے۔ میری محدود اطلاع کے مطابق اس سے قبل کسی ہندستانی رسالہ کا کوئی دبیر نمبر شایع نہیں ہوا ہے۔ ہر نقش اول کی طرح ہماری یہ کوشش بھی خامیوں اور کوتاہیوں سے یک سر بری نہیں۔ وقت اور وسائل دونوں ہی کی کمی کے باعث اس میں ابھی بہت کچھ ترمیم و اصلاح کی گنجائش ہے۔ وقت کی کمی کے سبب سے اس کی خاطر خواہ پروف ریڈنگ بھی ممکن نہ تھی۔ رسالہ کو محرم سے قبل وقت مقررہ پر شایع ہونا تھا۔ میں نے مضامین حاصل کرنے کی پوری لگن کے ساتھ کوشش کی۔ میں ان اہل قلم کا ممنون ہوں جنھوں نے میری استدعا پر اپنے گرانقدر مقالے مرحمت فرمائے۔

پیش نظر دبیر نمبر میں نئی اور پرانی دونوں قسم کی چیزیں شامل ہیں۔ نئے مضامین کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ دبیر نمبر کے بعض مندرجات سے اختلاف کی بھی گنجائش ہے۔ مثلاً ڈاکٹر اکبر حیدری صاحب نے ازراہ کرم اس نمبر میں دبیر کا جو مرثیہ جب کوفے میں پابند بلا ہو گئے مسلم غیر مطبوعہ کے دعوے کے ساتھ شایع کرایا ہے وہ راقم کی اطلاع کے مطابق دبیر کے مطبوعہ مرثیوں میں شامل ہے۔

محترم ڈاکٹر نیر مسعود صاحب نے مرزا دبیر کا جو اصلاح شدہ مرثیہ شایع کرایا ہے وہ دبیر کے مطبوعہ مرثیوں میں موجود ہے۔ ڈاکٹر نیر مسعود صاحب کے حکم کی تعمیل کے طور پر آئندہ کبھی اس مرثیے کے مطبوعہ اور قلمی نسخے کے موازنے اور مقابلے کی کوشش کروں گا۔

بہر حال آخر میں ان حضرات کا میں پھر شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے مضامین کے لئے میری استدعا کو صدا بصحرا نہ ہونے دیا۔

(خاکسار) کاظم علی خان دبیر پرنٹنگ ورکس،
۲۰۱ وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ

اعلان تعطیل

محرم نمبر کے بعد دفتر اخبار میں حسب معمول تعطیل ہو جائے گی پھر آئندہ پرچہ ۱۲ محرم کو دفتر کھلنے کے بعد ۹ جنوری کو نکالا جائے گا۔ البتہ پریس میں ۵ محرم تک کام ہوتا رہے گا جس کے بعد پریس بھی ۱۲ محرم تک کے لئے بند ہو جائے گا۔

انفاق فی سبیل اللہ

اپنا ، جانا ، پہچانا

مکتبۂ مبارک ۸۹ باغ مکا لکھنؤ ۳

[illegible] صاحب آپ لکھنؤ تشریف لے جا رہے ہیں۔ جی ہاں کہئے ۔ ارے صاحب کہنا کیا ہے آپ تو جانتے ہیں میرا تقریب اور مجھ کو کچھ کتابوں کی اشد ضرورت ہے اس لئے آپ برائے مہربانی یہ کتابیں لیتے آئیں ۔ دیکھئے اس ادارے کا نام [illegible] لکھنؤ ۳ اور ہمیں اس ادارے کے کتابوں کی مختصر فہرست آپ بھی ملاحظہ کریں

فہرست کتب مکتبہ مبارک

[illegible] مترجم مولوی [illegible] صاحب	35/	قلزم عزا	6/-	قضایا حضرت امیر المومنینؑ	6/-
[illegible]	35/	اشک سیدہ	7/50	ذوالفقار (اشجم کرمانی)	1/-
نہج البلاغہ مکمل	35/	مجالس الشیعہ	3/50	دینیات پہلی	-/50
حسن طالب	6/-	عمدۃ المجالس	3/-	تفسیر قرآن	10/-
وظائف الابرار مترجم	6/-	ذخیرۂ مناقب	3/-	ام المومنین حضرت عائشہ کی مکمل	
تحفۃ العوام مجلد	10/-	مرادی پھول (دس مناجاتیں)	1/-	اسوانح حیات	15/-
دس مجلسیں	7/-	دامن مراد	1/50	(نوحہ جات)	
عرفان رسالت	5/-	مرادی کہانیاں	1/50	سرکار محشر	-/75
مفتاح البیان (حصہ اول)	4/50	تصویر کربلا (مراثی)	2/-	بیاض غم	1/-
مجلس خواتین	5/50	داستان کربلا (")	2/-	انجام وفا	1/-
مجلس خاتون مکمل	3/-	بدر العزا	7/50	پیغام وفا	1/-
[illegible]	3/50	شمس العزا	7/50	سیلاب غم (از ہاشمی رامپوری)	1/-
[illegible]	3/-	چہاردہ سورہ	2/50	گلدستۂ عزا (")	1/-
[illegible]	1/50	ہفت سورہ	1/50	کربلا کی آواز	2/-
[illegible]	3/-	[illegible]	7/50	سحاب غم	1/-

[illegible] سید شہنشاہ حیدر نوگانوی ۸۹ باغ مکا لکھنؤ ۳ باغ زہرا و جنات زہرا P. 40/-

www.taemeernews.com

آپ کی آسانی کیلئے

ادارۂ تبلیغ واشاعت نے ایک کتاب گھر قائم کیا ہے جس میں آپ کو تمام علوم و فنون کی کتابیں آسانی سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ مثلاً قرآن مجید، دُعاؤں کی کتابیں، تعویذات، ترجمہ نہج البلاغہ، نوحے، سلام اور مرثیوں کی کتابیں، تاریخ نیز سوانح و سیرت کی کتابیں۔

چاہے یہ کتابیں ہندوستان کے کسی مطبع کی چھپی ہوں ادارہ آپ کے لئے فراہم کر دے گا۔ ڈاک اور وی، پی کے اخراجات آپ کو برداشت کرنا ہوں گے آرڈر کے ساتھ کُل رقم کے ایک چوتھائی حصہ کا منی آرڈر پیشگی بھیجنا ضروری ہے۔

پتہ

ادارۂ عالیہ تبلیغ واشاعت

$\frac{39}{201}$ درگاہ حضرت عباسؑ روڈ، رستم نگر لکھنؤ ۲

www.taemeernews.com

مقبول ترجمہ رنگین

فوٹو آفسٹ

۳ سال سے جس قرآن مجید کا اعلان کیا جا رہا تھا غیر شیعہ پریسوں کی عدم رواداری کی وجہ سے منظر عام پر نہ آ سکا۔ اب پریس کا معقول انتظام کر لیا گیا ہے۔
دوسری قسط انشاء اللہ نہایت آب و تاب سے عنقریب چھپ کر آنے والی ہے۔

ہدیہ ہر ایک قسط (۶ پارے) ۸ روپیہ

ملنے کا پتہ:- الجواد بک ڈپو جوادیہ کالج بنارس

امجد علی شاہ

سبط محمد نقوی کی تحقیقی تصنیف

اپنے موضوع پر اردو میں پہلی کتاب اودھ کی تاریخ پر خاص زاویئے سے نظر، ۲۰۸ صفحات، خوشنما اور مصور گرد پوش۔ قیمت پندرہ روپیہ

ملنے کے پتے:-

(۱) سبط محمد نقوی، اکبر پور، (سلطان پور) یوپی
(۲) کتاب نگر، دین دیال روڈ لکھنؤ
(۳) دانش محل، امین الدولہ پارک لکھنؤ
(۴) احباب پبلشرز، مقبرہ غازیہ گولہ گنج لکھنؤ
(۵) اردو پبلشرز، تلک مارگ لکھنؤ

التفریق والتحریف فی الاسلام

عرصہ سے نایاب تھی اور اب بھی نایاب ہے۔ اس کتاب میں اس بات پر بحث کی گئی ہے کہ امت مسلمہ کیوں اتنے فرقوں میں تقسیم ہو گئی۔ مدلل کتاب ہے۔
صفحات ۵۸۴، بڑے سائز میں پاکستانی ایڈیشن۔ ہدیہ صرف -/۳۰

ملنے کا پتہ:-

حیدری کتب خانہ ۳ اے، مرزا علی اسٹریٹ کلاں ناکہ، امام باڑہ روڈ بمبئی ۹

www.taemeernews.com

(باسمہ سبحانہ)

۹ ماہر تعلیم علماء دین کا مرتب کردہ
شیعہ دینیات کورس

اردو ہندی گجراتی

میں تیار

تنظیم المکاتب کے خدمات سے گھر گھر فائدہ اٹھائیں

نمبر شمار	نام کتب	رسم الخط	قیمت (روپیہ — پیسہ)	تعداد جلد
۱	دینیات مکمل سٹ	اردو	۱۴ — ۳۵	
۲	مکاتب کے رجسٹروں کا مکمل سٹ	اردو	۴ — ..	
۳	دینیات مکمل سٹ جوانوں کے لئے	اردو	۵ — ..	
۴	" " "	ہندی	۴ — ۵۰	
۵	دینیات اولی، دوم، سوم	گجراتی	۲ — ۲۵	
۶	صلح حسن	اردو	۵ — ..	
۷	پیاس	"	۶ — ..	
۸	روضہ ہائے مبارک کے بہترین رنگین سات تصاویر سائز ۲۲×۲۸ مکمل سٹ		۱۰ — ..	
	ایک تصویر	-	۱ — ۵۰	

نوٹ:۔ کمیشن تاجروں کے لئے ۲۵ فیصدی، مکاتب کے لئے ۲۰ فیصدی، ڈاک خرچ بذمہ خریدار رہے گا۔

تنظیم المکاتب ۴، جوہری محلہ لکھنؤ ۳

www.taemeernews.com

قومی معجزہ ـــ تنظیم المکاتب

جس کا ـــــ منصوبہ ملک میں ایک ہزار مکتب قائم کرنا ہے۔

جو ـــــ دینی تعلیم پر دو لاکھ روپیہ سالانہ خرچ کر رہا ہے

جو ـــــ ہر مکتب کو حسب ضرورت کم از کم تیس روپیہ ماہوار اور زیادہ سے زیادہ سو روپیہ ماہوار امداد دیتا ہے۔

جس کی ـــــ نگرانی میں ملک کے نو صوبوں میں ۱۹۷ مکاتب قائم ہیں جن میں ۱۰½ ہزار طلاب دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

جس کا ـــــ سرمایہ محفوظ دو لاکھ روپیہ ہے جو یونین بینک میں فکسڈ ڈپازٹ ہے جس سے بیس ہزار روپیہ سالانہ ادارہ کو ملتے ہیں۔ سرمایہ محفوظ صرف لائف ممبروں کی فیس سے جمع کیا جاتا ہے۔

جسے ـــــ اعلم وقت سرکار آقائے خوئی مدظلہ، سرکار آقائے شریعتمدار مدظلہ قم سرکار آقائے سید باقر صدر نجف مدظلہ اور دیگر علمائے عراق و ایران کی طرف سے خمس، زکواۃ، فطرہ، قربانی کی کھال، امام ضامن اور دوسرے رقوم شرعیہ کو لینے کی اجازت حاصل ہے۔

جس کی ـــــ لائف ممبری کی فیس ہزار روپیہ ہے۔ سو روپیہ سال کر کے ادا کی جا سکتی ہے اور عمومی ممبری کی فیس ۲۵ روپیہ سالانہ ہے۔

جس کی ـــــ منتقل آمدنی صرف بیس ہزار روپیہ سال ہے اور خرچ دو لاکھ روپیہ سال ہے۔

تنظیم المکاتب قومی حیات کا زندہ ثبوت ہے اس کی بھرپور مدد کیجئے تاکہ گاؤں گاؤں اور شہر شہر مکتب کھل جائیں۔

(آپکے تعاون کا منتظر)

سید غلام عسکری

سکریٹری تنظیم المکاتب ۴۷۔ جوہری محلہ لکھنؤ